بسمہ
سبحانہ

انا مِن حسینؑ

مجالس عشرۂ محرم الحرام ۱۴۱۸ھ امام بارگاہ ابوظبی

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی اعلی اللہ مقامہ

تنظیم المکاتب گولہ گنج لکھنؤ

بسمہ سبحانہ

اَنَا مِن حُسین ؑ

مجالس عشرۂ محرم الحرام ۱۴۱۶ھ امام بارگاہ ابوظبی

علامہ السید ذیشان حیدر جوادی اعلی اللہ مقامہ

ناشر

تنظیم المکاتب، گولہ گنج لکھنؤ۔۱۸ (انڈیا)
ٹیلی فیکس: 0522-2615115, 2628923, 2618194

نام کتاب	:	انا من حسینؑ
مصنف	:	علامہ السید ذیشان حیدر جوادی اعلی اللہ مقامہ
کتابت	:	ج۔ احمد
پہلا ایڈیشن	:	نومبر ۱۹۹۹ء
دوسرا اڈیشن	:	نومبر ۲۰۰۲ء
تیسرا اڈیشن	:	جولائی ۲۰۱۱ء
تعداد	:	ایک ہزار
مطبوعہ	:	اے۔ بی۔ سی۔ پریس۔ دہلی
ناشر	:	تنظیم المکاتب، گولہ گنج، لکھنؤ۔ ۱۸ (انڈیا)
ہدیہ	:	Rs.90/-

بسمہ سبحانہ

فہرست مجالس

بسمہٖ سبحانہ

عرضِ تنظیم

زیرِ نظر مجموعہ "اَنَا مِن حُسَینؑ" کا دوسرا ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
یہ بارہ۱۲ مجالس کا مجموعہ ہے جن کے ذریعہ سرکار علامہ جوادی اعلی اللہ مقامہ، نے ۱۴۱۸ھ میں مرکزِ حسینی ابوظبی سے عالمِ اسلام کو کردارِ امامِ حسینؑ کا پیغام دیا تھا۔
یہ مجموعہ، اُس مجموعہ کا تتمہ ہے جو "حسینؑ مِنّی" کے عنوان سے اس سے پہلے پیش کیا جاچکا ہے۔ دونوں کا فرق یہ ہے کہ پہلے مجموعہ کا تعلق امام حسینؑ کی شخصیت و عظمت سے ہے اور اس مجموعہ کا تعلق امام حسینؑ کے کردار سے ہے۔
ناظرین کرام اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی یہ اندازہ لگا سکیں گے کہ اس دورِ حریت میں جب بے شمار مقررین بے سروپا باتوں کی ترویج کر رہے ہیں اور منبر، مطالعۂ کتب سے آزاد ہو کر "کتابِ زندگی" پر چل رہا ہے۔ سرکار علامہ جوادیؒ کی ایک ایک مجلس کئی کتابوں کے مطالعہ کا نچوڑ ہوتی ہے اور ایک ایک لفظ سے ملّت کو ایک عظیم پیغام دیا جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ملّتِ اسلامیہ ان مجالس کا مطالعہ کرے اور ان سے درسِ بصیرت حاصل کرے۔
اس مجموعہ کے سلسلہ میں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اب تک سرکار علامہؒ کے متعدد مجموعہ ہائے مجالس منظرِ عام پر آچکے ہیں اور ان سب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرحوم نے ہمیشہ ان موضوعات کو اپنی مجالس کا عنوان قرار دیا ہے جنھیں عام طور سے ایسے اجتماعات میں چھیڑنے کی جرأت بھی نہیں کی جاتی

ہے۔ ان کا حق ادا کرنا تو بہت بڑی بات ہے۔

لیکن علامہؒ نے ایسے موضوعات کو عنوان کلام قرار دیا ہے اور ان کا حق بھی ادا کیا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کبھی مجالس کے مضامین میں تکرار سے کام نہیں لیا ہے۔

ادارہ نے علامہؒ کی زندگی میں اس مجموعۂ مجالس کی اشاعت کا شرف حاصل کیا تھا جو جلد ہی ختم ہو گئی تھی۔ مومنین کرام کے استفادہ کے لئے اسے دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔

والسلام

سیّد صفی حیدر

سکریٹری ادارہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

مجلس استقبالِ عزا

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الۡاَنۡبِيَاۤءِ وَالۡمُرۡسَلِيۡنَ سَيِّدِنَا وَمَوۡلَانَا اَبِى الۡقَاسِمِ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهِ الطَّيِّبِيۡنَ الطَّاهِرِيۡنَ الَّذِيۡنَ اَذۡهَبَ اللّٰهُ عَنۡهُمُ الرِّجۡسَ وَطَهَّرَهُمۡ تَطۡهِيۡرًا اَمَّا بَعۡدُ فَقَدۡ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَاٰلِهٖ حُسَيۡنٌ مِّنِّىۡ وَاَنَا مِنۡ حُسَيۡنٍ۔

حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اللہ اس سے محبّت کرے جو حسینؑ سے محبت کرے۔

سرکار دو عالمؐ کے اس ارشاد گرامی کی روشنی میں سال گذشتہ عرفان امام حسینؑ کے ذیل میں جو معروضات آپ کے سامنے پیش کئے جا رہے تھے ان کے اختتام پر یہ اعلان کیا گیا تھا کہ انشاءاللہ یہ سلسلۂ کلام اگلے سال بھی جاری رہے گا چنانچہ امسال اسی کی تکمیل کے لئے جو سلسلۂ کلام کل سے شروع ہوگا اس میں اسی موضوع سے متعلق اپنے گذارشات آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ آج استقبال عزا کے سلسلہ سے چند باتیں مختصراً گذارش کرنا ہیں اور اصل موضوع کا آغاز انشاءاللہ کل سے ہوگا۔

ایک بہت بڑا مسئلہ ہے جو ہر صاحب فہم اور دیندار انسان کے لئے قابل توجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا کا کوئی موضوع اور کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جو شریعت کے

حدود سے بالاتر ہو "ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ" پروردگار عالم نے اپنے پیغمبرؐ سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ ہم نے آپ کو حکم کے راستہ پر لگا دیا ہے۔ آپ اسی راستہ پر چلتے رہیں۔ یعنی پیغمبر اسلامؐ کی پوری زندگی کا کمال ہی یہ ہے کہ یہ زندگی پابند شریعت تھی اور سرکار کی زندگی میں کوئی عمل ایسا نہیں تھا جو قانون الٰہی سے ہٹ گیا ہو یا مرضیٔ الٰہی کے خلاف ہو گیا ہو۔ کسی صاحب عصمت کا سب سے بڑا کمال کردار یہ ہوتا ہے کہ وہ معصوم ہوتا ہے یعنی کوئی کام مرضیٔ پروردگار کے خلاف نہیں کرتا ہے اور اسی مرضیٔ پروردگار کے بیان کا نام ہوتا ہے شریعت۔

پروردگار اپنی مرضی کا اعلان مرضی کے نام سے نہیں کرتا ہے۔ بلکہ جس چیز کو پسند کرتا ہے اسے واجب بنا دیتا ہے یا مستحب بنا دیتا ہے۔ اور جس چیز کو ناپسند قرار دیتا ہے اگر صرف ناپسند ہے تو مکروہ کہہ دیتا ہے اور اگر ناقابلِ برداشت ہو تو اسے حرام قرار دے دیتا ہے۔ یہ احکامِ شریعت کے الفاظ درحقیقت رضائے الٰہی کے بیان کے لئے بہترین ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ اکثر لوگوں کو خیال پیدا ہوتا ہے کہ رضائے خدا کوئی الگ چیز ہے اور واجب و حرام کے جھگڑے الگ ہیں یعنی ہو سکتا ہے کہ انسان نہ واجبات کی پابندی کرے نہ حرام سے پرہیز کرے اور اس کے بعد بھی رضائے الٰہی حاصل کر لے۔

یہ بیچارے شائد خیال کر رہے ہیں کہ رضائے الٰہی شائد کسی دوکان پر ملتی ہے جہاں سے جا کے خرید لیں گے جب کہ رضائے پروردگار، پروردگار کے قوانین اور اس کی اطاعت میں ہے۔ اطاعت سے ہٹنے کے بعد کوئی شخص بندہ کی رضا حاصل نہیں کر سکتا ہے تو پروردگار کی رضا کیا حاصل کرے گا۔ اگر باپ بیٹے کو حکم دے اور بیٹا یہ چاہتا ہے کہ اس کا باپ اس سے راضی رہے تو اسے باپ کے احکام پر عمل کرنا ہوگا۔

باپ کی بات کو ٹھکرا کے اگر یہ سوچے کہ باپ راضی رہے گا تو یہ دیوانگی ہے۔ باپ کا تو ایک مرتبہ ہوتا ہے۔ مگر دو دوست ہیں اور ایک دوست نے دوسرے دوست سے کسی بات کا مطالبہ کر دیا تو اگر وہ چاہتا ہے کہ اس کا دوست اس سے راضی رہے تو اسے اس مطالبہ کو بہر حال پورا کرنا ہوگا ورنہ مطالبات کو ٹھکرانے کے بعد یہ امید

رکھنا کہ وہ دوست ہم سے راضی رہے گا ایک خیال خام کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ انسان برابر والا ہو یا چھوٹا ہو یا بڑا ہو۔ جس کو راضی کرنا چاہتا ہے اسے اس کی بات کو ماننا پڑے گا۔ حد یہ ہے کہ اگر باپ بھی اپنی اولاد کو خوش رکھنا چاہتا ہے تو اسے معلوم ہے کہ جب تک اس کے مطالبات پر عمل نہ کرے گا بیٹا خوش نہیں ہو سکتا ہے۔ رضا حاصل کرنے کے لئے صرف ایک ہی راستہ ہے کہ انسان اس کے مطالبات کو پورا کرے جس کی رضا درکار ہے۔ یہ سوچنا جنون سے کم نہیں ہے کہ انسان احکام کو ٹھکرا دے گا اور اس کے بعد بھی حاکم کو راضی کرلے گا۔ یہ نہ گھر میں ہوتا نہ بازار میں، نہ حکومتوں میں ہوتا ہے نہ شریعتوں میں، نہ دنیا میں ہوتا ہے نہ دین میں، نہ کہیں ہوتا ہے اور نہ کہیں ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جنھیں معصوم کہتے ہیں ان کی تعریف ہی یہ کرتے ہیں کہ معصوم اسے کہتے ہیں جو کوئی گناہ نہیں کرتا ہے۔ یعنی اللہ کے سارے احکام پر عمل کرتا ہے۔ معصوم کے معنی یہ نہیں ہیں کہ احکام خدا سے اونچا ہوتا ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ احکام خدا نیچے ہوتے ہیں اور معصوم اس سے اونچا ہوتا ہے۔ بھلا وہ کون سا انسان پیدا ہوگا جو خدا سے اونچا ہو جائے گا۔ صلوات

احکام الٰہی، احکام الٰہی ہیں۔ نہ کوئی خدا سے بالاتر ہو سکتا ہے اور نہ کوئی حکم خدا سے بالاتر ہو سکتا ہے۔ ناممکن ہے کوئی بندہ ایسا پیدا ہو جائے کہ جس کا مرتبہ حکم الٰہی سے بلند تر ہو جائے۔ یہ جو آپ سنتے رہتے ہیں کہ بعض اوقات بعض جاہل لوگ جو نہ حکم خدا کو جانیں نہ خدا کو پہچانیں، نہ شریعت جانیں نہ اس کے قوانین جانیں، ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ احکام خدا کی کوئی اوقات نہیں ہوتی ہے پیغمبرؐ یا امامؑ کے آگے۔ یہ وہ بیچارے ہیں جو یہی نہیں جانتے ہیں کہ حکم خدا کہتے کسے ہیں۔ وہ صرف چند حرکات اور اعمال کا حساب لگاتے ہیں اور یہ طے کر دیتے ہیں کہ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ جب کہ اگر آپ غور کریں تو سرکار دو عالمؐ نے جو اعلان فرمایا ہے کہ میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، کتاب خدا اور اپنے اہلبیتؑ۔ اسی روایت میں خود آپ نے ثقلین کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ان میں جو ثقل اکبر ہے وہ کتاب خدا ہے اور اس کے بعد میرے اہلبیتؑ ہیں۔ بعض افراد کو تعجب

ہوتا ہے کہ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے۔ حالانکہ کھلی ہوئی بات ہے کہ کتاب اللہ چند اوراق کا نام نہیں ہے کہ اس کا یوں حساب لگایا جائے کہ ورق کی حیثیت کیا ہے اور آدمی کا مرتبہ کیا ہے جیسا کہ بعض لوگ حساب لگاتے ہیں کہ کتاب خدا چند اوراق ہیں، چند تحریریں ہیں، ایک دفتی ہے کچھ کاغذ ہے۔ اور کہاں یہ سامان اور کہاں انسان۔ لیکن عزیزو! مسئلہ دفتی اور کاغذ یا اوراق کا نہیں ہے۔ کتاب خدا کلام الٰہی ہے، احکامِ پروردگار کا مجموعہ ہے، اور احکام پروردگار کی اطاعت ہر انسان پر لازم ہے۔ لہٰذا حکم ہمیشہ آگے رہے گا اور انسان ہمیشہ پیچھے رہے گا اور انسان کی بلندی یہی ہو گی کہ وہ حکم خدا کو سامنے رکھے۔ جو انسان حکمِ خدا سے اونچا ہونا چاہتا ہے وہی درحقیقت پست ہو جاتا ہے۔ حکم الٰہی سے بالاتر دنیا میں کوئی شئے نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں جو حکم خدا پر اتنا عمل کرتے ہیں کہ ان کا عمل ہی علامت حکم خدا بن جاتا ہے۔

یہ دنیا داری میں بھی ہوتا ہے اور مذہب میں بھی ہوتا ہے۔ دنیا داری میں اگر دو آدمیوں میں اتنے گہرے تعلقات ہو جائیں کہ یہ وہی کہتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور وہ وہی کہتے ہوں جو یہ کہتے ہوں اور آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ وہ صاحب کیا کہتے ہیں اور اُن تک آپ کی رسائی ممکن نہیں ہے تو آپ یہ دیکھ لیتے ہیں کہ یہ صاحب کیا کہتے۔ اور اِن کے بیان کو دیکھ کے یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ کسی ملک کا سربراہ عوام کے سامنے اگر نہیں بیٹھتا ہے اور نہ کوئی وزیر اگر بیٹھتا ہے مگر عوام الناس پتہ لگا لیتے ہیں کہ سربراہِ مملکت یا کوئی منصب دار یا عہدہ دار کیا چاہتا ہے اور اس کا ذریعہ اس کے آس پاس بیٹھنے والوں کی تقریریں اور ان کے بیانات ہوتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب حکومت کا رُخ کیا ہے اس لئے کہ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے ہیں اور ہم کبھی نہیں رہتے ہیں۔ یہی حیثیت اُن حضرات کی ہوتی ہے جن کو ہم معصومین کہتے ہیں کہ وہ خدا کے ساتھ اتنا رہتے ہیں کہ ان کا کوئی ایک عمل بھی مرضی خدا سے الگ نہیں ہوتا ہے، وہ ہمیشہ مرضی خدا کی اطاعت کرتے ہیں اور ہم ان کی اطاعت سے مرضی خدا کا اندازہ کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا ہے کہ وہ جو کہہ دیں وہ مرضی خدا ہو جاتا ہے۔ بات

وہی ہوتی ہے کہ ہمارے پاس مرضی کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا ہے اور انکے قول وعمل سے مرضیٔ خدا کا علم ہوتا ہے۔ ان کا کہنا مرضیٔ خدا ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ مرضیٔ خدا کے پابند ہوتے ہیں۔ منطقی زبان میں دو لفظیں ہیں کہ جب ایک چیز کو دوسری سے پہچانا جاتا ہے تو اس کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بنیاد کو پہچان لیا جاتا ہے تو اس کے آثار پہچان لئے جاتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آثار کو پہچان لیا جاتا ہے تو ان کی بنیاد کو جان لیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کسی دروازہ کا قفل کھولنا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ دروازہ کھُلا یا نہیں تو آپ دروازہ کے قفل کو کھُلتے ہوئے نہ بھی دیکھیں جیسے ہی آپ دیکھتے ہیں کہ آدمی کے ہاتھ میں کنجی گھوم رہی ہے آپ سمجھ جاتے ہیں کہ دروازہ کھُل گیا ہے اس لئے کہ کنجی ذریعہ ہے دروازہ کھولنے کا۔ تو جیسے ہی بنیاد کو پہچان لیا آثار معلوم ہو گئے۔ اس کے برخلاف اگر ہم نے یہ دیکھنا چاہا کہ کسی گھر میں آگ جلی یا نہیں تو گھر کے اندر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے ہی باہر سے اٹھتا ہوا دھواں دکھا ہم سمجھ گئے کہ گھر میں آگ جل رہی ہے۔ تو کیا دھویں سے آگ جل گئی ہے؟۔ نہیں بات صرف یہ ہے کہ وہاں سبب کے ذریعہ اثر کو پہچانا ہے اور یہاں اثر کے ذریعہ سبب کو پہچانا ہے کہ دونوں میں اتنا گہرا رشتہ ہے کہ کبھی سبب سے اثر معلوم ہوتا ہے اور کبھی اثر سے سبب معلوم ہوتا ہے۔ یہی حال رضائے خدا اور کردار آل محمدؐ کا ہے کہ اگر آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ رضائے خدا کیا ہے تو سمجھ لیں کہ یہی کردار آل محمدؐ کا ہے اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ خدا اس عمل سے راضی نہیں ہوتا ہے تو سمجھو کہ آل محمدؐ نے کبھی یہ کام انجام نہیں دیا ہے یعنی اصل کو پہچان لیا تو اثر خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ رضائے خدا کیا ہے تو کردار اہلبیتؑ کو دیکھنے کے بعد رضائے خدا کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ صلوات

تو کبھی رضائے الٰہی سے کردار معلوم ہوتا ہے اور کبھی کردار سے رضائے الٰہی معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ فرق اپنی جگہ پر ہے کہ رضائے خدا اصل ہے اور کردار اس کی

فرع ہے۔ اگرچہ دونوں ہوتے ایک ہی وقت میں ہیں مگر صاحبانِ عقل پہچانتے ہیں کہ کردار سے رضا نہیں پیدا ہوتی ہے بلکہ رضا سے کردار پیدا ہوتا ہے۔ یعنی عمل رضائے خدا کے لئے ہو رہا ہے تاکہ خدا راضی ہو جائے۔ اس کی بہترین مثال قرآن مجید نے پیش کی ہے کہ ایسا نہیں ہوا ہے کہ علیؑ نے نفس بیچ ڈالا تو خدا راضی ہو گیا بلکہ رضائے خدا لینا تھی لہٰذا اس کے لئے نفس بیچا جا رہا تھا۔ صلوات

مختصر یہ ہے کہ معصوم کا کردار ہو یا غیر معصوم کا کردار ہو، ہر کردار قانون الٰہی کا پابند ہوتا ہے اور کردار، کردار اسی وقت کہا جاتا ہے جب قانون الٰہی کا پابند ہو جائے۔ ورنہ اگر قانون خدا سے آزاد ہو جائے گا تو اس کا نام بدکرداری ہو گا کردار نہیں ہو گا۔ تو قانون الٰہی ایک ایسی شے ہے جو پوری کائنات سے بالاتر ہے اور ہر ایک کا فریضہ ہے کہ وہ قانون الٰہی پر عمل کرے۔ کوئی بندہ خدا سے اونچا نہیں ہو سکتا ہے لہٰذا دنیا کا کوئی عمل بھی عمل ایسا نہیں ہو سکتا ہے جو قانون الٰہی سے بالاتر ہو جائے اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ تو بندگی خدا کا معاملہ ہے، یہاں قانون کی کوئی اوقات نہیں ہے۔ تو اگر قانون کی کوئی اوقات ہی نہیں ہے تو بندگی ہو گی کیسے؟ اگر کوئی آدمی نمازیں شروع کر دے، ایک نماز ڈیڑھ رکعت کی، ایک ڈھائی رکعت کی، ایک ساڑھے تین رکعت کی، ایک پونے چار رکعت کی، تو سب دریافت کریں گے۔ ارے بھئی یہ کیا ہو رہا ہے اور وہ یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ یہ تو بندگی کا معاملہ ہے، اس میں قانون کی کیا ضرورت ہے۔ بندگی، بندگی بنتی ہی اس وقت ہے جب قانون کی پابند ہو ورنہ اگر قانون سے آزاد ہو جائے تو اس کا نام بندگی نہیں آوارگی ہے۔ آوارگی الگ ہوتی ہے اور بندگی الگ ہوتی ہے۔ بندگی کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ قانون کی پابند ہو۔ لہٰذا نہ کوئی نماز ایسی ہو سکتی ہے جو قانون سے بالاتر ہو۔ اور نہ کوئی روزہ ایسا ہے جو قانونِ خدا سے بالاتر ہو جائے۔ نہ زندگی کا کوئی عمل ایسا ہو سکتا ہے، چاہے وہ دین کا ہو یا دنیا کا، ہر عمل کو قانون خدا کا پابند بننا پڑے گا اور جب تک پابند رہے گا اسی وقت تک، اس کا نام اطاعت رہے گا، عمل خیر رہے گا اور جیسے ہی قانون خدا سے منحرف ہو جائے گا عمل بدترین عمل ہو جائے گا۔

ایک بڑا مسئلہ ہے معرفت کا جس سے نہ جانے دنیا کی کتنی بڑی اکثریت ہے جو غافل اور بے خبر

ہے۔ خدا کے بندے ہیں مگر خدا کو نہیں پہچانتے ہیں۔ نبیؐ کے امتی ہیں مگر نبیؐ کو نہیں پہچانتے ہیں، امام کے ماننے والے ہیں مگر امام کو نہیں پہچانتے ہیں۔ بس الفاظ کا کاروبار ہو رہا ہے کہ وہ بندۂ خدا کہے جاتے ہیں، وہ امتی کہے جاتے ہیں اور وہ چاہنے والے کہے جاتے ہیں! اگر جو جس کا چاہنے والا ہے وہ اسی کو نہیں پہچانتا ہے۔ ورنہ اگر بندہ، بندۂ خدا ہے تو اسے عظمتِ خدا کو پہچاننا چاہئے۔ امتی اگر پیغمبرؐ کا امتی ہے تو اسے پیغمبرؐ کی اطاعت کرنا پڑے گی۔ چاہنے والا اگر امامؑ کا چاہنے والا ہے تو جو امامؑ کی زندگی ہے وہی زندگی گذارنا پڑے گی۔ اس زندگی سے ہٹ کے کوئی کام نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر کہیں تاریخ میں کوئی ایک واقعہ چھوٹا، بڑا، معتبر، غیر معتبر مل جائے جس کی لوگ تلاش میں رہتے ہیں کہ کہیں سے کوئی کہانی، قصّہ، واقعہ مل جائے جس سے کوئی راستہ نکل آئے اور ہم آزاد ہو جائیں اور قانونِ الٰہی کے پابند نہ رہیں اور سب سے زیادہ معتبر وہی واقعہ ہو جائے حالانکہ واقعات کی صحت قرآن و حدیث کی پابند ہے۔ واقعات سے قرآن مجید کی تاویل یا تردید نہیں کی جاسکتی ہے۔ میں ایک مقام پر تھا اور یہ گذارش کر رہا تھا کہ کسی روایت کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کے دو ذریعہ ہوتے ہیں۔ ایک ذریعہ علماء نے ایجاد کیا ہے، وہ سوائے دردسر کے کچھ نہیں ہے۔ راوی کے حالات دیکھئے کہ اگر ایک روایت میں ۲۵ پچیس نام آگئے ہیں تو جائیے ۲۵ پچیس لوگوں کے حالات پڑھئے۔ جس آدمی کے حالات اُٹھا کے دیکھئے اس کے حالات لکھنے والوں میں بھی اختلاف ہے۔ ایک صاحب کہہ رہے ہیں کہ معتبر ہے، دوسرے صاحب کہہ رہے ہیں کہ غیر معتبر ہے۔ اب پہلے ان کے حالات پڑھئے کہ معتبر کہنے والے کی اوقات کیا ہے، اور غیر معتبر کہنے والے کے حالات کیا ہیں۔ جب ان کے حالات پڑھنا شروع کئے تو معلوم ہوا کہ ان کے حالات لکھنے والوں میں بھی اختلاف ہے۔ ایک کا کہنا ہے کہ نہایت ہی محقق و مدقق تھے۔ دوسرا کہتا ہے کہ ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ جس کو چاہا اونچا کر دیا، جس کو چاہا گرا دیا۔ اب جائیے اُن کے حالات پڑھئے کہ جن صاحب نے تعریف کی ہے۔ وہ کیا بیچتے ہیں، ان کی اوقات کیا ہے، اور جو صاحب مذمت کر رہے ہیں ان کی اوقات کیا ہے۔ یوں ہی لگے رہئے۔ ایک روایت کو طے کرنے کے لئے سیکڑوں انسانوں کے حالات پڑھئے اور جب حالات تک پہونچے تو پھر ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ یہ تو راویوں کے حالات

ہو گئے اب روایت کے حالات پڑھئے کہ الفاظ کیا ہیں ۔ لغت کیا ہے، محاورہ کیا ہے، اصطلاح کیا ہے ۔ اُس زمانہ میں معنی کیا تھے ۔ آج معنی کیا ہیں یہ ایک طویل دردِ سر کا سلسلہ ہے جو علماء نے ایجاد کیا ہے اور ایسا راستہ ہے جس پر چلنے کے لئے پچاس سال، سو سال کی عمر چاہیئے ۔ جب کہ ایک دوسرا آسان ترین راستہ اور ہے جو مومنین نے نکال لیا ہے کہ جو روایت اپنے مطلب کی ہو، وہ یقیناً معتبر ہے اور جو ذرا اپنے مزاج کے خلاف ہو وہ امام بھی فرمائیں تو اس پر غور کرنا پڑے گا ۔ یہی ہے معیار جس پر سارا کاروبار چل رہا ہے ۔ باقی سب تو کتابوں میں ہے اور علماء جانتے ہیں ۔ ایک نہیں اس سلسلہ میں ایک سو تجربات ہیں ۔ کہیئے تو ابھی یہیں بیان کر دوں اور آپ سب لوگ میرا ساتھ دیں گے ۔ اسی موضوع پر آپ کے مزاج سے ملتی کوئی بات بیان کر دوں تو کوئی مجھ سے نہیں پوچھے گا کہ یہ کہاں لکھا ہے ۔ مثلاً اگر میں کہہ دوں کہ جو حضرات باہر بیٹھے ہوئے ہیں انھیں مجلس کا ثواب کم ملے گا اور جو اندر آکے بیٹھ جائیں انھیں ثواب زیادہ ملے گا تو سب گھبرا کر اندر آکے بیٹھ جائیں گے اور کوئی نہ پوچھے گا کہ یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ باہر کا ثواب الگ ہوتا ہے اور اندر کا ثواب الگ ہوتا ہے ۔ کتنے ہی علاقہ ہیں جو ماڈرن علاقہ کہے جاتے ہیں اور بیچارے مومنین وہاں مجلسیں کرتے ہیں ۔ اب ظاہر ہے کہ انھوں نے کوئی ہال کرایہ پر لے لیا ہے تو ہال آپ کے لئے تو بنا نہیں ہے نہ آپ کی مجلسوں کے لئے بنا ہے وہ تو بنا ہے اپنے کام کے لئے ۔ پانچ سو کرسیاں لگی ہوئی ہیں ہال دینے والا کرایہ پر دے گا تو اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ آپ کرسیاں اٹھا کر باہر پھینک دیں ۔ لہٰذا اگر آپ کو مجلس کرنا ہے تو اسی پر کیجئے ۔ نہ کرنا ہو تو نہ کیجئے ۔ اب وہاں یہ بحث شروع ہو جاتی ہے کہ کرسی پر بیٹھ کر مجلس سُنی جائے تو ثواب کتنا ملے گا اور اس کو اٹھا کر پھینک دیا جائے اور زمین پر بیٹھ جائیں تو ثواب کتنا ملے گا ۔ ایک نے کہا جناب ہم تو بچپنے سے سُنتے چلے آرہے ہیں "فرشِ عزا" کرسیٔ عزا تو ہم نے کہیں سُنی ہی نہیں ہے ۔ لہٰذا اگر کرسی کو ہٹا دیں گے تو ثواب زیادہ ہو جائے گا اور رکھ دیں گے تو ثواب کم ہو جائے گا ۔ اب ان سے پوچھیں کہ یہ کس کتاب میں لکھا ہے، یہ کس امام نے بتایا ہے کہ چٹائی پر ثواب زیادہ ہے، قالین

پر کچھ کم ہو جاتا ہے۔ کرسی پر اور بھی کم ہو جاتا ہے اور بہترین کرسی ہو تو اور کچھ کم ہو جاتا ہے۔ کسی روایت میں کہیں دیکھا ہے۔ کسی امام نے فرمایا ہے۔ اور اگر فرمایا بھی ہے تو کون پوچھتا ہے کہ کہاں لکھا ہے۔ کوئی نہیں پوچھتا ہے۔ اس لئے کہ یہ بات مطلب کی ہے لیکن اگر کوئی آدمی یہ کہہ دے کہ میں نے ایک روایت دیکھی ہے کہ جو مجلس میں آگے بیٹھے اس کا فریضہ ہے کہ پہلے پچاس درہم جمع کرے اس کے بعد مجلس میں بیٹھے تو فوراً کہیں گے کس کتاب میں دیکھا ہے آپ نے۔ کس امام کی روایت ہے۔ اس کا راوی کون ہے یہ روایت تو ہم نے کبھی نہیں سنی ہے۔ آپ کے سننے نہ سننے سے کوئی روایت معتبر یا غیر معتبر نہیں ہو جاتی ہے۔ ہاں پچاس درہم ملنے کی روایت ہو تو کوئی نہیں پوچھتا کہ کہاں لکھی ہے، اور پچاس درہم دینے کی روایت ہو تو ہر ایک پوچھتا ہے کہ کہاں لکھی ہے۔ اب تو اندازہ ہو گیا کہ نہ معیار راوی ہے اور نہ روایت۔ معیار اپنا مزاج ہے۔ مزاج سے مل جائے تو سب معتبر ہے چاہے کتنی ہی غیر معتبر کیوں نہ ہو اور مزاج سے الگ ہو جائے تو بالکل غیر معتبر ہے۔ تو جو شخص اپنے مزاج ہی کو معیار شریعت بنالے گا وہ بیچارہ رضائے خدا کے معنی کیا سمجھے گا یا رضائے خدا کس طرح حاصل کر سکے گا۔ صلوات

تو عزیزانِ محترم! میں یہ گزارش کر رہا تھا کہ کوئی مسئلہ بھی ہو چاہے زندگی کا ہو یا موت کا ہو۔ غم کا مسئلہ ہو یا خوشی کا مسئلہ ہو۔ نماز کا ہو یا روزہ کا۔ مجلس کا ہو یا ماتم کا۔ ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ قانون خدا سے بالاتر ہو جائے۔ ہر مسئلہ کو قانونِ خدا کی حدوں کے اندر رکھنا ہو گا کہ نماز جیسی عبادت جس کو ستونِ دین کہا گیا ہے وہ بھی دو رکعت سے سوا دو نہیں ہو سکتی ہے۔ صرف اس لئے کہ قانون خدا کے خلاف ہے تو دنیا کا کوئی عمل بھی ایسا نہیں ہو سکتا ہے جو قانون خدا سے آزاد ہو جائے۔ ہر عمل کو قانون خدا کا پابند بننا پڑے گا اور جب تک پابند رہے گا عمل، عمل کہے جانے کے قابل رہے گا اور جیسے ہی پابندی سے آزاد ہو جائے گا پھر اس عمل کی کوئی حیثیت نہیں رہے گی۔ خالی ہم سوچتے رہیں گے کہ بہترین عمل ہے۔ کتنے تجربات ہمارے سامنے آتے ہیں جہاں مومنین کے پاس ایک ہی دلیل ہوتی ہے کہ اس معاملہ میں کچھ نہ بولئے۔ سوال یہ ہے کہ آپ اپنے گھر میں جھگڑا کریں ہم کو بولنے

کی کیا ضرورت ہے۔ آپ اپنے گھر میں حلوہ بنائیں، کھائیں ہم سے کیا تعلق ہے۔ لیکن دین کے معاملے میں ہم یا آپ بولتے ہیں تو نہ آپ پروردگار ہوتے ہیں اور نہ ہم پروردگار ہوتے ہیں۔ نہ آپ پیغمبر ہوتے ہیں اور نہ ہم پیغمبر ہوتے ہیں۔ نہ آپ امام ہیں نہ ہم امام ہیں۔ آپ ہم جب بولتے ہیں تو قانونِ خدا بیان کرتے ہیں۔ اور کس بندہ کی مجال ہے جو خدا سے یہ کہے کہ ہمارے معاملہ میں آپ کو بولنے کا حق نہیں ہے۔ وہ امتی بھی کیا بڑے تھے جنھوں نے جو چاہا طے کر لیا اور کہا کہ نبی کی کیا ضرورت ہے، یہ ہماری ریاست کا معاملہ ہے ہم جس کو چاہیں گے اپنا رئیس بنالیں گے۔ یہ ہماری زندگی کا معاملہ ہے، ہم جس کو چاہیں گے راہنما بنالیں گے۔ یہ ہماری قوم کا مسئلہ ہے ہم جس کو چاہیں گے امام بنالیں گے، خدا سے کیا تعلق ہے۔ تو خدا اگر ایسے ہی بے تعلق ہو جائے تو وہ کون سی دنیا ہے جس کا خدا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ خدا سے بے تعلق تو دنیا نہیں ہو سکتی ہے دین کیسے ہو جائے گا۔ کسی انسان کو یہ اختیار نہیں دیا جا سکتا ہے کہ انسان یہ طے کرلے کہ جو ہم چاہیں گے ہم طے کرلیں گے۔ نہیں ہر مسئلۂ حیات کو خصوصیت کے ساتھ اگر مسئلہ کا تعلق دین سے ہے تو اسے بہر حال پابند شریعت ہونا پڑے گا۔ اس لئے کہ دین نام ہی قانون خدا کا ہے۔ دنیا داری تو قانون سے الگ ہو بھی سکتی ہے دین قانون خدا سے الگ نہیں ہو سکتا ہے۔ تو ہر وہ عمل جس کو آپ دین سمجھتے ہیں ہر وہ عمل جس کو ہم بندگی سمجھتے ہیں ہر وہ عمل جس کو ہم عبادت سمجھتے ہیں، اُسے سو فیصد قانون پروردگار کا پابند ہونا پڑے گا۔ قانونِ خدا سے ہٹا نہیں کہ پھر نہ دین ہے نہ مذہب ہے نہ بندگی ہے نہ اطاعت۔ سب سے بڑا تقاضہ معرفتِ حسینؑ کا یہ ہے کہ انسان اس حقیقت کو پہچان لے کہ قانونِ خدا سے بالاتر کوئی شئے نہیں ہے اور سارا کمال کردارِ انسان کا یہ ہے کہ اپنے کو قانون خدا کا پابند بنا دے۔ جو کام پوری زندگی امام حسینؑ نے انجام دیا ہے۔ امام حسینؑ کی حیات میں کوئی ایک عمل، کوئی ایک لفظ نہیں تلاش کیا جا سکتا ہے جو قانون خدا سے الگ ہو۔ بلکہ سخت ترین اوقات میں بھی انھوں نے پہچنوایا ہے کہ قانون الٰہی کا احترام کیا ہے اور یہی ان کی معرفت کا

تقاضہ ہے کہ اگر کوئی انھیں پہچان لے تو اس کی زندگی میں اتنا اثر پیدا ہو ہی جائے گا کہ اس کی زندگی کا ہر عمل حکم خدا کا پابند ہو جائے گا۔ کتنی مثالیں حیات امام حسینؑ میں ہیں جو میں انشاء اللہ آئندہ گذارش کروں گا۔ سال گذشتہ تو فقط شخصیت امامؑ کے بارے میں باتیں عرض کی تھیں، کردار کے بارے میں تو امسال عرض کروں گا تاکہ آپ کو قدم قدم پر یہ احساس پیدا ہو کہ کردار امام حسینؑ کا سب سے بڑا امتیاز یہی ہے کہ امام حسینؑ کی زندگی کا کوئی ایک عمل بھی قانون الٰہی اور رضائے پروردگار سے الگ نہیں ہے اور اس سلسلہ میں یہ بنیادی نکتہ آپ اپنے ذہن میں محفوظ کرلیں جو آئندہ بھی کام آئے گا کہ کوئی عمل زندگی کا نہ دنیا میں اور نہ دین میں قانونِ الٰہی سے بالاتر نہیں ہو سکتا ہے۔

یہ ہماری زندگی کا اور ہمارے دین و مذہب کا پہلا بنیادی اصول ہے۔ دوسرا مسئلہ جو ہمارے قانون اور ہماری زندگی کا ہے، کہ کسی شخص کے جذبات و خواہشات کو مذہب کے مقابلہ میں آزاد نہیں کیا جاسکتا ہے۔ حد یہ ہے کہ معصوم کے خواہشات کی بھی مذہب کے مقابل میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ مقابلہ میں آتے ہی نہیں ہیں اور ان کے پاس کوئی خواہش مذہب کے مقابلہ میں پیدا ہی نہیں ہوتی ہے لیکن اگر کوئی انسان یہ سوچنے کے لئے تیار ہو جائے تو قانون قانون ہے اس کے آگے کسی کی خواہش کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور اس کی بہترین علامت یہ آیت شریفہ ہے جسے آپ صبح و شام پڑھتے اور سنتے رہتے ہیں اور شاید کتنے آدمیوں نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ خدا نے اس آیت میں کس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پروردگار عالم یہی سمجھانا چاہتا ہے کہ قانون خدا کے مقابلہ میں کسی کے خواہشات اور جذبات کی کوئی حیثیت نہیں ہے "وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ"[1] پیغمبرؐ اپنی خواہش سے نہیں بولتا ہے۔ خدا کو یہ صفائی دینے کی کیا ضرورت ہے کہ پیغمبرؐ اپنی خواہش سے نہیں بولتا ہے۔ اگر پیغمبرؐ اپنی خواہش سے بولے گا تو کیا ویسے ہی بولنا شروع کر دے گا جیسے ہم اور آپ بولتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ پیغمبر، پیغمبر ہے اس کے تو خواہشات بھی مطابق تقویٰ ہوں گے پھر اگر وہ خواہش سے بولتا ہے تو کیا پریشانی ہے۔ مگر پروردگار نے کہا یہ میرا پیغمبر، پیغمبر ہے۔ مگر پیغمبر ہونے کے بعد بھی خواہشات سے نہیں بولتا ہے یعنی یہاں پیغمبر

کے خواہشات کا بھی گذر نہیں ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ بولتا کیسے ہے۔ اگر خواہش سے نہیں بولتا ہے تو بولتا کیسے ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی" یہ وہ وحی ہے جو برابر نازل ہو رہی ہے یعنی پیغمبرؐ کے خواہشات مکمل طور پر وحی خدا کے پابند ہیں اور یہی کمال کردار ہے۔ تو جب پیغمبرؐ کی خواہش وحی خدا کے مقابلہ میں نہیں ہے تو دنیا میں کسی کو یہ کہنے کا حق کیا ہے کہ یہ ہمارے جذبات کا معاملہ ہے، اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ کے خواہشات کیا مذہب سے اونچے ہو گئے ہیں؟ آپ کے جذبات کیا پروردگار سے بالاتر ہو گئے ہیں؟۔ مذہب قانون خدا ہے کہ جہاں خدا کے علاوہ کسی کو بولنے کا حق نہیں ہے۔ تو جب پیغمبرؐ وحی خدا کے مقابلہ میں نہیں بول سکتا ہے اور جو بولتا ہے وہ خدا کی وحی ہوتی ہے تو امتی کو کیا اختیار ہے کہ وحی کا راستہ الگ ہو جائے اور خواہشات کا راستہ الگ ہو جائے۔ قانون آیا ہی ہے خواہشات کو پابند بنانے کے لئے۔ لہٰذا ہر انسان کو اپنے خواہشات اور جذبات کو قانون خدا کا پابند بنانا پڑے گا، ورنہ ذرا آزاد چھوڑ دیئے گئے تو مذہب کا نام بھی نہیں رہ جائے گا۔ دنیا میں صرف لامذہبیت رہے گی اور صرف بیدینی کا رواج رہے گا۔ مالک نے اہلبیتؑ کے بارے میں بھی یہی ارشاد فرمایا ہے "وَمَا تَشَاؤُنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰهُ" تم کچھ چاہتے ہی نہیں ہو، بس وہی چاہتے ہو جو خدا چاہتا ہے۔ گویا وہاں بولنے کو پابند بنا دیا اور یہاں چاہت پر پابندی لگا دی۔ تو جب معصوم پابند ہو گئے تو آزاد کسے چھوڑا جائے گا۔ صلوات

مذہب میں نہ کسی جذبہ کو آزاد چھوڑا جا سکتا ہے اور نہ کسی خواہش کو آزاد چھوڑا جا سکتا ہے۔ اور یہیں سے کردار پہچانے جاتے ہیں کہ انسان جذبات کو کیسے پابند قانون بناتا ہے اور ہم میں یہ صلاحیت ہے یا نہیں۔ آپ جہاں سے چاہیئے تاریخ پڑھنا شروع کر دیجئے۔ جتنے واقعات ہم اور آپ صبح و شام سنتے رہتے ہیں انھیں کی حقیقت کو پہچان لیں۔ جس دن مولائے کائنات کے گلے میں رسی باندھ کر گھر سے نکالا گیا، مدینۂ رسولؐ میں پیغمبرؐ کے بعد سب سے پہلا حادثہ تاریخ اسلام کا

پیش آیا۔ شہزادیؑ کائنات کا دروازہ جلا اور مولائے کائناتؑ کو رسّی میں باندھ کے گھر سے نکالا گیا۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت سلمانؓ کہاں تھے؟ کیا کسی اور ملک کی طرف سفر کر گئے تھے۔ ابوذرؓ کہاں تھے؟ عمار کہاں تھے؟ مقداد کہاں تھے؟ اور چاہنے والے کہاں تھے؟ سب مدینہ میں تھے یا سب کوفہ چلے گئے تھے؟ اسی مدینہ میں ہی تو تھے کہیں باہر تو نہیں چلے گئے تھے؟ تو آخر یہ سب چاہنے والے تھے یا نہیں؟۔ اگر ہم وہاں ہوتے تو ہم تو اس کا انتظار بھی نہ کرتے کہ مولاؑ کیا فرما رہے ہیں۔ مولاؑ اجازت دیتے یا نہ دیتے ہمارے جذبات تو برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ مولاؑ کے گلے میں رسّی ہو اور ہم کھڑے دیکھتے رہ جائیں، ہم تو وہیں لڑ مر کے ختم ہو جاتے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ختم تو ہو جاتے سلمان نہ ہوتے۔ مر تو جاتے لیکن ابوذر نہ ہوتے۔ ابوذر وہی ہے جو زندہ رہ گئے۔ سلمان وہی ہے جو زندہ رہ گئے۔ وہی دسویں اور نویں درجہ پر فائز ہوئے ہیں۔ ہمارے اور ان کے درمیان فرق یہی ہے کہ ہم جو سوچ رہے ہیں کہ ہم یہ واقعہ دیکھتے تو مولا کی پرواہ بھی نہ کرتے اور اپنے جذبات کی بنا پر میدان میں کود پڑتے۔ مگر وہ تھے جو جذبات کو روکے ہوئے تھے اور مولاؑ کی مرضی دیکھ رہے تھے۔ کردار جذبہ سے طے نہیں ہوتا ہے۔ کردار مرضی سے طے ہوتا ہے۔ صلوات

یہ چاہنے والے جو صاحبانِ کردار ہیں ان کے صاحبان کردار ہونے کا راز ہی یہ ہے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ مولاؑ سامنے ہیں ابھی اشارہ کر دیں تو جان دیدیں گے اور ظالموں کی جان لے لیں گے۔ لیکن اگر مولاؑ خاموش رہیں گے اور اجازت نہیں دیں گے تو پھر جو کچھ وہ برداشت کر رہے ہیں ہم بھی برداشت کر لیں گے۔ یہ ایک جذباتی مسئلہ تھا جس کو آپ نے دیکھ لیا۔ اس سے بالاتر ایک اور جذباتی مسئلہ تھا جو اس کے بعد پیش آیا کہ سپاہی، مجاہد زخم کھاتا ہوا، لڑتا ہوا، جہاد کرتا ہوا میدان میں آگے بڑھتا ہوا چلا جا رہا ہے اور وہاں تک پہونچ گیا ہے کہ اک دو قدم آگے بڑھائے تو ایک تلوار سے جنگ کا فیصلہ ہو جائے۔ فتح قدموں میں ہے کچھ بچا نہیں ہے۔ بیحساب زحمتیں برداشت کیجا چکی ہیں۔ ایک دو دن نہیں ایک مدّت سے مجاہدین لڑ رہے ہیں،

مر رہے ہیں، جانیں دے رہے ہیں اور وہ موقع آگیا ہے کہ اب فتح قدموں میں آگئی ہے۔ فقط دو قدم آگے بڑھنے کی دیر ہے۔ خیمے میں داخل ہوں حملہ کریں اور ظالم کا خاتمہ کر دیں۔ لشکر فرار کر جائے اور سارا میدان جہاد اپنے قبضہ میں آجائے کہ ایک مرتبہ آواز دی مالک بس! خبردار قدم آگے نہ بڑھنے پائیں۔ اور مالک نے اٹھی ہوئی تلوار کو روک لیا۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کا کیا حال ہوتا۔ لیکن اگر مجھ میں اتنی ہمت ہوتی اس طرح جہاد کرنے کی اور میں نے اتنی محنت کی ہوتی اور زخمی ہو کر اپنے کو وہاں تک پہونچا دیا ہوتا تو میں تو دو قدم آگے بڑھا کر ظالم کا خاتمہ ہی کر دیتا۔ اگر بعد میں مولاؑ کہتے کہ یہ تم نے کیا کیا، میں نے تو منع کیا تھا، تو میں عرض کرتا۔ حضور! اگر میں نے غلط کیا تو یہ گردن بھی حاضر ہے اسے آپ کاٹ دیجئے لیکن میں اس ظالم کو بہرحال برداشت نہیں کر سکتا۔ اتنی محنت کے بعد میں اسے زندہ چھوڑ دوں اور فتح قدموں میں آکر نکل جائے مجھ سے نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ میں نے غلط کیا ہے تو گردن حاضر ہے۔ میں مر جانا گوارہ کروں گا لیکن اتنی زحمت کو ضائع کرنا گوارہ نہیں کروں گا۔ لیکن عزیزو! یہ کام اگر کل ہو گیا ہوتا اور مالک نے بڑھ کے حاکم شام کا گلا کاٹ دیا ہوتا اور بظاہر میدان جیت لیا ہوتا تو شائد علیؑ یہ کہہ دیتے کہ بڑا ہمتی تھا، بڑا جری تھا، بڑا بہادر تھا، بڑا سورما اور ساونت تھا، بڑا لڑنے والا تھا۔ مگر یہ کبھی نہ کہتے کہ میرے لئے ویسا ہی تھا جیسے میں رسولؐ اللہ کے لئے تھا۔ صلوات

یہ سند جو مالک اشتر نے حاصل کی ہے یہ طاقت کا نتیجہ نہیں ہے اطاعت کا نتیجہ ہے۔ میں نے کبھی مرضئ رسولؐ سے ایک قدم آگے نہیں بڑھایا ہے اسی طرح مالک بھی کبھی میری مرضی سے آگے نہیں بڑھا ہے۔ نہ میں نے مرضئ پیغمبرؐ سے انحراف کیا تھا اور نہ مالک نے میری مرضی سے انحراف کیا ہے۔ بہادری کوئی ہنر نہیں ہے، بہادری کا پابند رضا ہونا ہنر ہے۔ ورنہ بہادری کا تقاضہ تو یہی تھا کہ خیمہ تک پہونچ گئے تھے تو گلا کاٹ دیتے۔ مگر گلا کاٹ دینا شجاعت اور بہادری نہیں ہے، اس کی شان کچھ اور رہی ہوتی ہے۔ اگر نفس درمیان میں نہ آنے پائے تو شجاعت ہے، ورنہ مار پیٹ ہے شجاعت نہیں ہے۔ قتل و خون کی دنیا الگ ہوتی ہے اور دین و مذہب کی دنیا الگ ہوتی ہے۔

تو ایک منزل مدینہ میں دیکھی اور ایک مرحلہ صفین میں دیکھا۔ کہ اگر وہاں جذبات پر قابو پا لیا تو سلمان، ابوذر، مقداد اور عمار ہو گئے۔ اور یہاں جذبات پر کنٹرول کر لیا تو مالک اشتر ہو گئے۔ اور پھر یونہی آپ آگے بڑھتے چلے جائیں۔ تاریخ میں دونوں طرح کے نام ہیں اور دونوں طرح کے چاہنے والے ہیں۔ امام حسنؑ کی صلح کے بعد ایک چاہنے والے نے آکر کہہ دیا "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا مُذِلَّ الْمُؤْمِنِيْنَ" آپ مولا ہیں سلام تو ہم کریں گے ہی، مگر کام آپ نے بہت غلط کیا ہے۔ یہ بھی ایک عجیب قسم ہے مولا ہونے کی۔ سلام بھی کریں گے اور اعتراض بھی کریں گے کہ کام جو آپ نے کیا ہے اس سے آپ نے ہم لوگوں کو ذلیل کر دیا ہے۔ استغفراللہ۔ یہی ایک لفظ ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہ گیا ہے اور کردار کے دامن پر ایک دھبہ بن گیا ہے کہ اگر وہ امام ہیں تو ان کے عمل پر تبصرہ کرنا یہ غلام کا کام نہیں ہے۔ اگر وہ جانشین پیغمبرؐ ہیں تو وہ جو کچھ کر رہے ہیں آپ کا کام یہ ہے کہ آنکھ بند کر کے اسے قبول کر لیں۔ کسی آدمی کو یہ حق نہیں دیا گیا ہے کہ وہ امام کے بارے میں کہے کہ آپ نے ہم کو ذلیل کر دیا ہے۔ امام کے صدقہ میں تو صاحبانِ ایمان کو عزّت حاصل ہوتی ہے اب امام کے بارے میں یہ کہنے کا کون سا حق ہے اور ایمان کی یہ کون سی قسم ہے کہ مولا کا عمل برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ یہ برداشت کرنے ہی کا نام تو مذہب ہے، برداشت نہ کرنے کا نام مذہب نہیں ہے۔ تو عزیزو! ایک لفظ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جزء تاریخ بن گیا ہے تو ان لوگوں کی بات کا کیا اعتبار رہ گیا جو قدم قدم پر پیغمبرؐ پر اعتراض کرتے رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ امام حسنؑ کا کام عوامی جذبات کے خلاف تھا مگر مسئلہ جذبات کا نہیں تھا۔ مسئلہ مصلحت دین اور قانونِ پروردگار کا تھا۔ اگر رضائے الٰہی اسی میں ہے کہ تخت پر وہ بیٹھ جائے تو بیٹھ جائے اگر رضائے الٰہی اسی میں ہے کہ مصیبتیں ہم برداشت کر لیں تو ہم مصیبتیں برداشت کر لیں گے اس لئے کہ مذہب میں کسی کے جذبات کا کوئی دخل نہیں ہے۔ مذہب قانون پروردگار کی پابندی کا نام ہے۔ لہٰذا

آلِ محمدؐ کا یہی شعار اور یہی طریقہ کار رہا ہے کہ کوئی قدم بھی راہ رضائے پروردگار سے ہٹنے نہ پایا۔ بس میں اپنے سلسلۂ بیان کو اس منزل پر لے آیا جہاں جذبات آپ سے اور ہم سے لاکھ گنا زیادہ ہیں مگر فرق یہ ہے کہ ہمارے پاس ادنیٰ جذبات ہیں تو ہم قابو حاصل کرنا نہیں جانتے ہیں ان کے پاس ہم سے کروڑوں گنا زیادہ جذبات محبت پائے جاتے تھے مگر جیسے جذبات تھے ویسے ہی قوت برداشت بھی تھی۔ وہ جذبات پر قابو حاصل کرنا بھی جانتے تھے تاکہ دنیا یہ پہچان لے کہ قانونِ الٰہی سے بالاتر کوئی چیز نہیں ہے ورنہ کون ایسا انسان ہے جس کے پاس جذبات نہیں ہیں اور اسی فرق کو مورخین نے نہیں پہچانا اور خاصانِ خدا کی تاریخ کو اپنی تاریخ پر قیاس کرنا شروع کر دیا اور بے شمار غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ یہ استقبالِ عزا کی مجلس ہے لہٰذا محرم سے قبل کے واقعات کی طرف آپ کو لے جانا چاہتا ہوں تاکہ آپ بھی وہاں پہچانیں کہ اللہ کے بندے کیسے اپنے جذبات پر قابو حاصل کرتے ہیں اور جن لوگوں نے ان کے کردار کو نہیں پہچانا ہے وہ کیسے ان کی زندگی اور ان کے کردار کو جذبات کے سانچے میں ڈھال دینا چاہتے ہیں۔

دو روایتیں مورخین اسلام نے بنائی ہیں اور دونوں میں صاحبانِ کردار کے کردار کو نہیں پہچانا ہے۔ ایک روایت یہ تیار ہوئی کہ جب امام حسینؑ نے جناب مسلمؑ کو بھیجا اور اس اہتمام کے ساتھ بھیجا کہ "انی باعث الیکم اخی وابن عمی وثقتی مسلم بن عقیل" کوفہ والو! میں اسے بھیج رہا ہوں جو میرا بھائی ہے، میرے چچا کا بیٹا ہے اور میرا معتمد علیہ ہے جس کا نام ہے مسلم بن عقیل۔ امام حسینؑ نے مسلمؑ کو بھیج دیا۔ مورخ کہتا ہے کہ مسلمؑ چلے اور جو آدمی اپنے ساتھ لے کر چلے تھے راستہ بتانے کے لئے۔ راستہ میں ان کا انتقال ہو گیا تو مسلمؑ نے ایک مقام پر ٹھہر کر امام حسینؑ کو خط لکھا کہ میرے ساتھ جو لوگ جا رہے تھے وہ سب دنیا سے رخصت ہو گئے اس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سفر مبارک نہیں ہے۔ لہٰذا حضور اگر آپ مجھے معاف کر دیں تو میں واپس چلا آؤں۔

یہ مورخ بیچارہ کون ہے؟۔ یہ وہی ہے جس نے اپنے جیسے مسلمان دیکھے ہیں اور انھیں مسلمانوں پر مسلمؑ کا بھی قیاس کر لیا ہے۔ حالانکہ مسئلہ صرف بزدلی اور ہمت کا نہیں ہے،

مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کے اعتبار سے شریعت اسلام میں فال نیک کی جگہ تو ہے لیکن فال بد کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ اسلام میں اصلاً جائز ہی نہیں ہے۔ آپ اچھے حالات کو دیکھ کر اچھے مستقبل کا اندازہ کرلیں اس کی اجازت تو اسلام نے دی ہے۔ لیکن بُرے حالات کو دیکھ کر سوچیں کہ انجام بُرا ہوگا اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی ہے۔

سرکار دو عالمؐ جب خود ہجرت کر کے چلے مکہ سے مدینہ کی طرف تو راستہ میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ حضور نے پوچھا بھائی تمھارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا سالم۔ فرمایا "لَقَدْ سَلِمْنَا" یعنی ہماری اس راہ میں سلامتی ہے۔ لفظ سالم سے حضورؐ نے سلامتی کی طرف اشارہ فرمایا۔ اس کے بعد آگے بڑھے۔ ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ بھائی تمھارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا ناصر۔ فرمایا "لَقَدْ نُصِرْنَا" ہماری نصرت کا بھی انتظام ہوگیا۔ یعنی اچھے اثرات کو دیکھ کر اچھے حالات کا اندازہ کرنا، یہ اسلام میں جائز ہے۔ لیکن بلّی نے راستہ کاٹ دیا یا سامنے سے کوئی خالی گھڑا لے کر گذر گیا یا گھر سے نکلے اور کوئی عورت سامنے آگئی اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی خطرہ ہے۔ اسلام نے اسی کو ناجائز قرار دیا ہے۔ اب یہ مسلمان معاشرہ کی بدقسمتی ہے کہ جو جائز تھا وہ کہیں نہیں رہ گیا اور جس کو اسلام نے ناجائز قرار دیا تھا اس کے ماننے والے ہر گھر میں مل جائیں گے۔ خاص طریقہ سے صنف خواتین میں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مذہب انھیں کے دم سے قائم ہے۔ سچ ہے یہ بلّیوں کا روگ، یہ خالی برتن کا مذہب، یہ کسی کے راستہ کاٹ دینے کا قانون یہ انھیں کے دم سے قائم ہے ورنہ بچّوں کو خبر بھی نہ ہوتی کہ ایسا بھی کچھ ہوتا ہے اور یہ آج کی بات نہیں ہے اور صرف ہندوستان و پاکستان کی بیماری نہیں ہے یہ دور قدیم کی بیماری ہے ہمیشہ سے رہی ہے۔ میں نے ایک روایت میں دیکھا کہ معصومؑ سے کسی نے آکر پوچھا کہ اگر ہم گھر سے باہر نکلے اور بلّی نے راستہ کاٹ دیا تو کیا کریں؟ فرمایا کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے اس نے تمھارا راستہ کاٹ دیا ہے تم اس کا راستہ کاٹ دو۔ ارے ہاں بلّی بیچاری کوئی مزدور تو ہے نہیں کہ وہ کدال لے کر آئی اور اس نے راستہ کھود دیا ہے کہ اب آپ آگے بڑھیں گے تو کیسے بڑھیں؟ کاٹ دیا

کے صرف یہ معنی ہیں کہ آپ یوں جا رہے تھے وہ یوں گذر گئی تو اگر اس کے یوں گذر جانے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے آپ کا راستہ کاٹ دیا تو گویا اس کا راستہ ہے داہنے سے بائیں۔ اب آپ سیدھے چلے جائیے تو اس کا راستہ کٹ جائے گا۔ اگر انسان اتنا کمزور ہو گیا کہ بلی انسان کا راستہ کاٹ سکتی ہے اور انسان میں اتنا دم نہیں ہے کہ بلی کا راستہ کاٹ سکے۔ تو یہ انسان دنیا میں کیا کرے گا؟ اب میں نہیں جانتا کہ بلیوں کو اتنی اہمیت کس گھرانے سے حاصل ہو گئی ہے اور کون ان کا باپ تھا جس کی وراثت میں یہ عظمت حاصل ہو گئی ہے۔

تو میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ اس غریب مورخ کو یہی نہیں معلوم کہ مسلم، مسلم ہیں۔ مسلم قانون الٰہی جانتے ہیں اور ایسی غلط اور ایسے ہی مہملات کو واضح کرنے کے لئے امام حسینؑ نے پہلے دن فرما دیا تھا "ثِقَتِیْ" اسے بھیج رہا ہوں جو میرا معتمد علیہ ہے۔ اس کا کوئی عمل خلاف شریعت ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میرے اعتماد کو ٹھیس لگ گئی ہے۔ میں کسی ایسے پر اعتماد نہیں کر سکتا جو قانون خدا کا پابند نہ ہو۔ جب میں نے کہہ دیا کہ میرا معتمد ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کوئی عمل قانونِ خدا کے خلاف نہیں کر سکتا ہے۔ یہ ایک روایت تھی جو ابن زیاد کی حمایت میں جناب مسلم کے کردار کو کمزور بنانے کے لئے تیار کی گئی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ امام حسینؑ ایک منزل پر ٹھہرے ہوئے تھے جب یہ خبر آئی کہ جناب مسلم کوفہ میں شہید کر دیے گئے ہیں تو امام حسینؑ نے اپنے چاہنے والوں کے سامنے یہ خبر بیان کی کہ جس کو میں نے اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا، کوفہ والوں نے غداری کر کے اسے شہید کر دیا۔ ابھی آنے والے مسافروں نے یہ خبر سنائی ہے تو اب بتاؤ تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟ مورخ نے روایت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ اولاد عقیل کو جلال آگیا اور کہنے لگے کہ اب تو ہم کوفہ ہی جائیں گے اور جب تک مسلم کا بدلہ نہیں لے لیں گے اس وقت تک ہم کو سکون نہیں مل سکتا ہے۔ یعنی سارے جہاد امام حسینؑ کو انتقام خون مسلم کا رنگ دے دیا گیا اور اس کے بعد ایک فقرہ اور جوڑ دیا گیا کہ جب ان لوگوں نے یہ کہا کہ جب تک

ہم بدلہ خون مسلم کا نہ لے لیں گے واپس نہ جائیں گے۔ تو امام حسینؑ نے فرمایا کہ خدا تم کو جزائے خیر دے۔ اچھا تم نے ایسا سوچا ہے تو ہم بھی ساتھ چلیں گے اور چل کے مسلم کے خون کا بدلہ لیں گے۔ گویا امام حسینؑ کوفہ میں وارد ہو رہے ہیں انتقام خون مسلم کے لئے۔ نہ حق کہیں رہ گیا ہے نہ باطل کہیں رہ گیا۔ نہ اسلام کہیں رہ گیا نہ کفر کہیں رہ گیا۔ جب کہ حسن اتفاق سے امام حسینؑ کوفہ گئے بھی نہیں۔ کہ اگر واقعاً اولاد عقیل نے یہ بات کہی تھی کہ ہم جائیں گے اور جا کر خون مسلم کا بدلہ لیں گے تو بدلہ کہاں لیں گے؟ بدلہ تو کوفہ میں لیا جائے گا جہاں والوں نے جناب مسلم کو مارا ہے۔ امام حسینؑ تو کوفہ گئے بھی نہیں ہیں بلکہ جب درمیانِ راہ حُرؑ کا رسالہ حائل ہو گیا ہے تو جو منزل روزِ اوّل سے معین تھی امام حسینؑ کا قافلہ اسی منزل پر پہونچ گیا۔ تو نہ جناب مسلم کے کردار میں کوئی کمزوری ہے اور نہ مسلم کے خاندان کے کردار میں کوئی کمزوری ہے کہ وہ صرف انتقام کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ یہ ساری باتیں انھیں لوگوں نے تیار کی ہیں جو کردار امام یا کردار اصحاب امام کو کمزور کرنا چاہتے ہیں اور ان کے سوچنے کا طریقہ وہی ہے جو اپنی زندگی کا انداز ہے۔ وہ نہیں جانتے ہیں کہ انصار حسینی کی زندگی الگ ہے۔ خانوادۂ آل محمدؐ کے کردار کو اس دنیا کے باقی انسانوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اب اگر انھیں پہچاننا چاہتے ہیں کہ واقعاً ان کی زندگیاں کیا ہیں، تو نہ ان میں پست ہمتی پائی جاتی ہے کہ دو آدمی مر جائیں تو سفر ملتوی کر دیا جائے۔ جس کی جرأت و ہمّت کا یہ عالم ہو کہ سر سے پیر تک زخموں سے چوُر ہے اور چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے۔ لڑنے والے بھی کوفہ کی گلیوں میں ہیں کہ اگر مقابلہ میں فوجیں سامنے آتیں، تلواریں چلتیں، ہتھیاروں کا مقابلہ ہوتا، طاقتوں کا مقابلہ ہوتا، زور بازو کا مقابلہ ہوتا تو معلوم ہوتا کہ بنی ہاشم کا شیر کیسا ہوتا ہے۔ لیکن ارباب عزا ایک عقیل کا لال اور پانچ سَو کا لشکر سامنے ہے جو جناب مسلم سے جنگ کر رہا ہے۔ تلواریں ہیں، نیزے ہیں، خنجر ہیں اور پشت بام پر عورتیں ہیں۔ ان میں سے کوئی پتھر مار رہا ہے، کوئی آگ پھینک رہا ہے اور ایک مسلم ہیں جو اتنی مصیبتوں کا بیک وقت مقابلہ کر رہے ہیں۔ مگر نہ کہیں

ہمت میں کوئی فرق ہے نہ جرأت و شجاعت میں کوئی فرق ہے۔ حد یہ ہے کہ جب ظالموں نے محسوس کر لیا کہ اتنے حملوں کے بعد بھی مسلم کو گرفتار نہیں کیا جاسکتا ہے اور عقیل کا شیر اسی شان سے آگے بڑھتا چلا آرہا ہے تو بالآخر راستہ میں ایک گڈھا کھودا گیا اور مکر و حیلہ سے اسے بند کر دیا۔ جب جناب مسلم اس گڑھے میں گر گئے تو چاروں طرف سے حملے شروع ہو گئے۔ اِدھر سے پتھر اُدھر سے آگ، درمیان میں جناب مسلم۔ کوئی تلوار مار رہا ہے۔ کوئی نیزہ چبھو رہا ہے۔ لیکن اتنے زخم کھانے کے بعد بھی جرأت و ہمت کا یہ عالم ہے کہ جب ظالم کے سامنے لاکر کھڑے کئے گئے تو اطمینان کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ کسی نے کہا تم نے امیر کو سلام نہیں کیا۔ فرمایا کیا میں اس کو اس قابل سمجھتا ہوں کہ سلام کروں (اَجْرُکُمْ عَلَی اللّٰہِ) خدا آپ کو کسی غم میں نہ رُلائے سوائے غم آل محمدؐ کے۔ یہ وہ قربانی ہے جو راہِ حق میں کربلا سے پہلے دی گئی ہے مگر راہِ کربلا میں حسینؑ بن علیؑ کی یہ پہلی قربانی ہے۔ اب آئیے دیکھیں کہ بندہ رضائے خدا کا کیسا پابند ہوتا ہے۔ اتنا جہاد کیا رضائے خدا کے واسطے، اتنے زخم کھائے مرضی الٰہی کے واسطے، ساری مصیبتیں برداشت کیں ایک پروردگار کو راضی رکھنے کے لئے۔ اب اس کے بعد آخری مرحلہ آیا ہے دیکھیں زندگی کا خاتمہ کس طرح ہوتا ہے۔ ظالم نے کہا کہ انھیں پشت بام پر لے جاؤ اور ان کا گلا کاٹ دو اور لاش کو پشت بام سے نیچے پھینک دو۔ مسلم کو کوئی پرواہ نہیں ہے۔ ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ پشت بام پر لائے گئے۔ جلّاد کی تلوار چلنے والی ہے اور لاش کوفہ کی گلیوں میں کھینچی جانے والی ہے۔ مگر آخری لمحہ میں بھی مسلم نے کہا کہ اتنی مہلت دے دو کہ دو رکعت نماز پڑھ لوں تاکہ دنیا یہ تو یاد رکھے کہ اتنی مصیبتیں برداشت کیں فقط ایک بندگی کی راہ میں۔ مہلت ملی۔ مسلم نے نماز ادا کی۔ دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد رُخ کیا اُدھر، جدھر سے امام حسینؑ آ رہے تھے۔ آواز دی اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا اَبَا عَبْدِ اللّٰہِ! مولا چاہنے والا دنیا سے جا رہا ہے۔ آقا غلام کا آخری سلام لے لیجئے۔ اس کے بعد تلوار ظالم کی چل گئی، سر و تن میں جُدائی ہو گئی۔ لاش کو پشت بام سے نیچے پھینک دیا گیا۔ پیروں میں رسّی باندھی گئی اور اب کوفہ کی گلیاں ہیں جہاں مسلم کی لاش کو کھینچا جا رہا ہے۔ میں کہوں گا مسلم اگر آج تمھاری لاش کو کھینچا جا رہا ہے تو تم نے مولا کی غلامی کا حق ادا کر دیا۔ کل علیؑ کے گلے میں

رسّی تھی اور انھیں کھینچا جارہا تھا اور آج تمھاری لاش کو کھینچا جارہا ہے اور اگر آج چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہیں تو تم نے سفارت کا حق ادا کر دیا کہ کل جب زہراؑ کا لال اکیلا رہ جائے گا تو چاروں طرف سے حسینؑ پر حملے ہوں گے۔ مسلمؑ اگر آج ایک گھونٹ پانی نہ پی سکے تو تم نے محبت حسینؑ کا حق ادا کر دیا۔ مولا کو بھی وقت آخر پانی نہ ملے گا۔ اگر آج تم پر کوفہ کی گلیوں میں آگ پھینکی گئی تو تم نے بنی ہاشم کے گھرانے کا حق ادا کر دیا کہ کل ہاشمی گھرانے کے خیموں میں چاروں طرف سے آگ لگی ہوگی اور سیدانیاں ایک خیمہ سے دوسرے خیمہ میں جارہی ہوں گی اور جب سارے خیمے جل جائیں گے تو خیمے سے یوں باہر نکلیں گی کہ سر کے بال بکھرے ہوئے، منھ پر طمانچے مارتی ہوئی۔ وامحمداہ۔ وا علیاہ۔ واحسیناہ۔

سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ۔

پہلی مجلس

علم امام حسین علیہ السّلام

"حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ پروردگار اسے دوست رکھے جو میرے حسینؑ سے محبّت کرے۔"

سنہ ۱۴۱۸ ہجری کے آغاز کے ساتھ عشرۂ محرم الحرام کی جن مجالس کا آج آغاز ہو رہا ہے ان مجالس کے لئے عنوان کلام وہی ہے جو سال گذشتہ تھا۔ یعنی عرفان امام حسین علیہ السّلام۔ سال گذشتہ میں نے یہ گذارش کی تھی کہ۔ کسی انسان کی معرفت کے لئے دو۲ راستے ہوتے ہیں: ایک راستہ اس کی شخصیت کا ہے اور ایک راستہ اس کے کردار اور کارناموں کا ہے۔ سال گذشتہ میں نے جو باتیں آپ کے سامنے گذارش کیں ان کا تعلق تھا شخصیت امام حسین علیہ السلام سے قرآن مجید کی روشنی میں، سرکار دو عالمؐ کے ارشادات کی روشنی میں، صحابۂ کرام کے اعترافات کی روشنی میں اور دنیائے اسلام کے مورخین کے بیانات کی روشنی میں۔ آج جو سلسلۂ کلام شروع ہو رہا ہے اس کا تعلق امام حسینؑ کے کردار اور آپ کے کارناموں سے ہے، تاکہ میرے سننے والے یہ محسوس کرسکیں کہ ساری دنیا میں جس مظلوم کی صف عزا بچھائی جاتی ہے اس کا قیاس دنیا کے عام انسانوں پر نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اکثر لوگ اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ دنیا میں اتنے بڑے بڑے لوگ زندگیاں گذار کر چلے گئے اور کتنے ایسے ہیں جو مختلف راہوں میں مارے

گئے، قتل کئے گئے اور کتنے ایسے ہیں جو مقدس مقامات پر مارے گئے لیکن ان کا تذکرہ چند دنوں سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ آخر ایک ذکر امام حسینؑ میں کیا خصوصیت پائی جاتی ہے جو اس تذکرے کو ساری دنیا میں دُہرایا جاتا ہے اور ہر سال دُہرایا جاتا ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں کچھ گذارش نہیں کرنا ہے صرف اتنی ہی سی بات کہنا ہے کہ اگر امام حسینؑ کے علاوہ دنیائے اسلام یا دنیائے غیر اسلام میں کوئی شخصیت ایسی ہے کہ جس کے ذکر کو اتنا دوام حاصل ہو سکتا ہے اور جس کا تذکرہ ساری دنیا میں ہر سال کیا جا سکتا ہے تو کب اس قوم سے امام حسینؑ نے مطالبہ کیا تھا اور کب دوسرے افراد کو شخصیتوں نے روکا ہے۔ جن کا خیال یہ ہے کہ یہ شخصیتیں امام حسینؑ جیسی یا امام سے بالاتر ہیں۔ انھیں ان شخصیتوں کی یاد منانے سے کس نے منع کیا ہے، کس نے روکا ہے، ان کے چاہنے والوں کے پاس اقتدار بھی ہے، ان کے چاہنے والوں کے پاس دولت بھی ہے، ان کے چاہنے والوں کے پاس دنیا کے سارے وسائل اِعلام واِبلاغ بھی ہیں کس نے منع کیا ہے، نہ جانے والا کوئی وصیت کر گیا ہے کہ میرا ذکر نہ ہونے پائے۔ نہ رہنے والوں میں کوئی روکنے والا اور منع کرنیوالا ہے۔ اگر یہی خیال ہے کہ ایک ہی ذکر کیوں ہوتا ہے باقی تذکرے بھی ہونا چاہئیں تو ایک ذکر ہمارے حصّہ میں آیا ہے باقی ذکر آپ کے حصّہ میں آئے ہیں۔ نہ آپ ہمیں منع کریں نہ ہم آپ سے کچھ گذارش کریں گے۔ دونوں میدانِ عمل میں قدم رکھیں اس کے بعد خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ کس ذکر میں باقی رہنے کی صلاحیت ہے اور کس ذکر میں بقا کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ جس ذکر میں باقی رہنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے وہ ذکر باقی نہیں رہتا ہے ذکر کرنے والوں سے۔ اس ذکر میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ ذکر کرنے والوں کو باقی رکھتا ہے۔ مٹ گئے وہ لوگ جن کے تذکرے ذکر کرنیوالوں سے زندہ تھے اور رہ گئے وہ مظلومین جن کے تذکروں نے اپنے ذکر کرنے والوں کو زندہ رکھا ہے۔

حسینؑ نہ کسی کے محتاج تھے اور نہ کسی کے محتاج ہیں۔ حسینؑ کل دین کو زندگی

دے رہے تھے آج دین والوں کو زندگی دے رہے ہیں۔ یہ بقایہ دوام اگر قوموں کو حاصل ہوا ہے تو یہ ذکر حسینؑ ابن علیؑ کا صدقہ ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں نہ کوئی سوال کرنے کی گنجائش ہے اور نہ کسی اعتراض کے اٹھانے کی گنجائش ہے، فقط اتنا پہچان لینا کافی ہے کہ وہ صاحب کردار کون تھا جس کا ذکر ساری دنیا میں ہو رہا ہے اور باقی افراد میں وہ کیا کمی پائی جاتی تھی جس کے بنا پر کوشش کرنے کے بعد بھی ان کے تذکرہ کو دوام حاصل نہ ہو سکا۔

میں اس سلسلۂ بیان کا آغاز اوصاف و کمالات کی دنیا میں سب سے پہلے تذکرۂ علم سرکار سید الشہداءؑ سے کرنا چاہتا ہوں اس لئے کہ ہماری تاریخ مذہب میں کمالات کا آغاز ہی ہوا ہے علم سے۔ اور سب سے پہلے اللہ والوں کے جن کمالات کو پہچانا گیا ہے وہ کمال علم ہی تھا۔ اللہ والوں کے کردار میں ان کی شانِ بندگی میں کوئی کمی نہیں تھی، کوئی نقص نہیں تھا مگر پروردگار عالم نے اپنے منتخب بندوں کے کردار میں جس صفت کو اولیت کا شرف دیا اور جس صفت کے ذریعہ ان کی عظمتوں کو پہچنوایا ہے ان صفات میں سرفہرست تذکرہ ہے علم کا۔ وہ سب سے پہلا انسان جس کو پروردگار عالم نے اس روئے زمین پر اپنا خلیفہ و جانشین بنا کر بھیجا اس کے کمال کا بھی اعلان کیا تو اسی علم کی بنیاد پر۔ ملائکہ جاہل نہیں تھے، ناواقف نہیں تھے، وہ اپنے پاس سے تو علم لے کر نہیں آئے تھے وہ بھی صاحبانِ علم تھے انھیں بھی پروردگار ہی نے علم دیا تھا اور جناب آدمؑ کو بھی اللہ ہی نے دولت علم سے نوازا تھا ـــــ مگر جس کو جانشین اور اپنا خلیفہ بنانا تھا اُسے بہرحال اتنا علم اور اتنا کمال دینا ہوگا جس کی بنیاد پر کوئی انسان خلافت الٰہیہ کا اہل ہو سکے۔ مالک نے جناب آدمؑ کو تمام اسماء کا علم دے کر اس دنیا میں بھیجا تاکہ دنیا کو یہ اندازہ ہو جائے کہ جس کو خدا اپنا جانشین بناتا ہے اس کے بارے میں اس بات کا انتظار نہیں کرتا کہ وہ دنیا میں جا کے کچھ سیکھ لے، دنیا میں جا کے کوئی کمال پیدا کر لے، وہ اپنے نمائندہ کو صاحب کمال بنا کر بھیجتا ہے اور شائد اک رازِ قدرت یہ بھی رہا ہو کہ آدمؑ کو نہ ماں کے ذریعہ بھیجا نہ باپ کے ذریعہ بھیجا اور صاحبِ کمال بنا کر بھیجا تاکہ اتنا تو معلوم ہو جائے کہ خلیفۂ الٰہی کو کمال دینے والا

کوئی ہے ہی نہیں۔ کمال لیں گے تو کس سے لیں گے، یعنی خلیفۃ اللہ اگر اس دنیا میں سیکھنا چاہے تو آدمؑ کس سے سیکھیں گے؟ کون ہے؟ نہ باپ ہے کہ جس کے ذریعہ تربیت کی جائے نہ ماں ہے کہ جس کے ذریعہ سے کمالات دیئے جائیں۔ اگر جناب آدمؑ کے پاس کوئی بھی کمال ہے تو وہ کمال نہ باپ کا طفیل ہے نہ ماں کا صدقہ ہے، نہ کوئی معاشرہ ہے نہ کوئی ماحول ہے۔ لے دے کے آسمان پر فرشتے ہیں تو فرشتے خود ہی اقرار کر رہے ہیں لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا پروردگار ہمارے پاس تو اتنا ہی ہے جتنا تو نے عنایت فرمایا ہے۔ تو آدمؑ کے پاس جو کمالِ علم ہے وہ پروردگار ہی کا دیا ہے ماحول کی دین نہیں ہے۔ میں ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں آپ اسے پہچانیں۔ یعنی پہلے دن جب پروردگار نے جناب آدمؑ کو خلیفۂ الٰہی بنا کر اس زمین پر بھیجا تو اتنا باکمال بنا کر بھیجا کہ جس کے بارے میں خود قرآن مجید کا اعلان ہے عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا اللہ نے آدمؑ کو تمام اسمار کا علم دے کر بھیجا، باکمال بنا کر بھیجا اور دنیا میں پہلے کوئی ایسا نہیں رکھا جس سے آدمؑ کمال حاصل کر سکیں، جس سے جناب آدمؑ علم لے سکیں۔ تو قدرت کا اک انتظام یہ بھی ہوتا ہے کہ پروردگار اپنے جانشین کو جب باکمال بنا کر بھیجتا ہے تو ایسے ماحول میں بھیجتا ہے کہ جہاں کوئی کمال دینے والا نہ ہو۔ تاکہ دنیا کو یہ اندازہ ہو جائے یہ کمال لے کر آیا ہے اس نے کمال یہاں آکر لیا نہیں ہے۔ تو آدمؑ کو اُس دنیا میں بھیجا کہ جہاں نہ کوئی بشر تھا نہ کوئی معلم تھا نہ کوئی انسان تھا نہ کوئی باپ تھا نہ کوئی ماں تھی نہ کوئی معاشرہ تھا نہ کوئی مدرسہ تھا، جتنا جو کچھ بھی آدمؑ کے پاس ہے سب وہیں کا دیا ہوا اور وہیں سے لے کر آئے ہیں۔ یہ پہلا انتظام قدرت تھا اور آخر میں پروردگار نے جب دوسرا سلسلۂ خلافت شروع کیا تو وہاں بھی صاحب کمال کو بھیجا تو ایسی جگہ پر بھیجا جہاں نہ کوئی پڑھانے والا تھا نہ کوئی سکھانے والا تھا، نہ کوئی بتانے والا تھا اور جیسے ہی اس گھر سے باہر آیا آغوشِ پیغمبرؐ میں آتے ہی پڑھنا شروع کر دیا۔ تاکہ دنیا محسوس کر لے کہ اس سلسلہ کا پہلا آیا تھا تو وہ بھی اپنا علم لے کر آیا تھا اِس نئے سلسلے کا پہلا آیا ہے تو یہ بھی اپنا علم لے کر آیا ہے، اب جسے بھی خلافت الٰہیہ کا دعویٰ ہو پہلے ایسا صاحبِ کمال بنے اس کے بعد خلافت الٰہی کا دعویٰ کرے۔ صلوات

اس مقام پر ضمناً ایک جملہ ربط کلام کے لئے گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ملائکہ کو بھی پروردگار عالم نے علم دیا تھا جو اکثر کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ کون سا امتحان ہے، یہ کیسی آزمائش ہے، ایک کو پڑھا دیا ایک کو نہیں پڑھایا۔ ملائکہ تو خود ہی کہتے ہیں اِلاَّ مَا عَلَّمْتَنَا پروردگار ہمارے پاس وہی علم ہے جو تو نے ہم کو دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے ملائکہ کو تعلیم دی ہے، خدا نے ملائکہ کو علم دیا ہے ایسا نہیں ہے کہ ایک کو بتایا اور ایک کو نہیں بتایا اور دونوں کو منزلِ امتحان میں لاکر کھڑا کر دیا۔ لیکن جناب آدمؑ کے اور ملائکہ کے علم میں جو فرق پایا جاتا ہے۔ میں اپنے عزیز بچّوں اور نوجوانوں کو سمجھانے کے لئے ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں اور انشاء اللہ آپ اس حقیقت کو بہ آسانی پہچان لیں گے اور شائد اس مثال سے بات واضح بھی ہو جائے اور یاد بھی رہ جائے۔ ایک آدمی سے آپ کی ملاقات ہوئی، آپ نے اس کی خیریت دریافت کی، آپ کیسے ہیں، گھر والے کیسے ہیں ماشاء اللہ۔ پروردگار عالم نے کتنی اولاد سے آپ کو نوازا ہے۔ آپ نے کہا ہمارے چار بیٹے ہیں۔ پوچھا ان کے نام کیا ہیں؟ آپ نے چاروں کے نام بتا دیئے ——— یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان کے چار بیٹے ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ چاروں کے نام کیا ہیں۔ چند دنوں کے بعد ان میں سے ایک بیٹا آپ کے سامنے آگیا اور جس سے آپ نے ملاقات کر کے دریافت کیا تھا انھوں نے تعارف بھی کرا دیا یہ میرا بیٹا ہے۔ آپ بتا سکتے ہیں اس کا نام کیا ہے؟ ——— آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے چار بیٹے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ چاروں کے نام کیا کیا ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک کو لاکر کھڑا کر دیا تو کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ان میں سے چاروں کے نام کیا ہیں نہیں جانتے۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرا بیٹا آیا کہا بتائیے اس کا نام کیا ہے؟ کہا نہیں معلوم۔ تیسرا بیٹا آیا اس کا نام کیا ہے؟ کہا اس کا نام بھی نہیں معلوم ہے۔ چوتھا بیٹا آیا اس کا نام کیا ہے؟ کہا وہ بھی نہیں معلوم ہے۔ چاروں بیٹے بھی معلوم ہیں چاروں نام بھی معلوم ہیں۔ تو کمزوری کیا رہ گئی کہ آپ بتا نہیں پا رہے ہیں کہ ان میں کس کا نام کیا ہے۔ نہ ناموں سے بے خبر نہ بیٹوں سے بے خبر۔ چار بیٹے ہیں یہ بھی معلوم ہے چار نام ہیں، یہ بھی معلوم ہے کمی کہاں رہ گئی۔

توجہ کریں، نہ شخصیتوں کے علم میں کوئی کمی ہے، نہ ناموں کے علم میں کوئی کمی پائی جاتی۔ فقط ایک مسئلہ نازک سا رہ گیا ہے کہ فقط چار بیٹے چار نام مگر کس کا کون سا نام ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک علم وہ ہوتا ہے جو بعنوان عام حاصل ہوتا ہے۔ بعنوان کُلّی چار بیٹے چار نام۔ لیکن جب چار نام آپ کو معلوم ہیں اور بیٹا آ کے سامنے کھڑا ہو جائے تو جب تک باپ یہ نہ کہے گا کہ میرا بیٹا ہے اس وقت تک یہ نہ معلوم ہو سکے گا کہ یہ بیٹا ہے اور جب بتا دیا یہ بیٹا ہے تو جب تک نام نہ بتائے گا یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ ان کا نام کیا ہے۔ تو بعنوان عام یہ بھی معلوم ہے کہ بیٹے چار ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ نام چار ہیں مگر کس نام کا مصداق کون سا بیٹا ہے اور کس بیٹے کا نام کیا ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جو یہ بتانے کے بعد بھی معلوم نہ ہو سکا۔ میں نے ایک لفظ کہا ہے غور فرما رہے ہیں؟۔ بتانے کے بعد بھی یہ نہ معلوم ہو سکا۔ پروردگار عالم نے کہا ہم نے آدمؑ کو تمام اسماء بتا دیئے، سارے نام بتا دیئے، اب اس کے بعد کوئی کہے خدا نے سب بتا ہی دیا تو آدمؑ کا کمال کیا تھا۔ مگر خدا نے نام کہاں پوچھے تھے ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ آدمؑ کو نام بتائے پھر اسکے بعد خدا نے ان سب کو ان ملائکہ کے سامنے پیش کیا اور اس کے بعد کہا اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ ان کے نام بتاؤ۔ توجہ کریں قرآن مجید کیا کہتا ہے۔ خدا نے کہا اِن کے نام بتاؤ۔ نام نہیں پوچھے ہیں اِن کے نام۔ یعنی مسئلہ وہ آ گیا ہے کہ شخصیت سامنے ہے نام معلوم ہے۔ لیکن یہ کون بتائے کہ اس شخصیت کا نام کیا ہے۔ یہ کون بتائے کہ وہ نام کس کے لئے ہے، اِن کے لئے ہے یا اُن کے لئے ہے۔ یہی وہ مرحلہ تھا جو پروردگار عالم منزلِ امتحان میں رکھنا چاہتا تھا۔ اگر نام بتا دیئے تو اب سوال ناموں کا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان کے نام کیا ہیں۔ یہی وہ منزل تھی جہاں ملک خاموش رہ گیا اور جناب آدم امتحان علم میں کامیاب ہو گئے۔ پروردگار عالم نے انکی خلافت الٰہیہ کا اعلان کر دیا لیکن یہ بات تو آپ کے ذہن میں ہے ______ کہ آخر جناب آدمؑ نے شخصیت کو دیکھ کے یہ پہچانا کیسے کہ ان کا نام کیا ہے۔ ٹھیک ہیں خلیفۃ اللہ ہیں، صاحب صلاحیت ہیں، پروردگار نے ذہانت دی ہے، فراست دی ہے، کمال عطا کیا

ہے۔ لیکن اس نکتہ کی طرف آپ توجہ فرمائیں۔ شائد اگر میرے بچوں نے کبھی غور نہ کیا ہو تو آج غور کریں کہ آخر ان دونوں میں مناسبت کیا ہے کہ نام خدا نے بتا دیئے شخصیتوں کو سامنے لا کے کھڑا کر دیا کہا بتاؤ ان کے نام کیا ہیں، ملائکہ نہیں بتا سکے، آدمؑ نے بتا دیا وہ میدانِ امتحان میں پیچھے رہ گئے اور جناب آدمؑ میدانِ امتحان میں آگے بڑھ گئے مگر جناب آدمؑ سے بتا کس نے دیا کہ ان کا نام کیا ہے۔ میں پھر پلٹ کر اپنی مثال پر آتا ہوں مجھے معلوم ہے کہ ان کے چاروں بیٹوں کے نام کیا ہیں، مجھے یہ معلوم ہے کہ ان کے چار بیٹے ہیں دونوں باتیں معلوم ہیں۔ مگر بیٹا جب سامنے آیا تو نہیں معلوم کہ اِس بیٹے کا نام کیا ہے، نہیں معلوم کہ اُس بیٹے کا نام کیا ہے۔ چاروں بیٹے سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور چاروں نام ذہن کے اندر محفوظ ہیں، مگر ہم نہ بتا سکے کہ کس بیٹے کا نام کیا ہے۔ کیوں۔ کیوں نہ بتا سکے یہ ہمارے علم کی کمزوری نہیں ہے۔ یہ آپ کے نام رکھنے کی کمزوری ہے۔ میں نے ایک بات کہی ہے اگر آپ توجہ فرمائیں۔ یہ ہمارے آپ کے نام رکھنے کی کمزوری ہے یہ ہمارے علم کی کمزوری نہیں ہے۔ ہم لاکھ ذہین ہوں، کتنے ہی ہوشیار ہوں مگر مسئلہ تو آپ کے ذوق کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ نے ایک بیٹے کا نام رکھ دیا عالم۔ جب کہ بالکل جاہل تھا۔ ایک بیٹے کا نام رکھ دیا یوسف جب کہ اس میں کوئی حُسن نہیں تھا۔ ایک بیٹے کا نام رکھ دیا فاضل جب کہ اس میں کوئی فضل نہیں تھا۔ ایک بیٹے کا نام رکھ دیا قادر جب کہ انتہائی عاجز تھا۔ تو چونکہ ہمارے یہاں شخصیت اور نام میں کوئی رابطہ نہیں ہوتا اس لئے ہم کمال علم رکھنے کے بعد بھی منطبق نہیں کر پاتے ہیں۔ پروردگار نے جن شخصیتوں کو آدمؑ کے سامنے پیش کیا اور جن کے نام خدا نے پہلے بتائے رکھے تھے اگر ان دونوں میں کوئی رابطہ نہ ہوتا تو مسئلہ مشکل ہو جاتا۔ مگر قدرت نے روزِ اوّل یہ انتظام کیا کہ جس کا نام محمدؐ رکھا اس کو محمدؐ بنایا۔ جس کا نام علیؑ رکھا اس کو بلند بنایا۔ جس کا نام حسنؑ و حسینؑ رکھا اس کو صاحبِ حُسن بنایا۔ تو چونکہ نام اور کردار میں مناسبت موجود ہے لہٰذا آدم کی ذہانت کے لئے فیصلہ کر لینا مشکل نہیں ہے صلوات اسی لئے اگر آپ انوار الہیہ پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ پروردگار عالم نے

عالم انوار سے جن شخصیتوں کو اس دنیا میں بھیجا ہے ان کے نام خدا نے طے کئے ہیں اور خدا جس نام کو طے کرتا ہے وہ نہ بے مناسبت ہوتا ہے نہ بے ربط ہوتا ہے، نہ بے جوڑ ہوتا ہے۔ خدا کسی جاہل کو عالم نہیں کہہ سکتا، خدا کسی عاجز کو قادر نہیں کہہ سکتا، خدا کسی مُردہ کو زندہ نہیں کہہ سکتا، خدا کسی بے کمال کو باکمال نہیں کہہ سکتا، وہ جس کو جیسا کہہ دے سمجھو ویسا ہے۔ اور فقط یہی نہیں کہ ویسا آج ہے بلکہ خدا نے اگر کہہ دیا تو جب تک رہے گا ویسا ہی رہے گا۔ اگر خدا نے کسی کو محمدؐ بنا دیا تو ایسا نہیں ہے کہ آج قابلِ تعریف ہے شائد کل نہ رہ جائے۔ نہیں جب تک رہے گا قابلِ تعریف رہے گا۔ جب تک علیؑ رہے گا بلند ہی رہے گا۔ جب تک حسن رہے گا صاحبِ حُسن ہی رہے گا۔ جب تک کوئی رہے گا صاحبِ کمال ہی رہے گا۔ اس لئے کہ خدا نے ماضی، حال، مستقبل سب کو دیکھ کے فیصلہ کیا ہے۔ صلوات

یہ بات ضمناً میں نے آپ کے سامنے گذارش کی ہے مگر جو بات علم امام کے بارے میں گذارش کرنا چاہتا ہوں اس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ امام حسینؑ کے علم کو پہچاننے کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ عمومی راستہ ہے جس سے ہر علم کو پہچانا جا سکتا ہے۔ یا اہلبیتِ پیغمبرؐ کے علمی کمال کو پہچانا جا سکتا ہے۔ اور انھیں اہلبیتِ پیغمبرؐ میں امام حسینؑ بھی شامل ہیں جس کی تفصیل سال گذشتہ میں گذارش کر چکا ہوں یا ائمہ معصومینؑ کے کمالات اگر معلوم ہو جائیں تو انھیں ائمہ میں امام حسینؑ بھی شامل ہیں۔ یا پیغمبرؐ کے وارثوں کے کمالات اگر معلوم ہو جائیں تو انھیں وارثانِ پیغمبرؐ میں امام حسینؑ بھی ہیں، اگر اہلبیتؑ کا کمال معلوم ہو جائے تو انھیں اہلبیت میں ایک امام حسینؑ بھی ہیں یعنی امام حسینؑ کے کمال کو پہچاننے کے یہ سارے عنوان ہیں کہ جن کے ذریعہ سے کمالِ علم سرکار سید الشہداؑ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ میں نے چار حوالے دئیے ہیں، تفصیل پر آپ خود غور کر لیں گے یا مطالعہ کریں گے آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ امام حسینؑ اہلبیت میں ہیں۔ امام حسینؑ وارثینِ پیغمبرؐ میں ہیں۔ امام حسینؑ ائمہ اہلبیتؑ میں ہیں۔ امام حسینؑ اللہ کے بنائے ہوئے جانشینوں میں ہیں۔ لہٰذا جتنے کمالات ان تمام افراد کے لئے

ضروری ہیں اور جتنے کمالات پروردگار عالم نے ان میں سے کسی کو بھی عنایت فرمائے ہیں وہ سارے کمالات امام حسینؑ میں اس اعتبار سے ہیں کہ امام حسینؑ بہرحال انھیں صاحبانِ کمال کی ایک فرد ہیں۔ اور دوسرا طریقہ امام حسینؑ کے کمال علم کو پہچاننے کا ۔ آثار کے ذریعہ کمال علم کو پہچاننا ہے۔ ان آثار کی بھی دو قسمیں ہیں بلکہ اور اگر واضح کیا جائے تو ان آثار کو پہچاننے کی تین قسمیں ہیں۔ بعض علمی کمالات وہ ہیں جن کو امام حسینؑ نے خود اپنے بزرگوں سے نقل کئے ہیں ——— بعض علمی کمالات وہ ہیں جو اہلِ دنیا نے امام حسینؑ سے نقل کئے ہیں اور بعض کمالات وہ ہیں کہ جہاں امام حسینؑ نے خود اپنے کمالِ علم کا اعلان فرمایا ہے۔ اس میں نہ کسی کا حوالہ پہلے ہے اور نہ کسی کے حوالہ کی بعد میں کوئی ضرورت ہے۔ براہ راست کردار امام حسینؑ میں اس علم کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ علم کا پہلا شعبہ جہاں امام حسینؑ کے علم کو پہچانا گیا ان روایتوں سے جو امام حسینؑ نے کسی اور سے بیان کی ہیں یعنی کسی اور کے حوالہ سے بیان کی ہیں۔ اس مقام پر اس لفظ کو بھی آپ یاد رکھیں گے کہ کسی معصوم کی زندگی اور ان کے حالات لکھے جاتے ہیں تو یہ دو سرخیاں ضرور لکھ دی جاتی ہیں۔ ہمارے یہاں عام طور سے ان باتوں کا تذکرہ بہت کم ہوتا ہے اس لئے کہ ہمارا ذہن زیادہ مانوس ہوتا ہے کرامات، کمالات، معجزات سے۔ لہٰذا ہمارے یہاں جو کتابیں لکھی جاتی ہیں ان میں سارا زور اسی پر ہوتا ہے کہ کتنے معجزات اس میں جمع کر دئے گئے ہیں۔ کتنی کرامتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ فلاں کی مصیبت تھی وہ کیسے دور ہو گئی۔ فلاں نے دعا مانگی وہ کیسے قبول ہو گئی۔ ہمارے یہاں زیادہ زور تاریخ نویسی میں، سیرت نویسی میں اسی بات پر دیا جاتا ہے مگر جہاں علمی چرچہ زیادہ ہو وہاں کسی کی سیرت لکھنے میں ان دو موضوعات کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے کہ اس کے علوم، اس کے فضائل، اس کے کمالات، اس کے آثار، اس کے بیانات، اس کے ارشادات، اس کے خطبات، اس کے کلمات کیا ہیں۔ یعنی یہ معلوم ہو جائے کہ انھوں نے ہمارے واسطے کیا چھوڑا ہے۔ وہ خود کتنے صاحبِ کمال تھے کس کے کس کے مشکلات کو حل کر دیا وہ تو اس دور کا قصہ تھا۔ لیکن ہمارے واسطے، گلی نسلوں کے لئے، قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے

وہ علمی میراث کیا چھوڑ کر گئے ہیں یہ ایک مستقل موضوع ہے جو ہر ایک کے حالات میں نقل کیا جاتا ہے۔ چاہے ائمہ کی زندگی ہو چاہے دنیا میں دوسری شخصیات کی زندگی ہو، اس میں یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ انھوں نے دوسروں کے علوم کو ہم سے کہاں تک نقل کیا ہے اور ان کے علوم کو دوسروں نے کہاں تک بیان کیا ہے۔ اس کی دو سرخیاں ہوتی ہیں۔ ایک سُرخی کا عنوان یہ ہوتا ہے کہ انھوں نے دوسروں سے کیا کیا روایت کی ہے کہ فلاں نے یہ فرمایا، فلاں نے یہ فرمایا، اور فلاں نے یہ فرمایا۔ اور لوگوں نے ان سے کتنی روایتیں نقل کی ہیں کہ یہ کہا جائے فلاں امام نے یہ فرمایا ہے، یا فلاں شخصیت نے یہ فرمایا ہے اور کتنے نقل کرنے والے ہیں جنھوں نے ان کے آثار اور علوم کو نقل کیا ہے یہ دو الگ الگ سُرخیاں ہیں جو ہر بڑی شخصیت کے حالات میں نقل کی جاتی ہیں۔ اگر اس شخصیت کی کوئی علمی حیثیت ہے اور اگر خالی پیسے والے ہیں اور اقتدار والے ہیں تو ان کے حالات الگ لکھے جاتے ہیں۔ لیکن ائمہ معصومینؑ کی زندگی میں ایک امتیاز پایا جاتا ہے ـــــــ ائمہ معصومینؑ کی زندگی میں ایک خصوصیت پائی جاتی ہے کہ ائمہ طاہرینؑ کی زندگی میں یہ سرخی تو آپ کو ملے گی کہ ان سے علوم و کمالات کو کس نے کس نے نقل کیا۔ لیکن ائمہ کی زندگی میں یہ سرخی مل جائے کہ انھوں نے کس سے کس سے روایت کی ہے اور کس سے کس سے باتیں یا علوم لے کر ہمارے حوالے کیا ہے یہ سوائے اس گھرانے کے اور کہیں نہ ملے گا۔ میری بات محسوس کر رہے ہیں؟ مثلاً مولائے کائناتؑ کے حالات میں لکھا جائے کہ مولائے کائناتؑ نے کس سے کس سے روایت کی ہے۔ فلاں صحابی سے، فلاں مسلمان سے، فلاں آدمی سے کوئی ایسا آدمی آپ کو نہیں ملے گا جس سے مولائے کائناتؑ کوئی علم نقل کریں یا کوئی روایت نقل کریں یا امام حسنؑ نے کوئی روایت کسی سے نقل کی کہ فلاں صاحب یہ فرمایا کرتے تھے۔ فلاں صاحب کا یہ ارشاد گرامی ہے۔ ہاں ملے گا یہ عنوان، مگر جب یہ عنوان ملے گا تو جن سے نقل کیا ہے وہ اسی گھرانے کے افراد ہوں گے۔ لہٰذا امام حسینؑ کی زندگی کا یہ شعبہ بھی خالی نہیں ہے۔ یہ سرخی یہ عنوان ہے حیات امام حسینؑ میں ـــ امام حسینؑ نے کس سے کس سے روایت کی ہے۔ مگر عنوان کے تحت تین

ہی نام آتے ہیں یا بہت سے بہت چار نام آتے ہیں۔ امام حسینؑ نے پیغمبرؐ سے کس علم کو روایت کیا ہے۔ مولائے کائناتؑ سے کیا نقل کیا ہے۔ صدیقۂ طاہرہؑ سے کیا نقل کیا ہے۔ یا امام حسنؑ سے کیا نقل کیا ہے۔ اس کے بعد اور کوئی ایسا نہیں ہے کہ جس سے امام حسینؑ نقل کریں۔ جتنے ہیں وہ سب امام حسینؑ سے نقل کرنے والے ہیں۔ صلوات

لہٰذا امام حسینؑ کے علم کا یہ شعبہ کہ امام حسینؑ نے کس سے کس سے روایت کی ہے اس میں فقط چار ہی نام آتے ہیں۔ یا پیغمبر اسلامؐ کا اسم گرامی ہے یا مولائے کائنات کا ذکر آتا ہے یا صدیقۂ طاہرہ یا امام حسنؑ، اس کے علاوہ کوئی ایسا نہیں ہے کہ جس کی بات امام حسینؑ نقل کریں کہ فلاں صاحب یہ فرما رہے تھے۔ لہٰذا میں اس امانت کو آپ حضرات کے حوالے کر رہا ہوں۔ اس کے بعد پورا سلسلہ ان افراد کا ہے کہ جنھوں نے امام حسینؑ کے ارشادات کو نقل کیا۔ امام حسینؑ کے بیانات کو اُمّت کے حوالے کیا جو امام حسینؑ سے روایت کرنے والے ہیں۔ امام حسین ان سے روایت کرنے والے نہیں ہیں۔ ان میں تمام بڑی شخصیتیں عالم حدیث کی جتنی بڑی شخصیتوں کے نام آپ سنتے رہتے ہیں معتبر یا غیر معتبر بہر حال وہ سارے افراد ہیں، جنھوں نے امام حسینؑ سے آپ کے علوم کو نقل کیا ہے۔ یہ شخصیت اور علم امام حسینؑ کا دوسرا رُخ ہے۔ تیسرا پہلو امام حسینؑ کے وہ بیانات جو مختلف موضوعات میں پائے جاتے ہیں۔ جہاں آنے والوں نے امام حسینؑ سے مسائل شریعت، مسائل احکام کے بارے میں دریافت کیا ہے اور امام حسینؑ نے ان کے سوالات کے جوابات دیئے ہیں۔ جن کو لوگوں نے کتابوں میں محفوظ کر لیا ہے۔ وہ بھی علم امام کو پہچاننے کا ایک تیسرا ذریعہ ہے ——— میں تینوں کی ایک ایک مثال گذارش کر دوں اور اس کے بعد سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاؤں۔ مثال کے طور پر جو ارشاداتِ پیغمبر اسلام ہم تک پہونچے ہیں امام حسینؑ کے ذریعہ کہ امام حسینؑ نے نقل کیا کہ میرے جدّ بزرگوار یہ فرمایا کرتے تھے ان ارشادات میں ایک لفظ ہے جو سرکارِ دو عالم کے حوالے سے امام حسینؑ نے نقل کیا ہے کہ حضور سرور کائناتؐ فرماتے ہیں اَلْبَخِیْلُ مَنْ ذُکِرْتُ عِنْدَہٗ وَلَمْ یُصَلِّ عَلَیْنَا۔ اگر پہچاننا چاہتے ہو کہ بخیل، کنجوس کسے کہتے ہیں تو بخیل خالی وہ نہیں ہے

کہ جیب میں پیسہ رکھے ہے دیتا نہیں ہے۔ گھر میں دولت بھری ہوئی ہے غریب کی امداد نہیں کرتا۔ بخیل تنہا وہ نہیں ہے ارے سب سے بڑا بخیل تو وہ ہے کہ جس کے سامنے میرا نام آئے، میرا ذکر آئے اور ایک صلوات تک نہ پڑھے۔ صلوات

چونکہ باقی قسمیں سب جانتے تھے لہٰذا اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ مسئلہ نازک تھا لہٰذا امام حسینؑ نے جد بزرگوار کے حوالے سے یہ ارشادِ پیغمبرؐ نقل کیا کہ پیغمبرِ اسلامؐ فرمایا کرتے تھے کہ مَنْ ذُکِرْتُ عِنْدَہٗ وَلَمْ یُصَلِّ عَلَیْنَا۔ جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ صلوات نہ پڑھے۔ سوچو وہ کتنا بڑا بخیل ہے کہ جس کے دل سے ایک صلوات نہیں نکلتی ہے۔ اب آج تو کوئی آیت بخویٰ نازل ہونے والی نہیں ہے کہ پیسہ خرچ کرنا پڑے۔ آج تو کوئی میدان جنگ نہیں ہے جہاں جان دینا پڑے۔ وہ کیا پیسہ دے گا، کیا جان دے گا جو ایک لفظ میرے واسطے استعمال نہیں کر سکتا، جو ایک دعائے خیر میرے حق میں نہیں کر سکتا۔ جب کہ ہم کسی کا احسان نہیں لیتے۔ تم ہمارے حق میں ایک دعائے خیر کرو گے، ہم تمہارے حق میں ہزار دعائے خیر کریں گے۔ صلوات

یہ امام حسینؑ کا وہ ارشاد گرامی ہے۔ جو پیغمبرِ اسلامؐ کے حوالے سے سرکار سید الشہداؑ نے نقل کیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے مرحلے پر آئیے وہ بھی ہمارے اور آپ کے معلومات کے لئے ضروری ہے جو سرکار سید الشہداؑ سے سوالات کئے گئے ہیں اور آپ نے ان سوالات کے جوابات دیئے ہیں جن سے آپ کے علم شریعت اور علم دین کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ پوچھا گیا فرزندِ رسولؐ یہ فرمائیے کہ جہاد کی اسلام میں کیا حیثیت ہے۔ اسلام میں جہاد کی نوعیت اور اس کی حیثیت کیا ہے۔ فرمایا جہاد دو طریقے کے ہوتے ہیں۔ جہاد واجب بھی ہوتا ہے اور جہاد غیر واجب بھی ہوتا ہے۔ مستحب بھی ہوتا ہے، سُنّت بھی ہوتا ہے۔ ہم تو یہی بچپنے سے سُنتے چلے آرہے ہیں کہ جہاد ہوگا تو واجب ہوگا، نہیں ہوگا تو نہیں ہوگا جب وقت جہاد آجائے گا تو جہاد تو بہرحال ضروری ہے۔ امامؑ نے فرمایا جہاد واجب بھی ہوتا ہے اور جہاد سُنّت و مستحب بھی ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے ذہن میں جو جہاد کے معنی آتے ہیں وہ میدانِ جنگ میں تلوار لے کر۔ لیکن امام حسینؑ نے چاہا کہ عالمِ اسلام کو جہاد کی ایک نئی قسم

کی طرف متوجہ کیا جائے۔ فرمایا جہاد فرض بھی ہوتا ہے۔ جہاد سنت بھی ہے، واجب بھی ہے مستحب بھی ہے۔ جب کسی واجبِ مُردہ کو زندہ کرنے کے لئے جہاد کیا جائے۔ جس فریضہ کو لوگوں نے مُردہ بنا دیا۔ اگر اس فریضہ کو زندہ کرنے کے لئے جہاد کیا جائے تو یہ جہاد بھی واجب ہوگا اس لئے کہ اگر یہ جہاد نہ کیا جائے گا تو فرض شریعت مُردہ ہو کے رہ جائے گا، قانون الٰہی مُردہ ہو کے رہ جائے گا۔ لہٰذا اسلام میں جہاد ہر مسلمان پر واجب ہے۔ اس لئے کہ یہاں تلوار کا کوئی کام نہیں ہے۔ یہاں جان دینے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر آپ دیکھتے ہیں کہ فرائض الٰہیہ کو لوگ پامال کئے ڈال رہے ہیں، فرائض الٰہیہ کو لوگ مُردہ بنائے ہوئے ہیں تو کم سے کم زبان تو کھولئے، کم سے کم قلم تو چلائیے جس کے امکان میں جو کچھ ہے وہی جہاد واجب ہے۔ اگر آپ زبان سے فرائض الٰہیہ کو زندہ رکھ سکتے ہیں تو زبان چلانا واجب ہے۔ اگر قلم سے آپ واجبات کو زندہ رکھ سکتے ہیں تو قلم کو جنبش دینا یہ آپ کے فرائض میں شامل ہے۔ تو جو جہاد فرائض کی راہ میں کیا جائے وہ جہاد بھی فرض ہے اور جو جہاد سُنّتوں کی راہ میں کیا جائے وہ جہاد فرض تو نہیں ہوگا مگر سُنّت ضرور ہوگا اس لئے کہ تمام سُنّتیں، تمام مستحبات، تمام کارہائے خیر، تمام اچھے کام اگر سب پامال ہو جائیں، سب مُردہ بنا دیئے جائیں تو عالم انسانیت میں کیا رہ جائے گا۔ اسلام اپنے کمال کردار ہی سے پہچانا جاتا ہے لہٰذا اگر تم دیکھو کہ سارے مستحبات، ساری سُنّتیں پامال ہو رہی ہیں تو انھیں زندہ کرنے کے لئے جہاد کرو یہ جہاد بھی سنتِ پیغمبرؐ ہے، سُنّتِ معصومینؑ ہے کہ انھوں نے ہمیشہ کردار کو زندہ رکھنے کے لئے زحمتیں برداشت کی ہیں۔ یہ جہاد تلوار چلانا نہیں ہے یہ جہاد زحمتیں برداشت کرنا ہے۔ اور جہاد کے معنی یہی ہیں کہ انسان کے پاس جتنی طاقت ہو اس طاقت کو صَرف کر دیا جائے۔ اسی صَرفِ طاقت کا نام ہے جہاد۔ یہ ایک سوال تھا جس کا جواب فرزندِ رسولؐ نے دیا اور ضمناً ایک بات یاد آگئی ہے اور علم امام حسینؑ ہی کا ذکر ہو رہا ہے لہٰذا ایک جملہ اور گذارش کر دوں، یہ روایت جو آپ سنتے ہیں یہ روایت بھی امام حسینؑ ہی سے نقل کی گئی ہے وہ ہے، کسی نے پوچھا کہ پروردگار عالم نے روزے کیوں واجب کئے

ہیں۔ سرکار سید الشہداؑ سے پوچھنے والے نے یہ سوال کیا مولا! یہ بتائیے کہ پروردگار عالم نے روزے کیوں واجب کئے ہیں؟ فرمایا ایک مصلحت الٰہی روزے کو واجب کرنے میں یہ بھی ہے تا کہ غنی افراد، مالدار لوگ، پیسے والے آرام کی زندگی گذارنے والے، صبح سے شام تک کھانے والے انھیں بھی تو یہ اندازہ ہو کہ فقیروں کی زندگی کیسی گذرتی ہے۔ کسے یاد رہتا ہے کہ غریبوں پر کیا گذرتی ہے۔ کسے خیال آتا ہے کہ مسکین کی زندگی کا حال کیا ہوتا ہے۔ بارہ چودہ گھنٹے بھوکے رہو تب تو یہ اندازہ ہوگا کہ غریب کی سال بھر کی زندگی کیسی تھی۔ فقیروں کی زندگی کیسے گذرتی ہے تو پروردگار عالم نے صاحبانِ دولت کو غربت کا احساس پیدا کرانے کے لئے ان پر بھی روزہ واجب کر دیا۔ یہ ایک مصلحت جو امام حسینؑ نے بیان فرمائی۔ لیکن میں نے اس مصلحت کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ اگر خدا نے روزہ اسی لئے واجب کیا ہے کہ امیروں کو، دولتمندوں کو، پیسے والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ غریب کی زندگی کیسے گذرتی ہے تو پھر روزہ خالی پیسے والوں پر واجب ہونا چاہئے تھا ــــــ

ــــــ اگر امیروں کو احساس دلانا ہے کہ غریب کی زندگی کیسے گذرتی ہے تو پھر یہ روزہ خالی امیروں پر واجب ہوتا، غریبوں پر کیوں واجب کیا گیا۔ اک سوال پیدا ہوسکتا تھا مگر عزیزو! جواب بھی بالکل واضح ہے۔ اک لمحے کی توجہ درکار ہے جواب بالکل واضح ہے کہ پروردگار عالم اُنھیں ہوش میں لانا چاہتا ہے، اِنھیں مفت کا ثواب دینا چاہتا ہے، یعنی روزہ واقعاً اگر رکھنا ہے تو امیروں ہی کو رکھنا ہے۔ روزہ رکھنا ہے تو کھاتے پیتے لوگوں ہی کو رکھنا ہے۔ روزہ رکھنا ہے تو پیسے والوں ہی کو رکھنا ہے۔ جو صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا، شام کا کھانا، دوپہر کی چائے، یہ بیڈ ٹی وہ فلاں ٹی، صبح سے شام تک سوائے کھانے پینے کے اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ روزہ ان کے واسطے روزہ ہے ورنہ جس غریب کو نہ صبح کا ناشتہ ملتا ہے، نہ دوپہر کے کھانے کا سہارا ہے، نہ سہ پہر کی چائے کا سہارا ہے۔ اس کے واسطے کون سا روزہ ہے، اس کے تو بارہ مہینے یونہی گذر رہے ہیں، مگر خدا نے فریضے میں اُسے بھی شامل کر لیا ــــــ

ــــــ تا کہ انھیں ہوش میں

لایا جائے اور انھیں مفت کا ثواب دے دیا جائے۔ صلوات

اس کے علاوہ نہ جانے کتنی روایتیں ہیں اور کتنے ارشادات ہیں جو کتابوں میں پائے جاتے ہیں ان تفصیلات کو عرض کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرزند رسولؐ الثقلین کا علم اور اس علم کی وسعتیں کیا ہیں۔ یہ عنوان ہے جو میں نے عرض کیا ہے تین طریقے ہیں جن سے علم امام حسینؑ پہچانا گیا ہے۔ وہ روایات جو امام حسینؑ نے اپنے بزرگوں سے نقل کی ہیں، وہ روایتیں جو علمائے اسلام نے امام حسینؑ سے نقل کی ہیں اور وہ مسائل وہ علمی گتھیاں جو امام حسینؑ نے سلجھائی ہیں اور جو امام حسینؑ نے جوابات دیئے ہیں جن سے انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ امام حسینؑ کا علم کیا تھا اور اُس علم سے عالم انسانیت اور عالم اسلام نے کتنا فائدہ اٹھایا ہے۔ اب اس پورے بیان کو سمیٹتے ہوئے دو چار جملے گذارش کرنا چاہتا ہوں اور یہی میری تقریر کا خلاصہ ہے۔ تھوڑی دیر آپ اپنے ذہنوں کو میرے ساتھ رکھیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ اسلامی دنیا میں، مذہبی دنیا میں، خلافت الٰہیہ کی دنیا میں علم کا تذکرہ جناب آدمؑ سے شروع ہوتا ہے۔ کوئی نمائندۂ پروردگار ایسا نہیں ہے جس کو پروردگار عالم نے جاہل اس دنیا میں بھیج دیا ہو اگرچہ دنیا میں سارے انسان آتے ہیں تو یونہی آتے ہیں واللہ اخرجکم مِنۢ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِكُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَيۡــًٔا اللہ نے تم کو شکم مادر سے نکال کر دنیا کے حوالے کیا اس عالم میں کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔ تو انسان کی اصل ہے جہالت۔ ہر انسان کی زندگی کی بنیاد ہے بے خبری اور ناواقفیت، جو آیا وہ ایسا ہی آیا۔ جاہل آیا، بے خبر آیا، ناواقف آیا۔ مگر اللہ کا جو نمائندہ آیا وہ اپنے ساتھ علم لے کر آیا ہے۔ فضل و کمال لے کر آیا ہے۔ یہ ایک فرق ہے جو دنیا کے انسانوں میں اور اللہ کے نمائندوں میں قائم کیا جاتا ہے۔ وہ کمال لے کے آئے انھوں نے دنیا میں کمال حاصل کیا۔ ورنہ آئے تو خالی ہاتھ اور بے کمال آئے۔ اتنی سی بات تو اس امتیاز کے لئے ہے کہ اللہ کے نمائندوں میں اور دنیا کے انسانوں میں فرق کیا ہوتا ہے۔ اس کے بعد خدا کے نمائندوں کے درمیان اور ائمہ طاہرینؑ یا ائمہ اہلبیتؑ کے درمیان کیا فرق پایا جاتا ہے اس کی

ایک مختصر داستان جلدی جلدی آپ سُن لیں تفصیلات کا موقع نہیں ہے۔ جہاں سے پروردگارِ عالم نے تذکرہ علم شروع کیا ہے۔ جن کو خدا نے علم دیا ہے، جنھوں نے جاہل پیدا ہو کر یہاں پڑھا نہیں ہے، اُن سب کے علم کی داستان دامنِ قرآن میں موجود ہے ـــــ سب کے علم کی داستان قرآن مجید نے محفوظ کر رکھی ہے۔ جناب آدمؑ سے سلسلہ شروع ہوتا ہے عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا جب ذکر علم آدمؑ آیا تو خدا نے کہا کہ اللہ نے آدمؑ کو تمام اسمار کی تعلیم دی ہے۔ یعنی علم آدمؑ کا ذکر تو کیا مگر اسمار کے ساتھ۔ اللہ نے آدمؑ کو تمام ناموں کا علم دیا۔ یعنی علم دیا مگر یہ بتایا کہ کیا دیا۔ یہ ہے علم جناب آدمؑ۔ جناب آدمؑ کے بعد جناب نوحؑ کا ذکر آتا ہے۔ جب جناب نوحؑ نے پروردگار کی بارگاہ میں دعا کی کہ پروردگارا! یہ میرا بیٹا ہے جو ڈوبا جا رہا ہے اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ یہ میرا بیٹا میرے اہل میں ہے۔ اور یہ ڈوبا جا رہا ہے تو نے وعدہ کیا ہے کہ جو میرے اہل ہیں انھیں بچا لے گا۔ تو ادھر سے آواز آئی اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ یہ تمھارے اہل میں نہیں ہے۔ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ یہ عمل غیر صالح ہے۔ اس کے بعد پروردگار نے کہا اے نوحؑ! جو بات نہیں جانتے خبردار اس کے بارے میں اب ہم سے سوال نہ کرنا۔ اِنِّيْ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ ہم تم کو نصیحت کر رہے ہیں کہ کہیں تمھارا شمار جاہلوں میں نہ ہو جائے۔ سلسلہ بھولئے گا نہیں۔ علم آدمؑ کا اعلان ہوا تو اسمار کے ساتھ۔ نوحؑ کے کمال کا اعلان ہوا کہ یہ مستجاب الدعوات ہیں۔ ہم نے وعدہ کیا ہے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کریں گے۔ مگر یہ اُسے اہل کہہ رہے ہیں، میں اُسے نااہل کہہ رہا ہوں اور سمجھا رہا ہوں، دیکھو خبردار تمھارا شمار جاہلوں میں نہ ہو جائے۔ یعنی علم نوحؑ کے ساتھ خدا نے لفظ جہل استعمال کر دیا چاہے خطرہ سے آگاہ کرنے ہی کے لئے سہی مگر ہوشیار کر دیا۔ خبردار اب سوال نہ کرنا، اب کسی کا نام نہ لینا۔ ایک کا نام تم نے لیا ہم نے بتا دیا۔ تم اس کو اہل کہتے ہو ہماری نگاہ میں نااہل ہے۔ یہ ہے کمالِ علم نوحؑ۔ اب آگے بڑھئے یہ سلسلہ یونہی آگے بڑھتا جائے گا۔

جناب داؤدؑ سامنے آئے۔ پروردگار نے کہا عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ

ہم نے جناب داؤد کو جو علم دیا ہے وہ "زرہ" بنانے کا علم ہے۔ ہم نے علم دیا ہے نگران کو علم دیا ہے زرہ بنانے کا۔ ان کا عالم یہ ہے کہ لوہا ان کے ہاتھ میں موم ہو جاتا ہے اور زرہ بنانے میں جیسے ہم نے بتا دیا ویسے ہی بناتے ہیں۔ تو علم بھی ان کا نہیں ہے ہمارا دیا ہوا ہے۔ مگر دیا گیا ہے۔ زرہ سازی کا علم۔ علم بھی بتایا اور معلوم بھی بتا دیا کیا دیا ہے جناب داؤدؑ کے بعد جناب سلیمانؑ کی باری آئی۔ جناب سلیمانؑ اعلان کرتے ہیں یا ایہا الناس اُعلِّمنا مَنْطِقَ الطَّيْرِ دیکھو خدا نے مجھے پرندوں کی گفتگو سمجھنے کا علم دیا ہے۔ یعنی سلیمانؑ نے علم کا اعلان بھی کیا اور معلومات بھی بتا دیئے کہ خدا نے کیا دیا ہے ——— جناب موسیٰؑ جب اس منزلِ کمال میں آئے تو خدا نے کہا موسیٰ ذرا چلے جاؤ وہاں جو "مجمع البحرین" پر میرا ایک بندہ رہتا ہے عَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا جس کو ہم نے اپنے پاس سے ایک علم دیا ہے جو تمھارے پاس نہیں ہے۔ تو صاحب توریت کے پاس بھی کچھ ہے کچھ نہیں ہے اور جس کے پاس بھیجا گیا ہے انھیں بھی خدا نے کچھ علم دیا ہے سب نہیں دیا ہے۔ جناب سلیمان کا وصی تخت بلقیس اٹھا کر لایا خدا نے کہا قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ یہ تخت بلقیس اٹھا لایا کیوں اس لئے کہ اس کو تھوڑا سا کتاب کا علم دیا گیا تھا۔ توجہ کریں۔ تھوڑا سا علم دیا گیا تھا۔

جب قوم نے جناب عیسیٰؑ کو خدا کہنا شروع کیا تو، پروردگار نے کہا عیسیٰ! کیا تم نے یہ کہہ دیا ہے کہ مجھے اور میری ماں کو خدا مان لو۔ کہا پروردگار! میں یہ جراُت کر سکتا ہوں؟ جو میں نے کہا وہ تو تجھے معلوم ہی ہے۔

جب جناب سلیمانؑ نے کہا ہُدہُد تو کہاں چلا گیا تھا۔ اپنی ڈیوٹی چھوڑ کے تو کہاں چلا گیا تھا۔ اُس نے کہا نبیِ خدا! میں وہ جانتا ہوں جو آپ نہیں جانتے۔ میں ملک سبا سے ایک نئی خبر لے کے آیا ہوں یعنی خدا کا دیا ہوا علم اور مقابلے میں ایک پرندہ۔ وہ کہتا ہے میں وہ جانتا ہوں جو آپ نہیں جانتے اس لئے کہ خدا نے آپ کو بھی دیا ہے مجھے بھی دیا ہے اور آپ کو میری گفتگو کا علم اسی لئے دیا ہے تاکہ آپ پہچانیں کہ کچھ مجھے معلوم ہے۔ آگے میں نہ کہوں گا۔ کچھ باتیں مجھے معلوم ہیں جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ ہر ایک

کے علم کی داستان میں یہ دونوں نکتے دکھائی دیئے۔ خدا نے علم دینے کا بھی اعلان کیا اور کیا دیا یہ بھی بتایا۔ لیکن جب پیغمبر اسلامؐ کی باری آئی ـــــــ جب خدا نے علم پیغمبرؐ کا اعلان کرنا چاہا تو پروردگار عالم نے پہلے اپنے علم کا اعلان کیا عِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ۔ اے بندو! پہلے مجھے پہچانو، میرے پاس غیب کے خزانے ہیں۔ تم تو ایک غیب بھی نہیں جانتے، میرے پاس غیب کے خزانے ہیں۔

میں اپنے عزیزوں کی توجہ کے لئے یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ یہ لفظ قرآن مجید میں عِنْدَہٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ ہے عِنْدَہٗ مَفَاتِيحُ الْغَيْبِ نہیں ہے۔ مفاتح الگ ہے اور مفاتیح الگ ہے۔ مفاتیح کنجیوں کو کہا جاتا ہے اور مفاتح خزانوں کو کہا جاتا ہے جہاں کنجیاں لگائی جاتی ہیں، جہاں سے سامان نکالا جاتا ہے۔ عندہ مفاتح الغیب پروردگار کے پاس غیب کے خزانے ہیں۔ يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ جو خشکی میں ہے اُسے بھی جانتا ہے، جو سمندروں میں، دریاؤں میں، تری میں ہے اُسے بھی جانتا ہے ــــ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا فضا سے یا درخت سے جب پتّہ ٹوٹ کر گرتا ہے خدا اس کو بھی جانتا ہے۔ وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْاَرْضِ اور زمین کی تاریکیوں میں جو دانا چھپا ہوا ہے خدا اُسے بھی جانتا ہے۔ غیب خدا جانتا ہے، خشکی کی باتیں خدا جانتا ہے، دریاؤں کی باتیں خدا جانتا ہے، فضاؤں کی باتیں خدا جانتا ہے، زمینوں کے اندر کیا ہے خدا جانتا ہے۔ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِيْنٍ اور جتنا خشک و تر ہیں نے بتایا ہے یہ سب میں نے اپنی کتاب کے اندر رکھ دیا ہے۔

عزیزو! میری محنت ضائع نہ ہونے پائے۔ پروردگار نے اپنے سارے علم کا اعلان کر کے فرمایا کہ جتنا خشک و تر ہے سب میں نے کتاب میں رکھ دیا ہے اور جو اپنے پیغمبرؐ کا ذکر کیا تو پیغمبرؐ کو عالم کتاب نہیں کہا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ میں نے پیغمبرؐ کو اس کتاب کا عالم بنایا ہے ـــــــ بلکہ فرمایا۔ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ انھیں کتاب کا معلّم بنا کر بھیجا ہے۔ اب یہ اندازہ ہوا کہ سب کے معلومات معیّن تھے۔ انھیں اسماء دیئے۔ انھیں یہ علم دیا، انھیں وہ علم دیا۔ ہر ایک کا علم معین کر کے دیا۔ ایک پیغمبر کو دیا تو یہ علم

دیا کہ خشک و تر جو کچھ تھا کتاب میں تھا۔ کتاب کو سینۂ پیغمبر میں رکھا گیا تو ساری کائنات کا علم پیغمبرؐ کے پاس، اب پیغمبرؐ کو اپنی پیغمبری کے لئے کوئی گواہ چاہیئے۔ پیغمبرؐ کو اپنے رسالت کے لئے کوئی گواہ چاہیئے تو خدا نے کہا اس کا بھی انتظام کردوں گا قُلْ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ وَمَنْ عِنْدَہٗ عِلْمُ الْکِتَابِ پیغمبر! تمہاری رسالت کا ایک گواہ میں اور ایک گواہ وہ جس کے پاس علم کتاب ہے۔ تو جب کتاب ہوگا تو علم کُلِّ کائنات ہوگا۔ اب آخر میں امام حسینؑ کا اعلان سُنیں فرماتے ہیں عِنْدَنَا عِلْمُ الْکِتَابِ۔ خدا نے علم کتاب ہمارے سینوں میں رکھا ہے تو جتنا کتاب میں ہے وہ کُلِّ کائنات ہے اور کتاب ہمارے سینے میں ہے، ہمارے علم سے دنیا کی کوئی شے باہر نہیں جا سکتی ہے صلوات

انبیاء کا کمال علم، اولیائے خدا کا کمال علم، ان کا کمال کردار یہ سارے حقائق اپنے مقام پر ہیں لیکن پروردگار عالم نے ہمیں صاحب علم کتاب، ہمیں وارث کتاب قرار دیا ہے اور کتاب میں خدا نے سارا علم رکھ دیا ہے۔ لہٰذا جس کے پاس علم کتاب ہے سمجھو سب کچھ اس کے پاس ہے۔ اسی لئے اب اس کے بعد آپ ائمہ معصومینؑ کی زندگیاں پڑھیں گے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ سارے حقائق جن کا ذکر انبیاء کے بارے میں قرآن مجید نے الگ الگ کیا ہے وہ سارے علوم ایک نقطے پر جمع ہو گئے۔ جس امام کی تاریخ حیات پڑھیں آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ پرندوں کی گفتگو کا علم اُسی کے پاس ہے۔ زمین کی گفتگو کا علم اسی کے پاس ہے۔ زمین کے خزانوں کا علم اسی کے پاس ہے۔ فضاؤں کا علم اسی کے پاس ہے۔ حد یہ ہے کہ امام نے فرمایا کہ خدا نے ہم کو اتنا علم دیا ہے کہ کیا گذر گیا وہ بھی معلوم ہے۔ کیا ہونے والا ہے وہ بھی معلوم ہے۔ ہمارے علم کے دائرہ سے کوئی چیز باہر نہیں گئی ہے۔ ایک روایت کا ایک جملہ یاد دلا دوں آپ کو اندازہ ہو جائے گا چونکہ میرے موضوع میں تنہا علم امام حسینؑ شامل ہے لہٰذا ایک فقرہ یاد دلانا چاہتا ہوں۔ وہ دن آیا جب مولائے کائنات منبر پر ہیں اور شہزادے زیرِ منبر ہیں۔ ایک مرتبہ مولا نے مُڑ کے ایک فرزند کو دیکھا کہا بیٹا بتاؤ اس مہینے کے کتنے دن گذر گئے۔ اس ماہ رمضان کی کتنی تاریخیں گذر گئیں؟ فرزند نے جواب دیا۔ پھر مُڑ کے دوسرے فرزند کو

دیکھا کہا بتاؤ اس مہینے میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں؟ فرزند نے اس کا جواب دیا جب دونوں کے جوابات جمع ہو گئے ——— کہ وہ وقت قریب آگیا ہے جب میرے محاسن میرے خونِ سر سے رنگین ہو جائیں گے۔ میری شہادت کا وقت، میرے دنیا سے جانے کا وقت قریب آگیا ہے۔ ان تاریخوں کے اعلان کے بعد مولائے کائنات ؑ نے یہ ارشاد فرمایا ——— کہ وہ وقت قریب آگیا ہے جب میرے محاسن سر کے خون سے رنگین ہو جائیں گے۔ لیکن میں جو بات گذارش کر رہا ہوں۔ ایک فرزند سے پوچھا کتنے دن گذر گئے ہیں ماہ رمضان کے اور دوسرے سے پوچھا کتنے دن باقی رہ گئے ہیں۔ اس لفظ پر پھر آپ توجہ فرمائیں اور اطمینان سے غور کریں۔

——— کسی مہینے میں کتنے دن گذر گئے یہ بتانا آسان ہے۔ اس مہینے کی کتنی تاریخ گذر گئی یہ بتانا آسان ہے۔ لیکن اس مہینے میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں یہ بتانا آسان نہیں ہے ——— مثال کے طور پر اگر فرض کر لیا جائے مثلاً آج پہلی تاریخ ہے یعنی شب اوّل ماہ ہے کل محرّم کی پہلی تاریخ ہے ظاہر ہے کل مجھ سے کوئی پوچھے صبح کو کہ اس مہینے کے کتنے دن گذر گئے ہیں؟ کہوں گا رات کو چاند ہوا تھا آج پہلی تاریخ ہے۔ لیکن کوئی مجھ سے پوچھے کہ اس مہینے کے کتنے دن باقی رہ گئے ہیں نہیں بتا سکتا ہوں۔ اس لئے کہ اگلا چاند اگر ۲۹ کا ہونے والا ہے تو ۲۸ دن رہ گئے اور اگلا چاند اگر ۳۰ کا ہونے والا ہے تو ۲۹ دن رہ گئے۔ نہ اگلے چاند کی مجھے اطلاع ہے اور نہ میں بتا سکتا ہوں کہ کتنے دن باقی رہ گئے۔ توجہ فرما رہے ہیں؟ شائد مولائے کائنات ؑ کی مصلحت ایک یہ بھی تھی کہ یہ پوچھ لیا جائے کہ کتنے دن باقی رہ گئے ہیں تاکہ لوگوں کو یہ اندازہ ہو جائے کہ امام تنہا وہ نہیں جانتا جو ہو چکا ہے، جو ہونے والا ہے اسے بھی جانتا ہے۔ صلوات

اور یہ بھی ضمناً آپ ذہن عالی میں رکھیں گے کہ امام حسین ؑ کا دور اور مولائے کائنات ؑ کا زمانہ وہ زمانہ نہیں تھا جو آج کا سائنٹفک دور ہے ——— آج آلات اور وسائل کا دور ہے ——— اب ہر کلینڈر معین ہے۔ سب جانتے ہیں چاند کہاں ہے

سورج کہاں ہے، کب ڈوبے گا کب نکلے گا۔ چودہ سو سال دنیا کے آگے بڑھنے کے بعد اگر آج وسائل کے ذریعہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ کب تحت الشعاع میں جائے گا کب تحت الشعاع سے باہر آ جائے گا۔ تو یہ چودہ سو سال کی ریاضتوں کا اثر ہے لیکن جب یہ ریاضتیں نہیں تھیں، جب یہ وسائل اور ذرائع نہیں تھے۔ ایک انسان اپنے علم کی بنیاد پر ایک فیصلہ کر رہا ہے جس کا فیصلہ اُس دن ہو گا جب اگلا چاند لوگوں کے سامنے آ جائے گا۔ یہ وسائل و ذرائع ہیں علم امامت کو پہچاننے کے لئے۔ پروردگار عالم نے کسی چیز کے علم کو اپنے ان نمائندوں سے مخفی نہیں رکھا ہے جو غیب اس کا اپنا ہے وہ اس کے لئے ہے۔ اس کے علاوہ مالک نے جو کچھ بھی ایک بندے کو دیا جا سکتا تھا وہ سارا علم، سارا کمال ان بندوں کو عنایت فرما دیا۔ اگر یہاں تک آپ کے ذہن میرے ساتھ چلے ہیں تو اسی علمِ امام حسینؑ کی روشنی میں اصحاب حسینؑ کی عظمت و جلالت کو پہچانیں۔ اسی علم سید الشہداءؑ کی روشنی میں امام حسینؑ کے گھر والوں کی بلندیوں کا اندازہ کریں کہ ایسا صاحبِ علم جو ماضی کو جانتا ہے، حال کو جانتا ہے، فضاؤں کو جانتا ہے، دریاؤں کو جانتا ہے۔ زیرِ زمین کیا ہے اُسے بھی جانتا ہے، بالائے آسمان کیا ہے اُسے بھی جانتا ہے۔ ایسا صاحب علم اعلان کرتا ہے وَاللهِ اِنِّي لَا اَعْلَمُ اَصْحَابًا اَوْفٰى مِنْ اَصْحَابِيْ خدا کی قسم میرے علم میں میرے اصحاب سے زیادہ وفادار کسی کے اصحاب نہیں ہیں۔ دنیا کا کوئی اور انسان اگر یہ بات کہتا تو شاید جلالت اصحاب کا ویسا احساس نہ ہو سکتا جیسا احساس امام حسینؑ کے اس اعلان کے بعد ہوتا ہے کہ امام حسینؑ یہ فرماتے ہیں کہ میرے علم میں ایسے اصحاب نہیں ہیں جیسے میرے اصحاب ہیں وَلَا اَهْلَ بَيْتٍ اَبَرَّ وَاَوْفٰى مِنْ اَهْلِ بَيْتِيْ اور نہ ایسے گھر والے میری نگاہ میں ہیں جو میرے گھر والوں سے زیادہ نیک کردار اور وفادار ہوں۔ میرے اصحاب سے زیادہ وفادار اصحاب نہیں ہیں، نہ ماضی میں نہ حال میں اور نہ مستقبل میں۔ اور نہ میرے گھر والوں سے زیادہ نیک کردار دنیا میں کہیں ملیں گے۔ تم نے پرانی تاریخ نہیں پڑھی۔ میری نگاہ کے سامنے پوری تاریخ ہے۔ تمہیں مستقبل کا حال نہیں معلوم ہے مجھے دنیا کا حال معلوم ہے۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں

ایسے نیک کردار کہیں نہ ملیں گے، ایسے وفادار کہیں نہ ملیں گے۔ یہ امام حسینؑ کا اعلان ہے اور یہ دونوں باتیں، ہم نے تاریخ میں دیکھ لیں۔ ان کا کردار بھی دیکھ لیا اور ان کی وفاداری بھی دیکھ لی۔

بس ارباب عزا میں اپنے بیان کو آخری منزل تک لے آیا۔ چونکہ مسئلہ علم امام حسینؑ سے متعلق تھا لہٰذا امام حسینؑ کے ارشاد گرامی ہی کی روشنی میں دو منظر آپ کے سامنے پیش کر کے بیان کو تمام کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ امام حسینؑ نے اپنے علم کا حوالہ دے کر یہ فرمایا کہ نہ میرے گھر والوں سے زیادہ صاحب کردار نہ میرے اصحاب سے زیادہ وفادار دنیا میں کہیں نہ ملیں گے۔ آیئے ان کا کردار دیکھیں اور ان کی وفاداری دیکھیں۔ گھر والوں کا کردار کب دیکھا۔ جب ماہ رجب کی اٹھائیسویں تاریخ آئی امام حسینؑ مسجد پیغمبرؐ میں تشریف فرما ہیں۔ حاکم وقت کا نمائندہ امام وقت کے پاس آیا آپ کو دربار میں طلب کیا گیا ہے۔ عبداللہ ابن زبیر بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس وقت طلب کیا گیا ہے؟ آنے والے قاصد نے کہا ہاں اسی وقت طلب کیا گیا ہے، رات کو دربار نہیں لگتا ہے مگر بلایا گیا ہے۔ ابن زبیر نے کہا فرزندِ رسولؐ! کیا ارادہ ہے؟ فرمایا جب بُلایا گیا ہے اور میں نے کہہ دیا ہے کہ آؤں گا تو میں بہر حال جاؤں گا۔ کہا مگر آپ تو جانتے ہیں کہ رات کے وقت کوئی دربار نہیں لگتا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خطرناک تاریخ کا موڑ آگیا ہے اور اس طلب میں کوئی نہ کوئی خطرہ پایا جاتا ہے۔ لہٰذا مناسب ہے کہ رات کی تاریکی سے اور رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھایا جائے اور ہم لوگ اپنے لئے کوئی پناہ گاہ تلاش کر لیں۔ فرمایا تم یہ کام کر سکتے ہو میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ میں نے وعدہ کیا ہے میں دربار میں جاؤں گا حالات کا جائزہ لوں گا اور مجھے معلوم ہے کہ شام کے حاکم نے انتقال کیا ہے اور مجھے بلایا جا رہا ہے۔ کس مقصد سے بلایا جا رہا ہے۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ جاؤں دربار میں تاکہ حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے۔ یہ کہہ کے مسجد سے اٹھے بیت الشرف میں آئے۔ بہن کو خبر سنائی بہن زینبؑ مجھے دربار میں بُلایا گیا ہے، تمھیں معلوم ہے کہ رات کے وقت کوئی دربار آراستہ نہیں ہوتا ہے یقیناً کوئی

سخت وقت آگیا ہے، کوئی سنگین موقع آگیا ہے جس کے لئے بلایا گیا ہے مگر میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں بہرحال دربار حاکم میں جاؤں گا اور دیکھوں حالات کیا ہیں تاکہ حق وباطل کا فیصلہ ہوجائے۔ جیسے ہی بھائی کا فیصلہ بہن نے سنا آواز دی عباس سُن رہے ہو آقا نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ علی اکبر، قاسم، عون ومحمد، بنی ہاشم کے شیرو!" اے ہاشمی جوانو! آقا نے فیصلہ کیا ہے دربار میں جانے کا، تو کیا تمہارا مولا اکیلا چلا جائے گا، کیا میرا ماںجایا دربار ظالم میں تنہا جائے گا۔ یہ نہیں ہوسکتا تلواریں اٹھاؤ تیار ہوجاؤ، اپنے حلقے میں لے کے جانا اور اپنے حلقے میں بھائی کو واپس لانا۔ (اجرکم علی اللہ)

ہاشمی جوان تلواریں لے کے تیار ہوئے۔ شہزادی کے کہنے کے مطابق مولا کو اپنے حلقے میں لیا اور لے کے چلے۔ جب ظالم کے قصر کے دروازے پر پہنچے تو مولا اندر جانا چاہتے ہیں اور چاہنے والے یہ چاہتے ہیں کہ مولا کے ساتھ آپ کو حلقے میں لئے ہوئے دربار میں جائیں۔ ایک مرتبہ فرمایا تم یہیں ٹھہر جاؤ مجھے بلایا گیا ہے میں جاؤں گا میں دیکھنا چاہتا ہوں ظالم کیا کہنا چاہتا ہے لیکن اس کا خیال رکھنا اگر میری آواز بلند ہوجائے تو پھر کسی اجازت کا انتظار نہ کرنا، یہی میری آواز تمہارے واسطے اجازت ہوگی اور دربار میں بلاتکلف داخل ہوجانا۔ آئے ظالم کے دربار میں، حاکم نے مرگ حاکم شام کی خبر سُنائی۔ امام حسینؑ نے یہ فقرہ سُنا تو رضائے الٰہی پر اپنی رضا کا اعلان فرمادیا۔ اسکے بعد یہ خبر سنائی کہ یزید حاکم ہوگیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ سے یزیدلعؔ کی بیعت کا مطالبہ کروں۔ فرمایا بیعت کا اتنا سنگین مسئلہ اور یہ رات کے اندھیرے میں طے ہوگا اگر تم کو اس مسئلے کو طے کرنا ہے تو دن میں اس دربار کو سجانا، لوگوں کو بلانا میں بھی آؤں گا تاکہ لوگوں کے سامنے یہ واضح ہوجائے کہ کس کی بیعت کرنی چاہیئے اور کس کے ہاتھوں پر بیعت ہونی چاہیئے۔ جب یہ امام نے جواب دیا تو ولید نے کہا ٹھیک ہے آپ تشریف لے جائیں کل پھر آپ کو زحمت دی جائے گی، پھر آپ کو بلایا جائے گا۔ جیسے ہی فرزندِ رسولؐ نے اُٹھ کے چلنے کا ارادہ کیا ایک مرتبہ مروان شقی نے کہا ولید یہ کیا حماقت کر رہا ہے، یہ کیا غلطی کر رہا ہے حسینؑ اکیلے دربار میں آگئے ہیں اگر اس وقت بچ کر چلے گئے تو جب تک

خون کی ندیاں نہ بہہ جائیں گی اس وقت تک حسینؑ تیرے قبضے میں نہ آسکیں گے۔ بس جیسے ہی خون کی ندیوں کا ذکر آیا ایک مرتبہ شیر ذوالجلال کے بیٹے کو جلال آگیا۔ حیدرؑ کرار کے لال کو جلال آگیا۔ فرمایا أَتُهَدِّدُنِي بِالْقَتْلِ يَا ابْنَ الزَّرْقَاءِ او زنِ نیلگوں چشم کے بچے! تو مجھے موت سے ڈراتا ہے۔ مجھے قتل کی دھمکی دے رہا ہے۔ أَأَنْتَ تَقْتُلُنِي أَمْ هُوَ۔ کون مجھے قتل کرے گا ولید قتل کرے گا یا تو قتل کرے گا۔ جیسے ہی مولاؑ کی آواز بلند ہوئی اور ہاشمی جوانوں کے کانوں سے آواز ٹکرائی اک مرتبہ دارالامارۃ کا دروازہ کھلا، ہاشمی جوان دربار میں آئے، آگے آگے ابوالفضل العباسؑ تلوار لئے ہوئے۔ کس نے مولاؑ کی شان میں گستاخی کی۔ آقا آپ کو آواز بلند کرنے کی ضرورت کیوں پڑی۔ کہا بھیاؑ ٹھہرو ٹھہرو، عباسؑ، تلوار چلانے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے اور بنی ہاشم کے جوانوں کے حلقے میں مولاؑ دربار سے واپس چلے۔ جب بیت الشرف میں قدم رکھا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہن بھائی کا انتظار کر رہی ہے۔ اے بھیاؑ، خیر تو ہے؟ فرمایا بہن بس مختصر یہ ہے کہ اب یہ مدینہ رہنے کے لائق نہیں رہ گیا ہے۔ اے بہن سامان سفر تیار کرو، اب یہ مدینہ ہم سے چھٹنے والا ہے۔ نانا کی قبر چھوٹے گی، ماں کی لحد چھوٹے گی، بھائی کی قبر چھوٹے گی، حسینؑ سے مدینہ چھوٹ جائے گا۔ یہ پہلا موقع تھا جب گھر والوں نے اپنے کردار کا اعلان کیا اب آؤ چاہنے والوں کی وفا دیکھیں۔ بس رونے والو مجلس تمام ہو رہی ہے۔

جب مدینہ میں حسینؑ دربار میں جا رہے تھے تو زینبؑ نے گھر والوں کی وفاداری کا اعلان کیا اور جب عاشور کی رات آئی اور ایک مرتبہ بھائی نے آکر خبر سنائی کہ بہن یہ زندگی کی آخری رات ہے۔

وہ مدینے کی آخری رات تھی یہ زندگی کی آخری رات ہے۔ اے بہن کل جنگ ہونے والی ہے، کل معرکہ کارزار گرم ہونے والا ہے۔ اب صلح کی کوئی تدبیر باقی نہیں رہ گئی ہے۔ یہ سنا تھا کہ شہزادی کی زبان پر ایک فقرہ آگیا۔ بھیاؑ تو آپ نے اپنے چاہنے والوں کو آزما لیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کل میدانِ کارزار میں آپ کا ساتھ چھوڑ دیں۔ بس یہ سننا تھا کہ دروازہ پر بیٹھے ہوئے چاہنے والے کے کان میں یہ آواز آئی۔ ارے شہزادی

کو ہم غلاموں کی وفا پر اعتبار نہیں ہے۔ اک مرتبہ نافع اٹھے اور آگر مجمع اصحاب میں آواز دی۔ حبیب، زہیر، مسلم کیا بیٹھے ہو ہماری زندگیوں کا فائدہ کیا۔ جب دخترِ زہراؑ کو ہماری وفا پر اعتبار نہیں، ارے نافع۔ کیا خبر لے کے آئے۔ کہا شہزادی فرمارہی ہیں کہ بھیّا اپنے ساتھیوں کو آزمالیا ہے۔ بس یہ سُننا تھا تلواروں کو نیاموں سے نکال لیا، نیاموں کو توڑ توڑ کے پھینکا۔ آئے درِ خیمہ پر۔ آواز دی ـــــــــــــ زہراؑ کے لال! زہراؑ کے لال! مولا تڑپ کے درِ خیمہ پر آگئے۔ کہا اے چاہنے والو! یہ تمھارا کیا حال ہے؟ کہا ہم نے سُنا ہے کہ شہزادی کو ہماری وفا پر اعتبار نہیں ہے۔ مولا جاکے فرما دیجئے یا ہم غلاموں کی وفا پر اعتبار کریں، یا آپ اجازت دیجئے ہم اپنے ہاتھوں سے اپنی گردنیں کاٹ ڈالیں مگر یہ نہ سُن سکیں گے کہ ہماری وفا پر اعتبار نہ ہو۔ اے چاہنے والو! تمھاری وفا پر یہ مجمع قربان۔ تم نے ایسی وفاداری کا ثبوت دیا کہ حسینؑ سے سندِ وفا بھی لے لی اور اس کے بعد آخری سند بھی لی۔ جب کوئی نہ رہ گیا تو درِ خیمہ سے آواز دے رہے ہیں۔ اے میرے شیرو! اے میرے جانبازو! حبیبؑ حسینؑ پکار رہا ہے۔ مسلمؑ مولا تمھارا آواز دے رہا ہے۔ عابدؑ بیمار کہتے ہیں کہ جب بابا کی آواز مقتل میں آئی تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ شہیدوں کے لاشے تڑپنے لگے۔ کٹی گردنوں سے آواز آئی مولاؑ! اگر موت درمیان میں حائل نہ ہوگئی ہوتی تو یہ غلام اب بھی آپ کی راہ میں جان دینے کے لئے تیار ہیں۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

دوسری مجلس

کرم امام حسین علیہ السّلام

"حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اللہ اسے دوست رکھے

جو میرے حسینؑ سے محبّت کرے۔"

سرکار دو عالمؐ کا یہ ارشاد گرامی جس کی روشنی میں عرفان حسینؑ سے متعلق کچھ معروضات سال گذشتہ آپ کے سامنے پیش کئے گئے تھے اور کچھ باتیں کردار سید الشہداء سے متعلق امسال ان مجالس میں گذارش کرنا ہیں جس کا سلسلہ کل سے شروع ہوا ہے۔

کل میں نے آپ کے سامنے امام حسینؑ کے علم سے متعلق کچھ باتیں گذارش کی تھیں آج گفتگو کے دوسرے مرحلہ پر کچھ باتیں کرم سرکار سید الشہداؑ سے متعلق گذارش کرنا ہے۔

امام حسینؑ کی زندگی سراپا کرم ہے۔ اس اجمال کی تفصیل تھوڑی دیر کے بعد گذارش کی جائے گی۔ آئیے پہلے اسلامی روایات کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے کرم کس کو کہا جاتا ہے اور کرم کے معنی کیا ہیں۔ اس وقت جو روایات میری نگاہ کے سامنے ہیں ان کا خلاصہ چند لفظوں میں یہ ہے کہ ایک مقام پر معصومؑ نے کرم کی تعریف کی ہے اَلکَرَمُ، العطاءُ قبل السّوال ——— یعنی جہاں انسان مانگنے کا انتظار نہیں کرتا بلا سوال دے دیا کرتا ہے اسی کو کرم کہا جاتا ہے اور اسی لئے پروردگار نے بار بار اپنا تعارف لفظ کریم سے کرایا ہے سخی سے نہیں کرایا۔ آپ پورے قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ مالک کائنات

نے اپنے کو غنی، کریم تو کہا ہے اپنے کرم کا اعلان تو کیا ہے مگر ایک مقام پر بھی اپنے کو سخی نہیں کہا ہے اس لئے کہ سخی بہر حال عطا کرنے والے ہی کا نام ہے مگر سخاوت سوال کا انتظار کرتی ہے۔ جو شکم مادر سے عنایت کر رہا ہے وہ اپنے کرم میں کس کے سوال کا منتظر ہے۔ مانگنے والا مانگنے کے معنی نہیں جانتا اور عطا کرنے والا مسلسل عطا کرتا جا رہا ہے اور اس مبارک رات شب جمعہ کی مناسبت سے ایک لفظ یہ بھی گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ اکثر لوگ اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ ہم اللہ کی بارگاہ میں دعا کرتے ہیں، طلب کرتے ہیں، مانگتے ہیں مگر خدا دیتا نہیں ہے۔ کتنا احسان فراموش ہے یہ کہنے والا۔ یہ اس کے بارے میں کہہ رہا ہے جو اس وقت سے عطا کر رہا ہے جب انسان مانگنے کے معنی بھی نہیں جانتا تھا۔ جب انسان کی کوئی اوقات نہیں تھی۔ روز اوّل جب انسان نے شکم مادر میں قدم رکھا، نہ سوال جانتا ہے نہ مانگنے کا طریقہ جانتا ہے نہ اپنے ضروریات کو پہچانتا ہے مگر جو عطا کرنے والا ہے وہ اس کی ضرورت کو بھی جانتا ہے اور اپنی مصلحت کو بھی جانتا ہے۔ جو اس وقت سے عطا کرتا رہا ہو، بلا سوال دیتا رہا ہو اس کے بارے میں یہ شکایت کی جائے کہ مانگتے ہیں اور دیتا نہیں ہے، اتنے تجربات کو اتنی آسانی سے بُھلا دینا یہ انسان کے حافظے کی وہ کمزوری ہے کہ جس کے بعد پھر شرافت باقی نہیں رہتی ہے۔ تو کرم کی ایک پہچان ہے العطاء قبل السوال کریم وہ ہوتا ہے جو سوال سے پہلے ہی عطا کر دے۔

دوسری تعریف کرم کی روایات میں یہ کی گئی ہے اِیثَارُ العِرضِ عَلَی المَالِ کرم کے معنی یہ ہیں کہ جب مال اور آبرو میں ٹکراؤ ہو جائے تو انسان مال قربان کر دے مگر آبرو بچا لے۔ کریم اسی کو کہا جاتا ہے، شریف وہی ہوتا ہے جو مال اور عزّت کے ٹکراؤ میں عزّت کی پرواہ کرے، مال کی پرواہ نہ کرے۔ یہ بات ہمارے یہاں بطور محاورہ تو ہمیشہ کہی جاتی ہے مگر منزلِ عمل میں انسان کہاں تک کامیاب ہوتا ہے یہ ایک مستقل موضوع ہے جس کے عرض کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ کسی آدمی سے اگر آپ پوچھیں کہ جان اور مال کا رشتہ کیا ہے تو دور قدیم کی یہ مثل چلی آ رہی ہے کہ جان کا صدقہ مال ہے۔

ہر آدمی کہتا یہی ہے کہ جان کا صدقہ مال ہے۔ یعنی جان اور مال میں معاملہ آجائے تو جان کو بچالیا جائے گا اور مال کو قربان کردیا جائے گا۔ لیکن دیکھا یہی جاتا ہے کہ جب زندگی میں کوئی ایسا موقع آجاتا ہے تو انسان جان دے کے مال کماتا ہے مال دے کے جان کیا بچائے گا۔ اپنی زندگی کی پرواہ نہیں کرتا، اپنی صحت کی پرواہ نہیں کرتا، اپنے حالات کی پرواہ نہیں کرتا۔ جہاں معلوم ہو جائے کہ چار پیسے ملنے والے ہیں تو انسان جان دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور اس کے بعد بھی یہ کہتا ہے کہ جان کا صدقہ مال ہے جب کہ ہمیشہ مال پر جان کو قربان کرتا رہا ہے۔ لہٰذا یہ بات تو بہت آسان ہے کہ عزت اور مال کے ٹکراؤ میں تقاضائے کرم و شرافت یہ ہے کہ مال کو قربان کردیا جائے، عزت کو بچالیا جائے مگر واقعاً انسان ایسا کریم ہوتا ہے یا نہیں ہوتا' واقعاً انسان میں یہ شرافت پائی جاتی ہے یا نہیں؟ یہ اک مسئلہ جس کا فیصلہ ان اجتماعات میں نہیں ہو سکتا ہے۔ جب زندگی میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے تب یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شریف کون ہے جو مال کو لٹا کے آبرو بچالیتا ہے۔ اور وہ کون لوگ ہیں جو مال دنیا کو حاصل کرنے کے لئے اپنی عزت و آبرو کی فکر بھی نہیں کرتے ہیں ان تلخ باتوں کو چھیڑنا نہیں چاہتا لیکن بہر حال کچھ ذمہ داریاں ہیں لہٰذا ان کے بارے میں کچھ اشارات آپ کی خدمت میں پیش کرنا ہیں۔ ہماری زندگیوں میں کتنے ایسے مواقع آتے ہیں جہاں ہماری عزت میں اور مال میں ٹکراؤ ہو جاتا ہے ہم یہ سوچتے ہیں۔ یہ ارباب ہے یہ مالک ہے اگر دو باتیں کہہ بھی دے گا تو کیا حرج ہے تنخواہ تو سلامت رہے گی۔ یہ ہمارے بارے میں کوئی غلط تبصرہ کردے گا تو کوئی بات نہیں ہے پیسہ تو برقرار رہے گا۔ یہ ذرا ہمیں ذلیل بھی کردے گا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے آمدنی تو بڑھ جائے گی۔ ہماری نگاہ میں عزت آبرو دے کے مال کمانے والے کچھ مخصوص افراد ہوتے ہیں حالانکہ اگر زندگیوں کا تجربہ کیا جائے تو لاکھوں کروڑوں افراد جو غلط پیشوں میں نہیں ہیں مگر یہی کاروبار کرتے ہیں اور یہی راستہ اختیار کرتے ہیں اس لئے کہ ان کے سامنے بھی جب مال و آبرو کا مقابلہ ہو جاتا ہے تو آبرو دینا گوارا کرلیتے ہیں مال کو چھوڑنا گوارا نہیں کرتے ہیں۔ ایسے امتحانات کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ پروردگار کی نگاہ میں وہ عزت و شرافت و کرم والے کون ہیں

جو ہر مال کو لٹا سکتے ہوں مگر آبرو کی قربانی کو برداشت نہ کر سکتے ہوں۔ میں ابھی خاتمۂ کلام میں جب کرم سید الشہداءؑ کا ذکر کروں گا تو ان ساری باتوں کی مثالیں آپ کے سامنے عرض کروں گا۔ لیکن ابھی تو میں تذکرۂ کرم اس اعتبار سے کر رہا ہوں کہ روایاتِ اسلامی میں کرم کے معنی کیا ہیں اور کرم کا تصور کیا ہے، کسے کریم اور شریف کہا جاتا ہے یہ ایک مسئلہ ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کریم اور شریف کا کردار کیا ہوتا ہے اس کے بارے میں دو لفظیں ہیں مولائے کائنات کی، میں چاہتا ہوں میرے عزیز تمام سننے والے اور میری بہنیں بیٹیاں بھی متوجہ رہیں یہ دو باتیں شائد ہماری زندگی کے لئے یہ نئے سبق ہیں جن کی طرف ہم متوجہ نہیں ہیں ورنہ امام نے تو یہ باتیں چودہ سو سال پہلے فرمادی تھیں لیکن شائد ہماری توجہ نہ ہو۔ ایک فقرہ ہمارے کرم کے بارے میں مولائے کائناتؑ نے ارشاد فرمایا کہ دیکھو اگر تم نے کسی آدمی پر کرم کیا ہے، مہربانی کی ہے کسی کو کچھ دیدیا ہے تو تم نے دے کے اپنی عزتِ نفس کا مظاہرہ کیا ہے یعنی اپنی شرافت کو پہچنوایا ہے، اپنے کرم کے ذریعہ اپنے کمال کو پہچنوایا ہے ——— کرم کے ذریعہ اپنی عزت کا مظاہرہ کیا ہے، اپنی شرافت کا مظاہرہ کیا ہے، اپنے کمال کا مظاہرہ کیا ہے تو مقابل والے کو دیا کیا ہے جس کا شکریہ چاہتے ہو؟ سوائے معصوم کے اس نکتے کو کوئی سمجھا نہیں سکتا، سمجھنے والے نہیں پیدا ہوتے سمجھانے والے کہاں پیدا ہوں گے۔ اگر آپ کسی غریب کے ہاتھ پر چار پیسے رکھ دیں تو منتظر رہتے ہیں کہ وہ شکریہ ادا کرے۔ اگر ہم نے کسی کو کوئی کام دلوادیا، کوئی احسان کر دیا، کوئی نوکری دلوادی، کاروبار کرادیا، لائسنس دلوادیا، کوئی کام بھی کر دیا، کسی بچے کی فیس دے دی زندگی بھر انتظار رہا کہ ہم نے احسان کیا ہے یہ شکریہ ادا کریں حالانکہ مولا فرماتے ہیں کہ تم نے جو کچھ بھی کیا ہے اس کی قیمت تو لے لی، اس کا کریڈٹ تو لے لیا جیسے ہی اچھا برتاؤ کیا سب سمجھ گئے تم کریم ہو سب کو اندازہ ہوگیا تم شریف ہو تو تم نے اپنی شرافت کا مظاہرہ کر دیا، یہی تمہارے عمل کی قیمت تھی۔ اگر تم نے عزت دی ہوتی اور اس کی قیمت مانگتے تو ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ تم نے دیا کیا ہے، اپنی عزت کا مظاہرہ ہی تو کیا ہے یعنی اپنی

عزّت کو منوالیا، اپنی شرافت کو منوالیا، اپنے کرم کو منوالیا، جب مقابل والے نے تمھاری عزّت و شرافت و کرم کو مان لیا یہی تمھارے کرم کی قیمت ہے' اب اس کے بعد اُس سے کیا چاہتے ہو، معاوضہ تو اُس چیز کا مانگا جاتا ہے جو کسی کو دیا جائے۔ تم نے عزّت دی نہیں ہے تم نے عزّت منوائی ہے، تم نے شرافت دی نہیں ہے تم نے شرافت کا اقرار لیا ہے۔ بس یہی تمھارے کرم کے لیے کافی ہے۔ بات کہنے میں بہت آسان دکھائی دیتی ہے لیکن اگر ہر انسان اپنی فطرت کا جائزہ لے تو میری گستاخی کو معاف کریں گے۔ آپ کو شائد کروڑوں میں کوئی ایک انسان ایسا مل جائے جو نیک سلوک کرنے کے بعد' اچھا برتاؤ کرنے کے بعد کم سے کم شکریہ کا انتظار نہ کرے۔ ہو سکتا ہے میں آپ کے ساتھ برتاؤ کرنے کے بعد مقابلہ میں برتاؤ کا انتظار نہ کروں کہ میں نے چائے پلائی ہے تو آپ بھی چائے پلائیں، میں نے ناشتہ کرایا ہے آپ بھی ناشتہ کرائیں، میں نے کھانا کھلایا ہے تو آپ بھی مجھے مدعو کریں۔ ہو سکتا ہے یہ انتظار نہ کروں لیکن اتنا انتظار تو انسان کو بہرحال رہتا ہے کہ اگر ہم نے کوئی اچھا برتاؤ، اچھا سلوک کسی کے ساتھ کیا ہے تو کم سے کم ایک شکریہ تو کہہ دے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آدمی نہیں کہتا ہے تو آدمی ناراض ہو جاتا ہے۔

ایک مردِ مومن نے مجھ سے کہا کہ مسلمان معاشرہ سے تو کافر معاشرے اچھے ہیں' اسلئے کہ کافر معاشروں میں بہرحال یہ بات پائی جاتی ہے کہ ایک ادنیٰ سا بھی برتاؤ اگر آپ ان کے ساتھ کر دیجئے' تو پلٹ کر تھینک یو (THANK YOU) تو کہتے ہی ہیں' کم سے کم پلٹ کر تھینکس (THANKS) تو کہتے ہی ہیں مگر ان مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ آپ پانی پلا دیجئے' کوئی جواب نہیں ملتا ہے، کھانا کھلا دیجئے' کوئی ذکر نہیں آتا ہے،' کوئی اچھا برتاؤ کر دیجئے' پلٹ کر کوئی نوٹس ہی نہیں لیتے ہیں، ان مسلمانوں سے تو کافر ہی اچھے ہیں۔ میں نے کہا کسی سے مقابلہ نہ کیجئے'، نہ کمال یہ ہے نہ کمال وہ ہے اس لئے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ بطور عادت ہے بطور تشکر نہیں ہے۔ بچپنے سے عادت ڈال دی گئی ہے وہی عادت دُہرائی جارہی ہے۔ کہنے لگے یہ آپ کیوں کسی پر الزام لگا رہے ہیں۔ میں نے کہا میرے پاس ثبوت ہے۔ میں نے ایک قطرہ، ایک گھونٹ، ایک پیالی چائے پلائی تو مجھ سے دس مرتبہ

کہا تھینکس لاٹ آف تھینکس' (THANKS LOT OF THANKS) اور جس نے وجود دے دیا زندگی دے دی، حیات دے دی، کبھی ایک سجدہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے، ایسے بے ایمانوں کو شکر گذار کہا جائے گا؟ ــــ صلوات

شرافتوں کو آداب سے نہیں پہچانا جاتا احساسات سے پہچانا جاتا ہے۔ بہر حال ہر انسان میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ کرم کرنے کے بعد، اچھا برتاؤ کرنے کے بعد کم سے کم شکریہ کا منتظر رہتا ہے۔ یہ کمزوری آپ میں بھی ہے، یہ کمزوری مجھ میں بھی ہے، یہ کمزوری ہر انسان میں پائی جاتی ہے اور اس کی ایک میرے پاس قرآنی دلیل ہے۔ توجہ فرمائیں گے۔ میرے موضوع سے متعلق ہے اس لئے گذارش کر رہا ہوں۔ میرے پاس اس دعوے کی قرآنی دلیل ہے۔ اگر ہر انسان ایسا باکمال ہوتا جو کرم کرنے کے بعد شکریہ کا انتظار نہ کرتا تو پروردگار کبھی اپنے بندوں کی تعریف میں یہ بات نہ کہتا۔ تم سب کی مشترکہ کمزوری یہ ہے کہ احسان کرنے کے بعد شکریہ کے منتظر رہتے ہو۔ میرے پاس کچھ ایسے بندے بھی ہیں، جو فاقہ کرنے کے بعد، روزے رکھنے کے بعد، پانی سے افطار کرنے کے بعد، برابر تین دن تک کھلاتے رہے مگر وہ کہہ رہے تھے لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا نہ کوئی جزا چاہیے نہ کوئی شکریہ چاہیے۔ یہ وہ انفرادی کردار ہے جس کے لئے سورہ اُتارا جاتا ہے۔ صلوات

تو مولائے کائنات کا ارشاد گرامی ہے کہ ایک کریم انسان، ایک شریف انسان کی پہلی پہچان یہ ہے کہ جب انسان کچھ کرتا ہے تو اس کے مقابلے میں کسی شکریہ کا مطالبہ نہیں کرتا، کسی شکریہ کا انتظار نہیں کرتا، یہ تو خود ہی ایک شکریہ پروردگار ہے کہ اس نے کچھ دیا ہے تو ہم کسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔ علم دیا ہے تو لوگوں کو علم دیں، مال دیا ہے تو لوگوں کو مال دیں۔ اگر طاقت دی ہے تو لوگوں کے کام آئیں۔ اگر اللہ نے صلاحیت دی ہے تو اس صلاحیت کو بندگانِ خدا کی راہ میں صرف کریں یہ تو خود ہی ایک شکریہ ہے اب اس کے بعد مزید شکریہ کس بات کا۔ مزید تقاضہ یا انتظار کس بات کا ــــ دوسری بات جو مولائے کائنات ؑ نے ارشاد فرمائی ہے میرے عزیزو! اس لفظ کو یاد رکھئے گا۔ عربی زبان کے اعتبار سے لفظ کرم کے مقابلے میں

جو لفظ آتا ہے وہ ہے لفظ لئیم یعنی جو صاحب کرم ہوتا ہے اسے کریم کہا جاتا ہے جسمیں یہ بات نہیں پائی جاتی ہے اور اس کے خلاف ہوتا ہے اسے لئیم کہا جاتا ہے۔ ہماری اُردو زبان میں شریف اور رذیل جس کو لوگ نہیں جانتے ہیں تو ذلیل کہہ دیا کرتے ہیں، حالانکہ ذلیل الگ چیز ہے۔ شریف کے مقابلے میں جو لفظ آتا ہے وہ لفظ ہوتا ہے رذیل۔ کبھی آدمی شریف ہوتا ہے کبھی رذیل ہوتا ہے۔ مولاؑ نے فرمایا کبھی انسان کریم ہوتا ہے کبھی انسان لئیم ہو جاتا ہے اور ان دونوں کی پہچان میں عجب بات فرمائی ہے۔ خدا جانتا ہے اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ کتنے باریک نکات انسانی کردار کے ہیں، نہ معصوم کے علاوہ کوئی جانتا ہے نہ کوئی بتا سکتا ہے۔ ایک عجب فقرہ ارشاد فرمایا۔ فرمایا کریم انسان وہ ہوتا ہے جو کرم کو اپنے اوپر ایک قرض سمجھتا ہے۔ ہم شریف ہیں تو شرافت کا برتاؤ کرنا شرافت کا اظہار کرنا یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ لہٰذا اگر ہم شرافت کا برتاؤ کر رہے ہیں تو جو کرم کا قرض ہمارے ذمّے ہے اُسے ادا کر رہے ہیں۔ توجہ کریں۔ جو کریم ہے وہ سمجھتا ہے کہ جب پروردگار عالم نے ہم کو شریف بنایا ہے تو اس شرافت کی ذمّہ داری ہم پر ہے کہ ہم شرافت کا مظاہرہ کریں اور دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کریں تو واقعاً جو شریف ہوتا ہے وہ اُسے اپنے ذمّہ قرض سمجھتا ہے جس کو ادا کرتا ہے۔ اور جو رذیل ہوتا ہے، پست ہوتا ہے لئیم ہوتا ہے۔ وہ اپنی شرافت کو اپنا قرض دوسرے پر سمجھتا ہے جسکی قیمت وصول کرنا چاہتا ہے ــــــــ یعنی ہم اگر کسی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں تو یہ ہماری ایک ذمہ داری ہے۔ یہ ایک قرض ہمارے ذمہ ہے جو ہم ادا کر رہے ہیں۔ یہ کسی کو قرض دیا نہیں جا رہا ہے کہ جس کا معاوضہ لیا جا رہا ہو یا معاوضہ مانگا جا رہا ہو۔ یہی فرق ہے ایک انسان شریف میں اور ایک انسان رذیل میں ـــ اور ظاہر ہے کہ کرم اسلامی نقطۂ نگاہ سے اتنی عظیم شے ہے کہ دین پروردگار میں سرکار دو عالمؐ کی زبان سے اس قانون کا اعلان کیا گیا ہے کہ دیکھو یہ وہ چیز ہے جو نگاہِ پروردگار میں عزیز ہے، خدا کو پسند ہے چاہے وہ اسلام کے ساتھ جمع ہو اور چاہے کفر کے ساتھ جمع ہو ــــــ یعنی مسلمان اگر کریم ہے تو دُہری عزتوں کا حقدار ہے بہ اعتبار کرم بھی اور بہ اعتبار دین و مذہب و عقیدہ بھی۔

لیکن اگر کوئی انسان مسلمان نہیں ہے مگر اپنی قوم میں صاحب عزّت ہے، صاحب کرم ہے، صاحب شرافت ہے تو اس کی شرافت کا احترام بھی ہونا چاہیئے چاہے مسلمان نہ ہو۔ سرکارِ دو عالمؐ کا ارشاد گرامی ہے جس کے الفاظ روایات میں اکرموا کریم کل قوم۔ کسی قوم کا کوئی کریم و شریف انسان، ہو تمھاری ذمہ داری ہے کہ اس کی قومی شرافت کا خیال کر کے اس کا احترام کرو تا کہ کرم محترم بنے، لوگ سمجھیں کہ شرافت قابلِ احترام چیز ہے، مسلمان بھی ہو جائے گا تو دُہرے احترام کا حقدار ہو جائے گا۔ لیکن اگر مسلمان نہ بھی ہو تو اس کی شرافت قومی کا احترام ہونا چاہیئے یہ پیغمبر اسلامؐ نے ارشاد فرمایا اگر پیغمبرؐ کے بعد لوگ اس معنی کو سمجھے یا سرکارِ دو عالمؐ نے جب سمجھانا چاہا تو شائد اسی دن حضور کی زبان سے سُن لیا سب نے مگر حضور نے کیوں سمجھایا، کب کے لئے سمجھایا شاید لوگ نہ سمجھے اس کا تاریخی ثبوت بھی خود تاریخوں کے اندر موجود ہے کہ سرکارِ دو عالمؐ کے بعد جب مسلمانوں میں جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا اور فتوحات کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ یہ علاقہ فتح ہوا، وہ علاقہ فتح ہوا، وہ علاقہ فتح ہوا تو انھیں فتوحات کے ذیل میں جب سرزمین فارس کو فتح کیا گیا اور وہاں سے کچھ لوگ گرفتار کر کے لائے گئے، جو بڑے گھرانے کے لوگ تھے۔ بادشاہوں کے گھرانے کے لوگ تھے اور پکڑ کے قیدی بنا کے لائے گئے، اور حکومت وقت کے سامنے یہ مسئلہ آیا کہ جن لوگوں نے بغاوت کی ہے، اسلام قبول نہیں کیا ہم نے ان کے علاقہ پر حملہ کیا اور وہاں سے پکڑ کر ان لوگوں کو لائے ہیں۔ یہ بادشاہ کے گھرانے کے مرد ہیں لڑکے ہیں اور یہ بادشاہ کے گھرانے کی لڑکیاں ہیں جنھیں ہم قیدی بنا کر لائے ہیں ——

جب حکومت وقت کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا تو تاریخ اسلام بیان کرتی ہے کہ حاکم وقت نے فیصلہ دے دیا کہ جتنی عورتیں گرفتار ہو کے آئی ہیں انھیں بیچ دیا جائے اور جتنے مرد قیدی بن کے آئے ہیں انھیں غلام بنا لیا جائے۔ اس لئے کہ کنیز اور غلام بیچے تو جا ہی سکتے ہیں —— لہٰذا انھیں فروخت کر دیا جائے اور انھیں اپنی غلامی میں شامل کر لیا جائے۔

جیسے ہی یہ فیصلہ حکومت وقت نے سُنایا اور مولائے کائناتؑ نے حاکم وقت کا یہ فیصلہ سُنا فرمایا یہ تو تمھارا فیصلہ ہو گیا یہ بھی یاد ہے کہ پیغمبرؐ نے کیا فیصلہ کیا تھا —— اس کے

معنی یہ ہیں کہ الفاظ سب کے کان میں پڑے ہوئے ہیں مگر کوئی سمجھا کوئی نہ سمجھا اور نہیں پر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ جب پیغمبرؐ کی بات لوگ سمجھ نہیں پاتے ہیں جو ہمارے ہی جیسے بشر ہیں۔ وہ پیغمبرؐ جس کو اپنا جیسا بشر کہا جاتا ہے جب اس کے کلام کے معنی سمجھ میں نہیں آتے ہیں تو اس کے بعد یہ دعویٰ کہ کلام خدا سمجھنے کے لئے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے کلام پیغمبر خدا سمجھنا سیکھو کلام خدا تو بعد میں سمجھ میں آئے گا۔ مولائے کائناتؑ نے فرمایا کیا تمھیں یاد نہیں ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے فرمایا تھا اکرموا کریم کل قوم۔ ہر قوم کے شریف کا احترام کرو، یہ شریف گھرانے کے قیدی ہیں، یہ شریف گھرانے کی بیٹیاں ہیں جنھیں قیدی بنا کر لایا گیا ہے۔ خبردار انھیں بیچنے کا ارادہ نہ کرنا۔ مولائے کائناتؑ نے خود اپنا کوئی فیصلہ نہیں سُنایا۔ ایک ایک لفظ ہے جو قابلِ توجہ ہے۔ مولاؑ نے خود اپنا فیصلہ نہیں سُنایا کہ ایک رائے آپ کی ہے، ایک رائے ہماری ہے۔ مولاؑ نے ان کے ارشاد کا حوالہ دیا جن کے سب کلمہ گو ہیں۔ یہ پیغمبرؐ کا سب کلمہ پڑھتے ہیں۔ یہ کیسا کلمہ ہے، یہ کیسی وراثت ہے، یہ کیسی نیابت ہے کہ پیغمبرؐ کی جگہ پر بیٹھنے کے بعد بھی پیغمبرؐ کا کلام یاد نہ رہ جائے۔ پیغمبرؐ کا کلمہ پڑھنے کے بعد بھی ان کی تعلیمات یاد نہ رہ جائیں۔ فرمایا خبردار سرکار دو عالمؐ فرما گئے ہیں کہ ہر قوم کے شریف کا احترام ہونا چاہیئے۔ لہٰذا یہ شریف زادیاں ہیں یہ بیچی نہیں جا سکتی ہیں، انھیں بازار میں فروخت نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اب ایک لفظ میں کہتا ہوں۔ معنی آپ گھر جا کے سوچیئے گا اور پہچانیئے گا کہ ایک مقام پر دو انسانوں کے دو فیصلے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہے اس نے یہ فیصلہ کیا کہ بیچ ڈالا جائے، مولاؑ نے پیغمبرؐ کا حوالہ دے کے یہ فیصلہ سنایا کہ حضورؐ فرما گئے ہیں کہ خبردار نہ بیچا جائے۔ آپ جانتے ہیں ہر مغلوب شکست خوردہ قوم کا فطری مزاج یہ ہوتا ہے کہ جو انسان ہار جاتا ہے، مغلوب ہو جاتا ہے، گرفتار ہو جاتا ہے، قیدی بن جاتا ہے وہ ہمیشہ ہر ایک کو التماس آمیز نگاہ سے دیکھتا ہے شاید کوئی رحم کھانے والا پیدا ہو جائے۔ توجہ کریں۔ شاید کوئی رحم کھانے والا سامنے آ جائے۔ جو جتنا شدید برتاؤ کرتا جاتا ہے اُس سے اتنی ہی نفرت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اور جو ایک حرف ترحم،

ایک حرف مرحمت، ایک کلمہ مہربانی کہہ دیتا ہے اس کی جگہ خود بخود دل میں پیدا ہو جاتی ہے یعنی اقتدار گردنوں کو قیدی بناتا ہے، مہربانی دلوں پر قبضہ کرتی ہے۔ شائد اسی کا تجربہ چودہ صدیوں میں کیا گیا کہ فتح کسی اور نے کیا تھا اور کلمہ کسی اور کا پڑھا جا رہا ہے صلوات یہ ہے قدر کرم جس کی طرف سرکار دو عالمؐ نے اشارہ کیا۔ میں اپنی گفتگو کے تین مراحل سے گذر چکا۔ کرم کے معنی بھی معلوم ہو گئے۔ شان کریم کیا ہوتی ہے یہ مولائے کائناتؑ کے ارشاد گرامی کی روشنی میں معلوم ہو گئی۔ اور کریم کا احترام بہرحال ہونا چاہیے۔ جو حضور سرور کائناتؐ فرما گئے ہیں، جس کا حوالہ مناسب وقت آنے پر مولائے کائنات نے امت اسلامیہ کے سامنے پیش کیا۔ اب اس سلسلے میں بات کو سرکار سید الشہداؑ تک پہنچانے سے پہلے ایک لفظ ضمناً گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ جب تاریخ کرم کا ذکر کیا گیا تو امام ترمذی نے ایک روایت نقل کی ہے اور فرمایا ہے ـــــــ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کرم خاندانوں میں چلا کرتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کرم اور شرافت خاندانوں میں چلا کرتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک بندۂ خدا ایسا بھی ہے کہ جس کی تعریف روایات میں کی گئی ہے اور اس کے نسلی کرم اور نسلی شرافت کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا اللہ کے بندوں میں ایک بندہ تھا جس کی تعریف یہ ہے الکریم۔ ابن الکریم۔ ابن الکریم۔ ابن الکریم۔ ایک ایسا بندہ بھی ہے کہ جس کے سلسلۂ نسب میں چار مرتبہ یہ لفظ کریم استعمال ہوا ہے کریم۔ ابن کریم۔ ابن کریم۔ ابن کریم اور یہ امتیاز خدا نے دیا تھا جناب یوسفؑ کو ـــــــ گویا روایات کی روشنی میں امام ترمذی نقل کرتے ہیں کہ یہ امتیاز جناب یوسفؑ کا تھا اور واقعاً جناب یوسف ایسے کریم تھے کہ جیسے ہی مصر کے خزانوں پر قبضہ ملا ویسے ہی خزانوں کے دروازے کھول دئے، خزانوں کے دہانے کھول دئے۔ کوئی بندۂ خدا محروم نہ رہ جائے۔ لہٰذا جناب یوسفؑ کا کرم لوگوں نے پہچانا اور اس کے بعد روایات نے پہنچوایا یہ تنہا جناب یوسفؑ کا کرم نہیں ہے ان کے باپ جناب یعقوبؑ وہ بھی ویسے ہی کریم تھے، ان کے والد بزرگوار جناب اسحاقؑ وہ بھی ویسے ہی کریم تھے، ان کے والد بزرگوار جناب ابراہیم ویسے ہی کریم تھے تو جناب ابراہیمؑ۔ جناب اسحاقؑ۔ جناب یعقوبؑ اور آخر میں

جناب یوسفؑ۔ تو کرم جناب یوسفؑ کو دنیا نے پہچانا۔ مگر اسی کرم سے یہ بھی پہچانا گیا کہ یہ کرم ذاتی نہیں ہے یہ کرم نسلوں میں آیا ہے، یہ شرافت نسلوں میں آئی ہے چار پشتوں سے شرافت جناب یوسفؑ کے خاندان میں چل رہی ہے۔ چار پشتوں سے کرم چل رہا ہے تو عزیزو مجھے ایک لفظ کہنا ہے اگر روایات کی روشنی میں جناب یوسفؑ کا یہ امتیاز ہے کہ یوسف کریم ہیں، باپ کریم ہے، دادا کریم ہے، پردادا کریم ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا کرم امتیازی کہا جاتا ہے۔ جس کا کرم چار پشتوں تک چلے ——————

—————— جس کا کرم چار پشتوں میں چل جائے اس کا کرم ایسا امتیازی قرار دیا جاتا ہے کہ روایات میں اس کے کردار کا امتیاز یہ بیان کیا جاتا ہے۔ اب میں اُس خاندان کے بارے میں کیا کہوں۔ جس کے آخر سے اگر آپ شروع کریں تو آخر سے لے کر پیغمبر اسلامؐ تک چلے جائیے اور آگے بڑھ کے ابراہیمؑ تک چلے جائیے پورا سلسلہ، سلسلۂ کرم ہے۔ بارہواں گیارہویں کا بیٹا، گیارہواں دسویں کا لال۔ وہ نویں کا بیٹا اور جو ہے وہ کریم ابن کریم ابن کریم۔ وہاں تو چار پہ جا کے سلسلہ رُک گیا، یہاں تو سلسلہ رُکنے والا نہیں ہے۔ صلوات

تو عزیزانِ محترم میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ کرم کی اس مختصر تعریف اور بیان کی اس مختصر تمہید کے بعد آئیے ایک نظر ڈالیں سرکار سید الشہداءؑ کے کردار پر اور آپ کے کرم پر۔ یہ بڑی طویل داستان ہے اس کے عرض کرنے کے لئے بڑا وقت چاہئے لیکن میں اجمالی خاکہ آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں اس کے بعد کتابیں آپ پڑھیں گے، کتابوں میں تفصیلی حالات آپ کو مل جائیں گے —— امام حسینؑ کے کرم کے پہلے تین رُخ پہچانئے اور اس کے بعد ایک مختصر تفصیل بھی گذارش کروں گا۔

امام حسینؑ کی پوری زندگی ابتدا تا انتہا، آغاز تا انجام ——————
کرم کی زندگی ہے اور سراپا کرم ہے کردار سید الشہداء۔ ابتدا دیکھئے تو کرم، انتہا دیکھئے تو کرم —— دو جملے تو سب کو یاد ہیں اور بچہ بچہ جانتا ہے کہ جب ابتدا میں دنیا میں قدم رکھا تو حسینؑ کا کرم زمین والوں پر نہ دیکھا آسمان والوں پر دیکھا۔ وہ مدتوں سے عتاب میں مبتلا

جو جزیرے میں پڑا ہوا تھا جب گہوارۂ حسینؑ کے پاس آ گیا تو عتابِ الٰہی برطرف ہو گیا۔ اب جو پرواز کر کے چلا تو آواز دیتا ہے مَنْ مِثْلِیْ اَنَا عَتِیْقُ الْحُسَیْنِؑ ارے میرے جیسا کون ہو گا، میں حسینؑ کا آزاد کیا ہوا ہوں۔ یہ ولادت کے موقع پر حسینؑ کا کرم ہے۔ دنیا میں آئے تو پہلا کرم آسمان والوں پر کیا اور جب جانے لگے تو حر کو علیہ السّلام بنا کے گئے۔ وہ ولادت کے بعد کا کرم تھا یہ شہادت کے پہلے کا کرم ہے اور شہادت کے بعد کا کرم اگر دیکھنا ہے تو حسینؑ نے ارض کربلا کو خرید کے جب واپس کیا ہے تو فرمایا جتنے میرے زیارت کرنے والے آتے رہیں دیکھو ان کی مہمان نوازی میں فرق نہ آنے پائے، سامنے دستر خوان پر بٹھا کے کھلا دینا یہ دنیا کے کریموں کا کام ہے، قیامت تک کے انسانوں کا انتظام کر دینا یہ کرم حسینؑ ابن علیؑ کا کمال ہے۔ صلوات

اور یہ وہ کرم سید الشہداءؑ تھا جس کو دوست نہیں دشمن بھی پہچانتا تھا۔ اپنے نہیں اغیار بھی اس کرم کو پہچانتے تھے۔ اس گھرانے میں ایک پورا سلسلۂ کرم ہے اور حسینؑ کی زندگی سراپا کرم ہے جس کا تاریخی واقعہ دو لفظوں میں اپنے عزیز بچوں اور نوجوانوں کے لئے گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ شام کے حاکم نے ہر ایک کے کردار کا امتحان لینے کے لئے اور ہر ایک کی اوقات کو واضح کرنے کے لئے اس کا جو مقصد رہا ہو ذاتی مقاصد سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں واقعہ کا ایک پہلو عرض کرنا چاہتا ہوں۔ حاکم شام نے اس دور کی جو عظیم ترین شخصیتیں کہی جاتی تھیں سب کے پاس تحفے بھیجے، ہدیے بھیجے بظاہر کرنے کے لئے کہ میرے قبضے میں اگر بیت المال ہے، میرے قبضے میں اگر مالِ دنیا ہے تو میں کسی کو اس بیت المال کے مال سے محروم نہیں رکھنا چاہتا۔ جو بڑا انسان ہے، جو بڑی شخصیت ہے، جو بھی کسی بڑے باپ کا بیٹا ہے اس پہ یہ مہربانی کی جائے تا کہ یہ اندازہ ہو جائے یہ سب تو بڑے بڑے ہیں میں کتنا بڑا ہوں جو ان سب پر مہربانی کر رہا ہوں، جو ان سب کے مقابلے میں اپنے کرم کا مظاہرہ کر رہا ہوں اس لئے سب کے پاس کچھ نہ کچھ بھیجا تاریخ یونہی بیان کرتی ہے، واقعہ کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا اور نہ

سُن لیں۔ ہر ایک کے پاس کچھ نہ کچھ ہدیہ، تحفہ اور مال بھیج دیا۔ ان افراد میں جن کے پاس مال دنیا بھیجا ان میں سے ایک امام حسینؑ بھی تھے۔ روایت کہتی ہے جہاں ہر بڑے باپ کے بیٹے کے پاس کچھ نہ کچھ مال دنیا بھیجا وہاں کچھ ہدیہ یا تحفہ یا مال دنیا امام حسینؑ کے پاس بھیجا اب ہر ایک کو حیرت ہے اُن کے گھر اگر بھیجا تو بات سمجھ میں آتی ہے اُسی سلسلے کے وہ اُسی سلسلے کے آپ، ______________________ وہی گھرانا اُن کا، وہی گھرانا آپ کا۔ وہی مزاج اُن کا، وہی مزاج آپ کا۔ مگر اِن سے تو کہیں سے بھی آپ سے کوئی رابطہ نہیں ہے اِن سے تو کوئی تعلق نہیں ہے اِن کے گھر کیوں بھیج دیا؟ کہا میں صرف اس لئے بھیج رہا ہوں کہ میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ پہچانو کہ جن کے گھر یہ مال جا رہا ہے ان کا طریقہ کار کیا ہے۔ مال پانے کے بعد کیا کرے گا اور مجھے پہچانو کہ میں شخصیتوں کو کتنا پہچانتا ہوں۔ کتنے مقاصد ہیں اس چار پیسے کے اندر۔ اپنے کرم کا مظاہرہ بھی ہو جائے، اپنی معرفت اور مردم شناسی کا مظاہرہ بھی ہو جائے۔ اس لئے کہ میں ایک ایک کے بارے میں جانتا ہوں کہ کس کو پیسہ مل جائے تو کیا کرے گا۔ لہٰذا ہر ایک کے بارے میں پیسہ بھیجتے ہوئے، ہدیہ بھیجتے ہوئے تبصرہ بھی کر دیا تاکہ لوگ جائیں اور اس کے بعد اندازہ کریں کہ میں کتنا مردم شناس ہوں، کتنا لوگوں کے مزاج کو پہچانتا ہوں کہ جیسا میں نے کہا تھا سب ویسے ہی نکلے جیسا میں نے کہا تھا۔ اب ہر ایک کے واسطے ہدیہ معین کیا اور ہر ایک کے کردار پر تبصرہ کیا تو تاریخ کا یہ فقرہ ہے کہ لوگ منتظر ہیں کہ دیکھیں حسینؑ کے بارے میں کیا کہتے ہیں تو حاکم شام نے کہا اَمَّا الْحُسَیْنُ فَیَصْرِفُهٗ عَلٰی اَیْتَامِ مَنْ قُتِلَ مَعَ اَبِیْهِ فِی الصِّفِّیْنِ میں جانتا ہوں کہ اگر حسینؑ کے ہاتھ میں مال آگیا تو پہلے یتیموں پر صَرف کریں گے۔ توجہ کریں۔ اگر حسینؑ کے ہاتھ میں کوئی مال آجائے تو پہلے جو راہِ خدا میں مرنے والے ہیں، شہید ہونے والے ہیں ان کے یتیموں پر صرف کریں گے۔ لوگوں نے کہا آپ کو کیسے معلوم ہو گیا؟ کہا جاؤ دیکھو کرتے کیا ہیں۔ تو تاریخ یونہی بیان کرتی ہے کہ مال بھی بھیج دیا اور اپنے جاسوس بھی بھیج دیئے تو لوگوں نے دیکھا کہ جیسے ہی مال قبضے میں آیا ویسے ہی اعلان کر دیا جو راہِ خدا کے شہیدوں کے، جو راہِ خدا کے مجاہدوں کے یتیم

ہیں انھیں بلایا جائے اور یہ مال ان میں تقسیم کر دیا جائے۔ اب پلٹ کے لوگ آئے اور کہا حضور آپ محل میں بیٹھ کے، قصر میں بیٹھ کے اتنے مردم شناس ہیں کہ جو آپ نے فرمایا تھا واقعاً ویسا ہی ہوا۔ نہ اپنے واسطے کھانے کا انتظام کیا نہ اپنے لیے کپڑے کا انتظام کیا، نہ اپنے گھر والوں کو دیا نہ اپنے چاہنے والوں کو دیا، نہ حاشیہ نشینوں کو دیا نہ کوئی جماعت بنانے کا انتظام کیا بلکہ جو ایتام تھے ان پر تقسیم کر دیا یعنی جیسا آپ نے کہا تھا ویسا ہو گیا۔ تو حاکم شام نے نہایت ہی غرور کے ساتھ کہا تم نہیں پہچانتے ہو قریش کو میں پہچانتا ہوں۔ تم اس گھرانے کو نہیں جانتے ہو، اس گھرانے کی صفتوں کو میں پہچانتا ہوں۔ ایک مرتبہ یہ بات بیٹے کے بارے میں سنی ـــــــ اور خود حاکم شام نے حوالہ دیا کہ میں جانتا ہوں جو صفین میں مارے گئے ان شہیدوں کے یتیموں پر صرف کیا جائے گا۔ یعنی جب ان شہیدوں کے یتیم سامنے آئے تو حسینؑ کے کردار کا اقرار دیکھنے میں آیا ـــــ اور جب صفین کا معرکہ ہو رہا تھا تو ان کے باپ کا کردار دیکھنے میں آیا۔ کہا دیکھو اگر علیؑ کا قبضہ دریا پر ہو گیا ہے تو پریشان نہ ہونا، علیؑ کسی پیاسے پر پانی بند نہ کریں گے۔ صلوات

لیکن ممکن تھا کہ کوئی انسان سوچتا کہ بالآخر جس پر صرف کیا گیا ہے وہ راہِ خدا کے مجاہدین کی اولاد ہیں، راہِ خدا میں شہید ہو جانے والوں کی اولاد ہیں۔ نہیں اس سے بالاتر جہاں کوئی شبہ، کوئی وہم نہ ہو سکے کہ شائد ان سے کوئی رابطہ اور کوئی تعلق ہو گا ــــــ اسامہ بن زید کی شخصیت تاریخ میں جانی پہچانی ہے اور ان کے شرف کے واسطے اتنا ہی کافی ہے کہ حضور سرورِ کائناتؐ نے اپنے آخری دورِ حیات میں جب لشکر تیار کیا تو فرمایا جَهِّزُوا جَيْشَ أُسَامَةَ۔ یعنی اب یہ آخری لشکر جو جانے والا ہے میری زندگی میں، سردار لشکر اسامہ ہوں گے ـ حالانکہ اسامہ کوئی سینیر آدمی نہیں تھے۔ میں نے یہ لفظ قصداً استعمال کیا ہے۔ معنی آپ سمجھیں گے۔ اسلامی تاریخ میں اسامہ کوئی سینیر شخصیت نہیں تھے نوجوان آدمی تھے اور حضورؐ نے ایک لشکر تیار کیا اور فرمایا کہ اس لشکر کے سردار اسامہ ہوں گے۔ جب حضورؐ نے یہ اعلان کر دیا تو لوگوں نے آ کے حضور کو سمجھانا شروع کیا۔ حضور یہ تو ابھی نوجوان ہیں، جوان ہیں، ہمارے سامنے کے بچے ہیں۔ ذرا ہماری شخصیتیں

دیکھئے، ہماری بزرگی دیکھئے، ہماری سینیرٹی دیکھئے۔ ہم ہوں گے لشکری فوجی اور یہ ہوگا سردار؟ حضور یہ کیا کر رہے ہیں، یہ کیا انتظام فرمایا۔ حضور نے فرمایا کوئی بات نہیں ہے، اسامہ بھی پہچانے ہوئے ہیں تم بھی پہچانے ہوئے ہو۔ کل جب میں نے ان کے باپ کو سردار بنایا تھا تو ان کے باپ کی سرداری تم سے قبول نہیں ہو رہی تھی آج بیٹے کو بنایا ہے تو وہ برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ حضورؐ یہ کہہ کے چلے گئے لیکن ہمیں اُمّت کا مزاج معلوم ہو گیا کہ جسے حضور بنائیں گے اسے امت برداشت نہ کرے گی۔ صلوات

یہ پیغمبرؐ کے بعد کا واقعہ نہیں ہے، پیغمبرؐ کے بعد اگر لوگ برداشت نہ کرتے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا، ابھی تو حضورؐ زندہ ہیں، سامنے موجود ہیں اور انھیں کو سمجھایا جا رہا ہے، انھیں کو مشورہ دیا جا رہا ہے۔ یہ نہیں وہ۔ وہ نہیں یہ۔ لیکن بہرحال سرکارِ دو عالمؐ کی نگاہ میں اسامہ کی واقعاً ایک شخصیت تھی اور اس سے بڑی شخصیت کیا کہ جتنی شخصیتیں ہیں سب فوجی اور اسامہ سردار لشکر۔ اس سے بڑی اور شخصیت کیا ہو سکتی ہے۔ حضور سرور کائناتؐ کے بعد ایک طوفان امت اسلامیہ میں آیا، ایک سیلاب دولت کا، اقتدار کا آیا۔ تو کتنے ایمان، کتنے کردار، کتنی شخصیتیں اسی سیلاب میں بہہ گئیں۔ کچھ وہ تھے جو اختلاف کی نذر ہو گئے کچھ وہ تھے جو فکر کی نذر ہو گئے۔ ابھی یہ سوچ ہی رہے ہیں کہ بیعت کی جائے یا نہ کی جائے۔ کل پیغمبرؐ اعلان کر کے گئے ہیں "جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ مولا ہے" اور وہ ابھی سوچ رہے ہیں کہ دست علیؑ پر بیعت کر کے ان مشکلات کا سامنا کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اقتدار کی مخالفت مول لی جائے یا نہ لی جائے۔ بہرحال اسامہ انھیں حالات سے گذر رہے تھے۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ یہاں تک کہ اسامہ کا وقت آخر آ گیا۔ فرزند رسول الثقلینؐ امام حسینؑ اسامہ بن زید کی عیادت کے لئے آئے۔ دیکھا پریشان ہیں، چہرے کا رنگ اُڑا ہوا ہے، حالات خراب ہیں۔ ظاہر ہے کہ مرض الموت ہے دنیا سے جانا چاہتے ہیں۔ شائد ایسے وقت میں جو حال بیمار کا ہوتا ہے یہی کیفیت اسامہ کی بھی ہے۔ فرمایا اسامہ میں تمھیں کچھ زیادہ ہی پریشان دیکھ رہا ہوں؟ کہا ہاں فرزند رسول، میں سمجھ گیا کہ اب مجھے اس دُنیا میں رہنا نہیں ہے، میرے جانے کا وقت قریب آ گیا ہے مگر سوچ یہ رہا ہوں کہ میرے ذمّہ

ایک قرض ہے اگر وہ قرض ادا نہ ہو سکا اور میں چلا گیا تو میرے گھر میں تو کوئی ایسا ہے نہیں جو قرض کو ادا کر دے۔ مجھے قیامت میں اس قرض کا جواب دہ ہونا پڑے گا۔ فرمایا کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے میں تمھارے قرض کا ذمہ دار ہوں۔ تم دنیا سے مطمئن ہو کے جاؤ حسینؑ تمھارے قرض کی ادائیگی کا ذمہ دار ہے۔ کتنا قرض ہے؟۔ کہا فرزند رسولؐ! میرے ذمہ ساٹھ ہزار درہم کا قرض ہے۔ امام حسینؑ نے بیٹھے بیٹھے اسامہ کے سامنے حکم دیا جاؤ اور گھر سے ساٹھ ہزار درہم لے کر جن کے بارے میں یہ بتا رہے ہیں اس قرض کو ادا کرو ـــــ تاکہ یہ اپنے کانوں سے سُن لیں کہ ان کا قرض ادا ہو گیا ہے اور یہ مطمئن ہو کے دنیا سے جائیں۔ یہ امام حسینؑ کا برتاؤ ان کے ساتھ ہے جن کا برتاؤ مولائے کائناتؑ کیساتھ پیغمبر اسلامؐ کے انتقال کے بعد یہ تھا کہ سوچتے ہی رہ گئے کہ علیؑ کا ساتھ دیا جائے یا نہ دیا جائے۔ یہ لفظ میں اس لئے گذارش کر رہا ہوں کہ اسامہ کی توہین نہیں کرنا چاہتا مگر یہ چاہتا ہوں کہ کردارِ حسینؑ پہچانیں۔ حسینؑ نے یہ بیعت علیؑ کی کوئی قیمت نہیں دی ہے۔ اگر سلمان و ابوذر کو دیا ہوتا تو شاید کوئی نالائق یہ سوچ لیتا کہ چونکہ ساتھ دیا تھا لہٰذا ان کا قرض تو ادا کرنا ہی تھا۔ نہیں یہ کرم آل محمدؐ ہے اور حسینؑ یہی پہچنوانا چاہتے ہیں کہ تم نے ساتھ نہ دیا وہ تمھارا کردار تھا ہم نے قرض ادا کر دیا یہ ہمارا کردار ہے۔ صلوات

تاریخ میں بیشمار واقعات ہیں فرزند رسول الثقلینؐ کے کرم کے، مگر میں ساری باتیں نہیں گزارش کروں گا۔ صرف ایک واقعہ قدرے تفصیل کے ساتھ گذارش کرنا چاہتا ہوں اس لئے کہ اس میں بہت سارے معلومات ہیں۔ میرے عزیز بچوں اور نوجوانوں کے لئے معلومات کا ایک ذخیرہ اس چھوٹے سے واقعہ میں ہے، اس لئے میں اس واقعہ کو ابتدا سے انتہا تک گزارش کر کے ایک پانچ۔ سات منٹ میں بیان کو آخری منزل تک لانا چاہتا ہوں۔

فرزند رسول الثقلینؐ امام حسینؑ کی خدمت میں ایک مرد اعرابی آیا بظاہر دیکھنے میں ایک عام آدمی ہے مگر پروردگار عالم نے کیا انتظام کیا ہے کرم حسینؑ کے اظہار و اعلان کے لئے۔ میں نہیں جانتا۔ واقعہ اس انداز سے نقل کیا گیا ہے کہ ایک اعرابی ایک دیہاتی

انسان امام حسینؑ کی خدمت میں آیا اور اس نے آ کے کہا فرزندِ رسولؐ! مجھے آپ سے کچھ سوال کرنا ہے۔ کچھ مانگنے کے لئے آیا ہوں مگر میرے سوال سے پہلے آپ مجھ سے سوال کریں کہ دنیا میں اتنے سخی پڑے ہوئے تھے سب کو چھوڑ کے آپ کے پاس کیوں آیا ہوں۔ ایک ایک لفظ واقعہ کا قابلِ توجہ ہے۔ کہا میں تو جو کچھ مانگنے آیا ہوں وہ تو آپ سے مانگوں گا ـــــ کہ سوال کرنے کے لئے آیا ہی ہوں۔ لیکن میں نے سب کو چھوڑ کے آپ سے کیوں مانگا۔ اگر آپ مجھ سے دریافت کرنا چاہیں اور اگر نہ بھی دریافت کرنا چاہیں تو میں بتانا چاہتا ہوں کہ میں آپ کے پاس کیوں آیا، کسی اور کے پاس کیوں نہیں گیا۔ فرمایا کیوں آئے میرے پاس، کیوں کسی کے پاس نہیں گئے ہ۔ کہا اس لئے کہ آپ کے جد بزرگوار نے فرمایا ہے کہ اگر کبھی سوال کرنے کی نوبت آجائے، کبھی مانگنے کا وقت آجائے تو خبردار ہوشیار! ـــــ چار طرح کے آدمیوں سے مانگنا اور کسی سے نہ مانگنا۔ اگر خدانہ کردہ کسی آدمی پر وقت پڑ جائے اور ہاتھ پھیلانے کا وقت آجائے، سوال کرنے کی نوبت آجائے تو سرکار دو عالمؐ فرما کے گئے ہیں کہ چار طریقے کے لوگوں سے سوال کرنا۔ اس کے علاوہ اور کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا۔ آپ کے جد بزرگوار نے فرمایا ہے اگر عرب میں کسی سے سوال کرنا ہے تو اس سے کرنا جو عربی شریف ہو۔ اور اگر باہر کسی سے سوال کرنا ہے تو اس سے کرنا جو مولائے کریم ہو۔ یا اگر کسی سے مانگنا ہے تو اس سے مانگنا جو حاملِ قرآن ہو۔ اور اگر کوئی کمال کسی کے پاس نہ ہو تو اس سے مانگنا جس کو اللہ نے چہرے میں صباحت و وجاہت دی ہو۔ تو چونکہ سرکار دو عالمؐ نے فرمایا ہے کہ سوال چار میں سے کسی ایک سے ہوگا یا عربی شریف سے ہوگا، یا مولائے کریم سے ہوگا، یا حاملِ قرآن سے ہوگا، یا اس سے ہوگا جو چہرے میں صباحت و وجاہت رکھتا ہو۔ تو میں نے چاروں طرف دیکھا۔ کوئی ایسا نظر آیا تو ویسا نہیں تھا۔ کوئی ایسا دکھائی دیا تو ویسا نہیں تھا۔ لیکن جب میں نے آپ کو دیکھا تو۔ آپ عربی شریف بھی ہیں۔ آپ مولائے کریم بھی ہیں۔ آپ حاملِ قرآن بھی ہیں۔ آپ مرد وجیہ بھی ہیں۔ صلوات

چونکہ پروردگار عالم نے چاروں کمالات آپ کی ہستی میں جمع کر دیئے ہیں۔ عرب لوں

میں کون آپ کے جیسا شریف ہوگا اس لئے پروردگار عالم نے سارے قبائل میں جس قبیلے کا انتخاب کیا ہے ان بنی ہاشم میں منتخب روزگار آپ کی شخصیت ہے۔ اگر مولائے کریم کو دیکھنا ہے تو نہ مولا آپ کے علاوہ کوئی ہے نہ کریم آپ جیسا کوئی ہے۔ اگر حامل قرآن کو دیکھنا ہے تو قرآن آپ کے جد پر نازل ہوا ہے، آپ کے گھر میں نازل ہوا ہے۔ آپ کے علاوہ حامل قرآن کون ہوگا۔ آپ ہی کے بارے میں پیغمبر کہہ گئے ہیں انی تارک فیکم الثقلین آپ کو ہمسر قرآن بنایا گیا ہے۔ اور اگر صباحت کو دیکھنا ہے تو آپ سے زیادہ پیغمبرؐ سے مشابہ کون ہوگا اور پیغمبرؐ سے زیادہ وجیہ کون ہوگا۔ تو چونکہ چاروں کمالات آپ میں جمع ہو گئے ہیں لہٰذا میں نے آپ کے سامنے ہاتھ پھیلانا گوارا ہے ورنہ کسی اور سے مانگنا میری غیرت کے خلاف ہے۔ یہ تو مرد اعرابی کا بیان ہے۔ اب روایت کا دوسرا رُخ دیکھئے، فرمایا جب تم نے اس لئے مجھ سے مانگا ہے کہ میرے جد بزرگوار نے فرمایا ہے تو میرے جد بزرگوار نے دونوں باتیں فرمائی ہیں مانگنے والے کو بھی سمجھایا ہے اور دینے والے کو بھی سمجھایا ہے۔ میں چاہتا ہوں اس روایت کے ایک ایک لفظ پر آپ توجہ کریں۔ یہ کام آنے والی چیزیں ہیں اس لئے کہ یہ وہ باتیں ہیں جن کا تعلق تنہا ایک شخصیت سے نہیں ہے۔ یہ کردار ہے جو قیامت تک کام آنے والا ہے۔ فرمایا میرے جد بزرگوار نے مانگنے والے کو یہ سکھایا ہے کہ جب مانگنا تو ایسے سے مانگنا جس میں یہ کمالات ہوں۔ اور دینے والے کو یہ سمجھایا ہے کہ المعروف بقدر المعرفة جب کسی کو عطا کرنا، جب کسی کو کچھ دینا تو نیکی کرنے سے پہلے اس کی معرفت کو دیکھ لینا۔ جتنا صاحب معرفت ہو اتنی ہی نیکی اس کے ساتھ کرنا، جتنی معرفت ہو اتنا ہی تمہارا معروف اور نیکی ہونی چاہیئے۔ وہ فرمایا تھا مانگنے والے سے اور یہ فرمایا ہے عطا کرنے والے سے۔ لہٰذا میں بھی اس وقت تک تم کو نہیں دے سکتا جب تک تمہاری معرفت کا امتحان نہ ہو جائے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو ہمارے اور آپ کے کام آنے والا ہے۔ خالی یہی نہیں کہ ہاتھ پھیلا دیا سارے کرم کا مظاہرہ ہو گیا اور جو بیچارہ صاحب ایمان، صاحب کردار، صاحب معرفت ہے،

جانتے ہیں کہ فقیر ہے مگر چونکہ اپنے نفس کی تسکین نہیں ہونے والی ہے اس لئے اس پر مہربانی کرنے والا کوئی نہیں ملتا۔ ہم جانتے ہیں وہ یتیم ہے، وہ بیوہ ہے، وہ غریب ہے، وہ مسکین ہے، وہ مفلس ہے مگر اُسے کچھ دینے کا ارادہ نہیں کرتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ ہمارے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا مگر جو ہاتھ پھیلا دے گا تو اُسے چار پیسے دے کے ذرا غرور کا احساس پیدا ہوگا۔ وہ مانگنے والا ہم دینے والے۔ مگر جس نے نہیں مانگا اسے کون دے گا۔ لہٰذا امام حسینؑ نے پیغمبر اسلامؐ کا یہ فقرہ یاد دلایا اور چاہا کہ تاریخ میں یہ نکتہ محفوظ رہ جائے کہ مسئلہ تمھاری انا کا نہیں ہے، مسئلہ تمھارے غرور کا نہیں ہے۔ اس کی معرفت کو دیکھو، اس کی معرفت استحقاق پیدا کراتی ہے لہٰذا تمھیں دینا چاہئے۔ فرمایا میرے پاس یہ مال ہے ——— میرے پاس یہ مال دنیا ہے خالی ہاتھ نہیں ہوں اور میں تمھیں دوں گا۔ لیکن جیسے تم نے پیغمبرؐ کے بیان کا حوالہ دیا میں نے بھی پیغمبرؐ کے ارشاد کا حوالہ دیا۔ اب میں تم سے تین سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے ایک سوال کا جواب صحیح دیا تو ایک تہائی مال۔ یعنی اس میں اگر تین سو درہم مثلاً آج کی زبان میں ہیں تو اگر ایک سوال کا جواب صحیح دیا تو ایک سو، اگر دو کا جواب صحیح دیا تو دو سو، اگر تینوں سوالات کے جوابات صحیح دیئے تو سارا مال تمھارا ہوگا۔ المعروف بقدر المعرفة۔ میں تمھاری معرفت کو آزمانا چاہتا ہوں جتنی تمھاری معرفت اتنا میرا معروف۔ اتنا میرا کار خیر۔ وہ مطمئن ہو گیا، تیار ہو گیا۔ کہا پوچھئے سوال کیجئے۔ امامؑ نے پہلا سوال کیا ای العمل افضل بتاؤ سب سے بہتر عمل کیا ہے؟ اتنا سخت امتحان اور امتحان تو یوں بھی سخت ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مشہور ہے کہ امتحان کا فیصلہ امتحان لینے والے پر ہوتا ہے اسے اگر پاس کرنا ہوگا تو کہہ دے گا جواب بالکل صحیح ہے۔ اور اگر پاس نہیں کرنا ہوگا تو کہے گا یہ نہیں بلکہ وہ۔ لیکن یہاں تو ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہاں تو سارا مسئلہ یہ ہے کہ درمیان میں پیغمبر اسلامؐ آ گئے ہیں۔ سوال کے آداب پیغمبرؐ نے بتائے، عطا کرنے کے آداب پیغمبرؐ نے بتائے۔ اب جو سوالات امام حسینؑ نے کئے ہیں اس کے جوابات پیغمبرؐ پہلے سے محفوظ کرا کے گئے ہیں۔ لہٰذا کسی

انسان کو یہ خطرہ نہیں ہے کہ میں کچھ اور کہوں گا وہ کچھ اور فرمادیں گے۔ نہیں ___ فرمایا ای العمل افضل سب سے بہتر عمل کون سا ہے۔ اس نے کہا الایمان باللہ۔ اللہ پر ایمان لانے سے بہتر کوئی عمل نہیں ہے۔ فرمایا پاس۔ ایک تہائی مال کے تم حقدار ہوگئے۔ فرمایا حضور دوسرا سوال؟ فرمایا یہ بتاؤ ہلاکت سے بچنے کا ذریعہ کیا ہے ___

___ وہ ایمان ہوگیا جو بہترین عمل ہے وہ ہم نے کرلیا۔ اگر کوئی آخرت میں ہلاکت سے بچنا چاہتا ہے تو اس کا ذریعہ کیا ہوگا؟ اس نے کہا اَلثِّقَةُ بِاللّٰہِ خدا پر بھروسہ رکھے جب کرم پروردگار میں شک پیدا ہوجائے گا تو نجات کا کوئی راستہ نہیں ہوگا ___

___ اسی لئے بعض روایات میں میں نے یہ فقرہ دیکھا کہ اگر کوئی انسان اپنے گناہ کے بارے میں سوچ لے کہ میرا گناہ معاف نہیں ہوسکتا ہے تو وہ کافر ہے مسلمان نہیں ہے۔ توبہ کرو توبہ، ہر گناہ قابلِ معافی ہے۔ فرمایا کہ اگر کوئی اپنے گناہ کے بارے میں سوچ لے کہ میرا گناہ معاف نہیں کیا جاسکتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے گناہ کو خدا کے کرم سے زیادہ بڑا سمجھتا ہے اور جو گناہ کو کرم خدا سے بڑا سمجھتا ہو وہ مسلمان کہے جانے کے لائق نہیں ہے۔ تو اس نے کہا حضور بہترین ذریعہ، بہترین وسیلہ نجات کا ہلاکت سے، روز قیامت کی مصیبت سے خدا کے کرم پر بھروسہ رکھنا، خدا کے کرم پر اعتبار رکھنا ہے ___ اس سے اچھا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ فرمایا کامیاب۔ دو سوالات اور دونوں میں کامیاب یعنی دو تہائی کا حقدار ہوگیا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا تیسرا سوال باقی رہ گیا۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان کے کردار کی زینت کیا ہے۔ کس انسان کے کردار کو کہا جائے کہ یہ کردار آراستہ ہے، بہترین ہے، حسین ہے، جمیل ہے، خوبصورت ہے۔ کردار کی زندگی میں زینت کیا ہے، زینت کردار، رونق زندگی کیا ہے۔ تو اس نے کہا ___ عِلْمٌ مَعَهُ حِلْمٌ۔ زینت کردار انسانی یہ ہے کہ اگر علم ہو تو علم کے ساتھ حلم بھی ہو جلم کے بارے میں میں آئندہ مجالس میں گذارش کروں گا۔ لیکن ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ دیکھئے جو نہیں جانتا ہے اس کے لئے برداشت کرنا بہت آسان ہے ___

___ جو نہیں جانتا ہے، ناواقف ہے اس کے لئے برداشت کرنا بہت آسان

ہے ـــــــ ہم آپ کو برداشت کر رہے ہیں آپ ہم کو برداشت کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ آپ بیٹھے ہیں تو آپ کے دل میں کیا ہے۔ آپ کو نہیں معلوم کہ ہم پڑھ رہے ہیں تو آپ کے بارے میں ہم کیا سوچ رہے ہیں۔ توجہ کریں، اگر آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ خدانخواستہ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میں جو اتنی وضاحت کر رہا ہوں تو آپ کو نافہم سمجھتا ہوں۔ تو کیا کل آپ مجھے برداشت کریں گے؟ ـــــــ نہیں۔ اگر میں یہ سوچ لوں کہ آپ مجھے اس لئے برداشت کئے ہوئے ہیں کہ بہر حال اب فرش پر آکے بیٹھ گئے ہیں اُٹھ تو سکتے نہیں لہٰذا میں آپ کے لئے قابل برداشت ہوں، یہ ہم آپ ایک دوسرے کو جو برداشت کرتے ہیں اس لئے کہ آپ کے دل میں کیا ہے وہ ہم نہیں جانتے، ہمارے دل میں کیا ہے وہ آپ نہیں جانتے ہیں۔ تو ناواقفیت میں برداشت کرنا بہت آسان ہے۔ توجہ کریں یہی وجہ ہے کہ خدا نے اپنے کو حلیم کہا ـــــــ کہ وہ پہلا برداشت کرنے والا ہے جو ہر ایک کی نیتوں کو جانتا ہے مگر برداشت کر رہا ہے اور یوں برداشت کر رہا ہے کہ اچھی نیت رکھو گے تو ثواب دے دوں گا مگر بُری نیت ہو گی تو عذاب نہیں کروں گا۔ اس سے زیادہ اور برداشت کرنا کیا ہے۔ لہٰذا ناواقفیت میں برداشت کرنا آسان ہے واقف ہونے کے بعد، جاننے کے بعد برداشت کرنا بہت مشکل ہے۔ لہٰذا اس نے کہا مولا میری نگاہ میں زینت کردار اور آرائش کردار انسانی یہ ہے کہ اگر علم ہو تو علم کے ساتھ علم ہو، جانتا ہو مگر برداشت کرے عِلْمٌ مَعَهُ حِلْمٌ۔ آپ نے فرمایا اگر یہ نہ ہو تو۔ ہاں اب تک تو ہر سوال کا ایک ہی جواب تھا اب سوال در سوال ہو گیا۔ اس نے کہا عِلْمٌ مَعَهُ حِلْمٌ علم جس کے ساتھ حلم ہو ـــــــ فرمایا نہ ہو کسی کے پاس تو کیا کرے، کہا مَالٌ مَعَهُ كَرَمٌ تو اگر علم والا نہیں ہے پیسے والا ہے تو جب مال ہو تو اس کے ساتھ کرم بھی ہو۔ یعنی مال زینتِ دنیا نہیں ہے کرم زینتِ دنیا ہے۔ تو علم کی زینت ہے حلم، اور مال کی زینت ہے کرم فرمایا اگر مال بھی نہ ہو ـــــــ اگر علم ہے تو اس کی زینت یہ ہے کہ حلم ہو، اگر علم نہیں ہے مال ہے تو

مال کی زینت یہ ہے کہ کرم ہو۔ فرمایا اچھا یہ بتاؤ اگر مال بھی نہ ہو، تو کہا فَقْرٌ مَعَہٗ صَبْرٌ اگر مال نہیں ہوگا فقیر ہوگا تو فقیری کے ساتھ صبر ہو۔ صبر کرے، فریاد نہ کرے، شکوہ نہ کرے، ہنگامہ نہ کرے، قیامت نہ برپا کرے۔ کم سے کم یہ ہو، اس کے بعد امام نے فرمایا اچھا اگر یہ بھی نہ ہو تو کہا کہ ایسا انسان حقدار ہے کہ بجلی گرے اور تباہ ہو جائے۔ اگر کوئی ایسا نالائق پیدا ہو جائے کہ نہ اس کے پاس علم ہے، نہ اس کے پاس حلم ہے، نہ اس کے پاس مال ہے، نہ اس کے پاس کرم ہے، نہ اس کے پاس فقر ہے، نہ اس کے پاس صبر ہے تو بہتر یہ ہے کہ ایک برق گرے اور وہ جل کے راکھ ہو جائے اس لئے کہ اسے زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ روائت کہتی ہے کہ جیسے ہی اس نے یہ آخری جواب دیا امام مسکرا دیئے۔ یعنی وہ بیچارہ بھی سوچ رہا ہے کہ آخر یہ کون سی نالائق قسم پیدا ہو گئی ہے کہ جس کے پاس نہ علم ہے نہ مال ہے، نہ حلم ہے، نہ کرم ہے، نہ صبر ہے، تو اگر ایسا انسان مر جائے تو مر جانا ہی بہتر ہے۔ بس جیسے ہی اس نے یہ فقرہ کہا ویسے ہی امام مسکرا دیئے اور تھیلی اٹھا کر اس کے حوالہ کر دی۔ کہا چونکہ تم امتحان میں کامیاب ہو گئے اور میرے جد نے فرمایا ہے کہ جتنی معرفت ہو اتنا ہی حق ہے۔ تو سب لے جاؤ کہ تم معرفت میں کامیاب ثابت ہوئے۔ صلوات

بس عزیزو واقعہ تمام ہو گیا۔ اب ایک جملہ کہنا چاہتا ہوں کہ سرکار نے فرمایا جتنی معرفت ہو اتنا ہی کارِ خیر کیا جائے، اتنا ہی کرم کیا جائے۔ تو مولاؑ نے، امام حسینؑ نے تو کر کے دکھلا دیا، وہ امتحان معرفت میں کامیاب ہو گیا۔ تو جتنا مال تھا سب دے دیا۔ ایک آخری لفظ ہے عزیزو اور شاید یہ آپ کو یاد رہ جائے۔ وہ امتحانِ معرفت میں کامیاب ہو گیا تو مولا کے پاس جو تھا وہ سب دے دیا۔ اے پروردگار یہ تو تیرا بندہ ہے۔ بندے نے جب دیکھا کہ امتحان معرفت میں کوئی کامیاب ہو گیا تو جو بندے کے پاس تھا سب دے دیا۔ اے مالک وہ بندے جو صاحبانِ معرفت ایسے ہیں کہ کمالِ معرفت بھی رکھتے ہیں اور ساری دنیا کو انھوں نے پہچنوایا ہے، تجھے پہچانا انھیں کے ذریعہ سے۔ نبیؐ کو پہچانا انھیں کے ذریعہ سے ——— تو انھیں

کیا دے گا۔ کہا اگر ان کا کرم یہ ہے تو جوان کی معرفت میں کامل نکل آئے، اسے جو ان کے پاس ہے وہ دے دیں تو جو میرے سامنے امتحان معرفت میں کامل ہوں گے میں دنیا بھی ان کے قدموں میں ڈال دوں گا اور آخرت بھی ان کے قدموں میں ڈال دوں گا۔ یہاں رہیں گے تو خزانۂ دنیا کے مالک وہاں جائیں گے تو اَلْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ۔ صلوات

بس عزیزانِ محترم، یہ تھا کرم سید الشہداء، اور اس کے بعد جس کی طرف میں نے آغاز گفتگو میں اشارہ کیا تھا۔ امام حسینؑ کا کرم امام حسینؑ کی زندگی کے بعد بھی رہا اگر زندگی کے بعد آج بھی کرم سید الشہداء کو دیکھنا چاہتے ہیں تو کرم کی کوئی کمی نہیں ہے حسینؑ کے احسانات کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اور جیسے کل یہ دربار عام تھا ہر انسان کے لئے، اپنا ہو، پرایا ہو، یگانہ ہو، بیگانہ ہو، جیسے کل کرم حسینؑ عام تھا دنیا کے لئے، آج بھی عام ہے۔ موقعہ نہیں رہ گیا ورنہ میں گذارش کرتا کہ جیسے قرآن مجید نے حج بیت اللہ کا تعارف کراتے ہوئے خانۂ خدا کی عظمت کا اعلان کیا تھا کہ یہ خانۂ خدا مبارک ہے عالمین کے لئے۔ اس کا فائدہ عالمین کے لئے ہے تنہا مومنین کے لئے نہیں ہے۔ ویسے ہی فرش عزائے سید الشہداء یہ وہ کرم امام حسینؑ ہے جو عام ہے اپنوں کے لئے، غیروں کے لئے، یگانوں کے لئے، بیگانوں کے لئے۔ ہم آپ تو اجر و ثواب ہی کے لئے تنہا آجاتے ہیں، ہم آپ تو عاقبت بنانے کے لئے، عاقبت سنوارنے کے لئے فرش عزا پر بیٹھ جاتے ہیں، مگر فرش عزا کا فیض تنہا صاحبانِ ایمان کے لئے نہیں ہے۔ کون ہے جو اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا، ایک تنہا محرم کا اہتمام اگر آپ دیکھیں، ایک تنہا عزائے حسینؑ کا اہتمام اگر آپ دیکھیں ______ تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ کون سا شعبۂ حیات ہے جو ذکر حسینؑ کے فیض سے محروم ہے۔ سفر کرنے والے جب منزل سفر میں آتے ہیں تو کتنے ہیں جو اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، گھر والے جب گھر میں رہتے ہیں تو کتنے ہیں جو ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ کہنے کے لئے کتنے کہتے ہیں کہ فرشِ عزا بچھانا صحیح نہیں ہے۔ یہ بدعت ہے، وہ غلط ہے، وہ ناجائز ہے، اِس میں یہ عیب پایا جاتا ہے، اُس میں

وہ بُرائی پائی جاتی ہے۔ کہنے کو سب کہہ دیا کرتے ہیں۔ مگر جب فرش عزا کے فیض سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے تو سب آگے آجاتے ہیں۔ چونکہ یہاں کے موضوعات میں یہ بات شامل نہیں ہے۔ لہٰذا ان مسائل کو یہاں نہیں چھیڑنا چاہتا۔ ورنہ میں نے تجربہ کیا ہے۔ جن پر بدعتوں کا بھوت سوار رہتا ہے وہ بھی تبرک کے لئے مٹھائیاں بنا کر بیچ ہی لیتے ہیں، وہ بھی تبرک کا سامان بنا کے فروخت کر ہی دیتے ہیں، کوئی یہ نہیں کہتا کہ تم کس کام کے لئے خرید رہے ہو۔ اگر بدعتوں کے لئے لیجارہے ہو تو تمہارے ہاتھ نہ بیچیں گے۔ یعنی جو اپنے ہیں وہ تو فائدہ اٹھا ہی رہے ہیں ـــــ جو غیر ہیں وہ بھی فیضِ حسینؑ سے آجتک محروم نہیں ہیں۔ کون ایسا ہے جو عزائے حسینؑ کے فیض سے محروم ہو۔ یہ فیض عام ہے۔ کل بھی عام تھا اور آج بھی عام ہے۔ جب ہر ایک کے لئے حسینؑ کا کرم عام ہے تو جو چاہنے والے ہیں ان کے ساتھ حسینؑ کی مہربانیوں کا ایک مخصوص امتیاز ہوگا۔ ماہ محرم کی دوسری تاریخ تھی جب فرزند رسول الثقلین وارد سرزمین کربلا ہوئے۔ کس شان سے یہ قافلہ زمین کربلا پر وارد ہوا۔ خاک کربلا پر قدم رکھنے کے بعد امام حسینؑ نے چاہا کہ دنیا کو یہ بتلوا دیں کہ ہم اچانک یہاں نہیں آگئے ہیں، ہم دھوکے میں اس زمین پر نہیں آگئے ہیں یہ ایک عہد الٰہی ہے جس کو ادا کرنے کے لئے آئے ہیں، اک وعدہ طفلی ہے جس کو ادا کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ہم اپنے سفر کے آغاز کو بھی پہچانتے ہیں، ہم اپنے سفر کے انجام کو بھی جانتے ہیں۔ اگر تم نہیں جانتے تو پہچانو میرے علم کو، دیکھو کہ میں اس منزل تک کیوں آیا ہوں، ہے کوئی جو اس زمین کا نام جانتا ہو۔ لوگوں نے کہا ہاں ہاں اس علاقہ کے رہنے والے پُرانے بوڑھے بزرگ ہیں وہ جانتے ہیں۔ فرمایا اس زمین کو کیا کہتے ہیں؟ کہا غاضریہ کہا جاتا ہے۔ فرمایا اور کوئی نام ہے؟ کہا اس کو نینوا بھی کہا جاتا ہے۔ کہا اس کا اور کوئی نام ہے؟ کہا اسے شطِ فرات بھی کہا جاتا ہے۔ کہا اور اس کا کوئی نام ہے؟ کہا ہاں اس کو کربلا بھی کہا جاتا ہے۔ یہ فرزند رسولؐ بار بار کیوں پوچھتے جارہے ہیں کیا اس زمین کا کوئی اور نام ہے؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ حسینؑ زمین کو پہچانتے ہیں، خاک کو پہچانتے ہیں۔ دنیا کو پہچنوانا چاہتے ہیں، ہم

اچانک یہاں نہیں آ گئے ہیں، اک عہد الٰہی ہے۔ جس کو یہاں پورا کرنے کے لئے آئے ہیں۔ جیسے ہی کہنے والے نے کہا یقال لہا کربلا اس زمین کو کربلا کہا جاتا ہے۔

بس عزیزو چند فقرے مجلس تمام ہو رہی ہے۔ جیسے ہی کہنے والے نے کہا اس زمین کو کربلا کہا جاتا ہے امام نے فرمایا ھٰذہ ارض کرب و بلا میں پہچانتا ہوں یہ کرب کی زمین ہے، یہ بلا کی زمین ہے، یہ مصیبتوں کی زمین ہے۔ اور یہ کہنے کے بعد فرمایا ھٰھُنَا مَحَطُّ رِحَالِنَا اے میرے چاہنے والو! ناقوں سے سامان اُتار لو یہی ہماری آخری منزل ہے، یہیں ہمیں ٹھہرنا ہے۔ حسینؑ اپنے مستقبل کے علم کا اعلان کرتے جارہے ہیں ——— عزیزو روئیں گے آپ بہت روئیں گے۔ امام حسینؑ اس زمین پر آئے ہیں وعدہ طفلی کو ادا کرنے کے لئے تو بتا رہے ہیں یہاں کیا کیا ہونے والا ہے اور ہم کس مستقبل کے لئے یہاں آئے ہیں۔ ھٰھُنَا مَحَطُّ رِحَالِنَا یہ وہ جگہ ہے جہاں ہمارا قافلہ ٹھہرے گا سامان اُتار لیا جائے۔ اس کے بعد فرمایا ھٰھُنَا مَنَاخُ رِکَابِنَا یہاں ہماری منزل ہوگی، ھٰھُنَا مَذْبَحُ اَوْلَادِنَا یہ وہ جگہ ہے جہاں ہمارے بچے ذبح کئے جائیں گے۔ ہاں ہاں رونے والو یہ وہ جگہ ہے جہاں ہمارے بچے ذبح کئے جائینگے۔ ھٰھُنَا تُسْبیٰ عِیَالُنَا یہ وہ جگہ ہے جہاں بیبیوں کو قیدی بنایا جائے گا۔ کون سی مصیبت ہے، جو حسینؑ کی نگاہ کے سامنے نہیں ہے۔ جب مولا نے یہ مصائب بیان کرنا شروع کئے سیدانیاں بھی سُن رہی ہیں، بیبیاں بھی سُن رہی ہیں۔ یہاں آ کے ٹھہر گئے۔ اک مرتبہ شہزادی زینبؑ نے ایک مشت خاک اٹھائی۔ مٹی کو سونگھنے کے بعد زینبؑ نے رونا شروع کیا۔ حسینؑ نے کہا بہن زینبؑ رونے کا سبب کیا ہے؟ کہا بھیا اس خاک سے آپ کے خون کی بو آرہی ہے۔ کہا ہاں زینبؑ یہی ہماری آخری منزل ہے۔ اب اپنے کو تیار کرو ان مراحل کے لئے کہ جہاں بچے بھی مارے جائیں گے، جہاں بیبیوں کو قیدی بنایا جائے گا۔ حسینؑ نے زمین کربلا کا انتخاب کیا۔ مالک نے جس زمین کے لئے کہا تھا حسینؑ اپنے عہد طفلی کو ادا کرنے کے لئے آ گئے۔ مگر اک مرتبہ علاقہ کے لوگوں کو بلا کے کہا ہم تو یہاں مارے جائیں گے، ہم تو یہاں ذبح کر دیئے جائیں گے، ہمارے گھر والے قیدی بنا کے لیجائے

جائیں گے مگر ہم یہاں لاوارث نہ رہیں گے۔ بس سُن لو عزیزو دو جملے مجلس تمام ہو رہی ہے۔ مگر ہم لاوارث نہ رہیں گے۔ دو باتیں تم سے کہنا ہے ایک تو اس بات کا خیال رکھنا کہ میرے وارثوں کو اتنا موقع بھی نہ دیا جائے گا کہ ہماری لاشوں کو دفن کیا جائے۔ تو جب تک ہمارا کوئی وارث ہماری لاش کو دفن نہ کردے ذرا ہماری لاشوں کا خیال رکھنا ــــــ اس کے بعد کہا دیکھو ہماری قبریں یونہی نہ رہ جائیں گی ہمارے چاہنے والے آئیں گے، ہماری مظلومیت کا ماتم کرنے والے آئیں گے۔ جب ہمارے مہمان آجائیں تو ان کا خیال رکھنا۔ اے مولا! یہ آنے والے مہمانوں کا ذکر کیوں کر رہے ہیں؟ کہا اس لئے کہ میں بھی تو مہمان بلایا گیا ہوں۔ امت نے ہماری مہمان نوازی نہ کی۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے چاہنے والوں کے ساتھ یہ برتاؤ نہ ہونے پائے۔ اے مولا، غلاموں کی جانیں قربان ہو جائیں۔ آپ نے دوسری محرم کو ان غلاموں کو یاد کیا ہے، اب یہ دوسری محرم کو آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ ہائے وہ کربلا جہاں حسینؑ کے بچے مارے گئے، ہائے وہ کربلا جہاں حسینؑ کے گھر کی بیبیوں کو قیدی بنایا گیا۔ بس ایک آخری جملہ سنو امام رضاؑ غریب کا۔ جب چاہنے والا سامنے آکے بیٹھا کہا بھائی تمہیں معلوم ہے یہ کون سا چاند فلک پر نمودار ہوا؟ کہا ہاں ہاں مولا معلوم ہے یہ محرم کا چاند ہے۔ کہا محرم کو پہچانتے ہو یہ کیا ہے؟ محرم کو جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یہ وہ مہینہ ہے جس میں ہمارا گھر لٹ گیا۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں وہ عاشور کا دن آیا، جس میں آل محمدؐ کا گھر تاراج ہوگیا۔ اور عاشور محرم کو یاد رکھنا ــــــ عاشور محرم اس دن کا نام ہے جس میں ہمارے عزیز کو ذلیل کر دیا گیا۔ اللہ وہ عزیز زہراؑ کیا اسی قابل تھا کہ شمر کا زانو ہو اور حسینؑ کا سینہ ہو۔ کیا یہ زہراؑ کی بیٹیاں اسی قابل تھیں کہ ظالم انکے بازوؤں میں رسیاں باندھے۔ کیا فاطمہؑ کی لاڈلی اسی قابل ہے کہ کبھی طمانچے مارے جائیں کبھی تازیانے لگائے جائیں اور بچی فریاد کرتی رہے بابا۔ بابا آپ کے بعد ظالم منہ پر طمانچے لگا رہے ہیں۔

تیسری مجلس

اخلاق امام حسین علیہ السلام

"حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اللہ اس سے محبت کرے جو میرے حسینؑ سے محبت رکھے"

سرکارِ دو عالمؐ کے اس ارشاد گرامی کی روشنی میں جو سلسلۂ کلام آغاز محرم کے ساتھ شروع کیا گیا تھا اس کے تیسرے مرحلہ پر کچھ باتیں اخلاق سرکار سید الشہداء صلوات اللہ وسلامہ علیہ کے موضوع سے متعلق آپ کے سامنے گذارش کرنا ہیں۔

ابتدائی طور پر اپنے عزیزوں کی توجہ کے لئے یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ اخلاق کے دو تصورات ہیں:

ایک تصور اور مفہوم وہ ہے جو عوام الناس کے درمیان پایا جاتا ہے اور جس معنی میں لفظ اخلاق کو ہم اور آپ استعمال کرتے ہیں اور ایک اخلاق کا تصور وہ ہے جو علمائے اخلاق کی نظر میں پایا جاتا ہے جس کی بنیاد پر اچھے اور برے اخلاق کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور جس کی بنا پر واقعاً کسی انسان کو صاحب اخلاق یا بد اخلاق کہا جاتا ہے۔

ہمارے یہاں کے استعمالات میں اخلاق کا تقریباً تمام تر تعلق انسان کے ظاہری برتاؤ سے ہوتا ہے۔ ہم نے آپ کو سلام کر لیا، آپ نے ہمیں خوش اخلاق قرار دے دیا۔ ہم نے آپ کو سلام نہیں کیا، آپ نے ہم کو بد اخلاق سمجھ لیا۔ آپ نے ہم کو اپنے گھر مدعو کر لیا ہم نے کہا نہایت ہی خوش اخلاق آدمی ہیں۔ ہمارے کہنے پر بھی آپ نے ہمیں

اپنے گھر نہیں بُلایا ہماری نگاہ میں انتہائی بد اخلاق ہو گئے، سوائے ظاہری رکھ رکھاؤ کے اور ظاہری برتاؤ کے اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر ہمارے یہاں انسانی اخلاق کا فیصلہ کیا جاتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھتے ہیں کہ ماں باپ بھی جب بچوں کو اخلاق سکھانا چاہتے ہیں تو جب گھر کے اندر کوئی بزرگ داخل ہو جاتا ہے تو بچوں کو سمجھاتے ہیں کہ جُھک کر سلام کرو، یعنی گویا سارا اخلاق اسی میں پایا جاتا ہے کہ بیٹے کی گردن جُھک جائے اور شاید اتنا جُھک جائے کہ جس حد تک شریعت نے جُھکنا جائز بھی قرار نہیں دیا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں اخلاقیات میں جائز اور ناجائز کی اتنی بڑی جگہ نہیں ہے جتنی بڑی جگہ شریعت کے عالم میں حاصل ہے۔ یہ بات آپ حضرات جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے ہیں ان کی معلومات کے لئے عرض کر رہا ہوں کہ دنیائے احترام میں تعظیم کے تین طریقے پائے جاتے ہیں:

۱۔ کسی کی تعظیم کے لئے کھڑا ہو جانا۔

۲۔ کسی کی تعظیم کے لئے جُھک جانا۔

۳۔ کسی کی تعظیم کے لئے سر خاک پر رکھ دینا۔

ان تینوں طریقوں میں ایک طریقہ وہ ہے جس کو دین اسلام نے بہرحال جائز قرار دیا ہے یعنی جو بھی قابلِ احترام ہے، قابل تعظیم ہے اس کی تعظیم کے لئے یہ بہرحال جائز ہے کہ آپ اس کے احترام کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ لیکن اس کے بعد کسی کے احترام کے لئے جُھک جائیں جس کو زبان شریعت میں رکوع کہا جاتا ہے یا کسی کی تعظیم کے لئے پیشانی خاک پر رکھ دیں جس کو مذہب کی زبان میں سجدہ کہا جاتا ہے اس کی اجازت دین اسلام میں نہیں دی گئی ہے۔ اب تو ماشاءاللہ کتاب مفاتیح الجنان اکثر مومنین کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ زیارت مولائے کائنات کے بعد بھی اور زیارت سید الشہداءؑ کے بعد بھی جہاں زیارات کا ذکر کیا گیا ہے وہاں یہ تذکرہ بھی پایا جاتا ہے کہ زیارت کے بعد دو رکعت نماز زیارت پڑھنا مستحبات میں ہے اور جہاں نماز زیارت کا ذکر ہے وہاں یہ فقرات بھی پائے جاتے ہیں کہ نماز

پڑھنے والا نماز تمام کرنے کے بعد مالک کی بارگاہ میں یہ گذارش کرتا ہے "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ صَلَّیْتُ ھَاتَیْنِ الرَّکْعَتَیْنِ" پروردگار! یہ دو رکعت نماز جو میں نے پڑھی ہے یہ اپنی طرف سے ہدیہ ہے اس امام کے لئے جس کی بارگاہ میں یہ نماز ادا کی ہے۔ یہ نماز تیری ہے، ہدیہ اُن کے لئے ہے ورنہ نماز کسی اور کے لئے نہیں ہے۔ یہ نماز تیرے واسطے ہے۔ یہ بندگی تیرے واسطے ہے۔

خدایا! یہ نماز تیرے لئے، یہ رکوع تیرے لئے، یہ سجدہ تیرے لئے، یہ عمل تیرے واسطے ہے اور ہدیہ اُن کے واسطے۔ کیوں؟

اس لئے کہ چاہے نماز ہو، چاہے رکوع ہو، چاہے سجدہ ہو یہ کسی اور کے واسطے جائز نہیں ہے سوائے تیری ذات اقدس کے۔ اور شائد یہ فقرات معصوم کی بارگاہ میں اسی لئے پڑھوائے گئے ہیں کہ اگر کسی کے واسطے بھی جائز ہوتا تو ان سے بالاتر کون تھا اور جب ان کے واسطے نہیں ہے تو پھر کسی کے واسطے نہیں ہے۔ تو مالک اگر ہم ان کی تعظیم کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں تو کیا کریں۔ ان کی عظمتوں کا اظہار کیسے ہوگا؟ کہا یہ طریقہ ہم نے اپنے واسطے رکھا ہے۔ رکوع کرو ہمارے واسطے۔ سجدہ کرو ہمارے واسطے۔ نماز پڑھو ہمارے لئے۔ ہمارے علاوہ کسی کے واسطے نہ نماز ہوگی نہ رکوع ہوگا نہ سجدہ ہوگا۔ ان کی عظمتوں کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم نے اپنے سامنے لوگوں کے سر جھکائے ہیں اور ان کے سامنے اہل ایمان کے دل جھکا دیئے ہیں۔

تو میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ ہمارے یہاں اخلاق کا تصور یہ پایا جاتا ہے کہ انسان جتنا بھی ظاہری برتاؤ میں، سلوک میں بہترین سلوک کا مظاہرہ کر سکے اسی کا نام اخلاق ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ جس کے سامنے آدمی اتنا جھک کے سلام کر رہا ہے شائد اس کی ادنیٰ محبت بھی اس کے دل میں نہ ہو۔ لیکن اخلاق کی دنیا میں اسے بداخلاق نہیں کہا جائے گا۔ تاریخ کا ایک واقعہ ہے جو آپ حضرات کے ذہن میں ہے اور میں بھی اشارہ کر چکا ہوں۔ لیکن سلسلہ کو مربوط بنانے کے لئے ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں کہ سرکار دو عالمؐ مسجد میں تشریف فرما ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ایک مسلمان آیا مسجد میں،

اور نماز شروع کردی اور چونکہ نیا نیا مسلمان تھا اور آپ جانتے ہیں کہ نئی مشین ہمیشہ تیز چلتی ہے لہٰذا لمحوں میں نماز تمام ہوگئی۔ حضور دیکھ رہے ہیں کہ یہ نماز وہ ہے جس کا نہ رکوع صحیح ہے، نہ سجدہ صحیح ہے، نہ خضوع ہے نہ خشوع ہے۔ یہ نماز، نماز کہے جانے کے قابل نہیں ہے مگر حضورؐ نے یہ کہہ کے نہیں ٹوکا کہ نماز باطل ہے دوبارہ پڑھو۔ بلکہ حضورؐ نے مسلمانوں کو ایک دوسرے نکتہ کی طرف متوجہ کیا۔ دیکھو یہ ہنگامہ، یہ گرنا پڑنا، یہ طریقہ کار ایسا انداز بندگی یہ کیوں پیدا ہوگیا ہے، اس لئے کہ اس کے دل میں خوفِ خدا نہیں ہے۔ اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا، اگر اس کا دل خدا کے سامنے جھک گیا ہوتا، اگر یہ خدا کا خوف رکھتا ہوتا تو اس کی نماز کا یہ انداز نہ ہوتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حضورؐ یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ نماز میں اعمال کا، حرکات کا، قیام کا، رکوع و سجود کا سارا عیب رکوع و سجود سے نہیں پیدا ہوتا ہے دل سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر دل صراطِ مستقیم پر ہوتا ہے تو عمل بھی صحیح ہوتا ہے اور یہی وہ جگہ ہے کہ جہاں ہم نے سرکار دو عالمؐ کی تعلیمات سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔ اس لئے کہ ہم نے دل کی دنیا کو الگ کر دیا ہے اور اعمال کی دنیا کو الگ کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بے ایمانوں کے پاس ایک ہی نعرہ ہوتا ہے، ہمارے اعمال کو نہ دیکھئے، ہمارے کردار کو نہ دیکھئے، ہماری بُرائیوں کو نہ دیکھئے، دل اتنا پاک و پاکیزہ ہے کہ کائنات میں کسی کا نہ ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کو اس نے پہچانا ہے، سرکار نے نہیں پہچانا ہے۔ دل کی دنیا کو یہ جانتا ہے حضور سرورِ کائناتؐ نہیں جانتے ہیں۔ جب کہ حضورؐ نے فرما دیا ہے کہ اعمال میں عیب اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب دل میں عیب پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جب تمہارے اعمال میں کوئی خرابی پیدا ہو تو اعمال کی اصلاح کی فکر نہ کرو پہلے دل کو پاکیزہ بناؤ۔ جس دن دل پاکیزہ ہو جائے گا اعمال خود بخود صحیح ہو جائیں گے۔ صلوات

میں اس بات کو دور نہیں لے جانا چاہتا ہوں لیکن بہرحال جو اس سلسلہ کا بنیادی نکتہ ہے اسے اپنے عزیز بچوں اور نوجوانوں پر یقیناً واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے یہاں اخلاق کا تصور اور ہے اور دنیا کے اخلاق میں اخلاق کا تصور کچھ اور ہے۔ اس کا خلاصہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں ورنہ داستان بہت طویل ہے۔

انسانی زندگی میں دو چیزیں پائی جاتی ہیں:
ایک کا نام ہے علم اور ایک کا نام ہے عمل۔
ہر انسان کی زندگی میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔
علم کی دنیا الگ ہے اور عمل کی دنیا الگ ہے۔
علم کا تعلق روح سے ہے، نفس سے ہے، عقل سے ہے، ذہن و دل و دماغ سے ہے۔

عمل کا تعلق انسان کے اعضاء و جوارح سے ہے تو علم کی دنیا الگ ہے اور عمل کی دنیا الگ ہے۔ اور انسان جب کوئی عمل انجام دیتا ہے تو عمل بغیر کسی تحریک کے نہیں ہوتا ہے۔ جیسے علم بغیر سبب کے نہیں آتا ہے ویسے ہی عمل بغیر تحریک کے انجام نہیں پاسکتا ہے۔ کوئی عمل آپ انجام دیں گے تو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی محرک ضرور ہوگا۔ آپ کیوں آکر فرشِ عزا پر بیٹھ گئے، اپنے گھروں سے نکل کر کیوں آگئے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ بیکار بیٹھے تھے۔ دنیا میں کوئی کام نہیں تھا۔ سوچا چلو وہیں چل کے بیٹھ جائیں۔ کوئی تو محرک تھا جو آپ کو گھر سے نکال کر یہاں تک لے آیا ہے۔ بہترین جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے اُس سے کم تر جگہ پر "بظاہر" آکے بیٹھ گئے۔ بہترین کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے فرشِ خاک پر آکر بیٹھ گئے۔ ایر کنڈیشن میں بیٹھے ہوئے تھے خدائی ایر کنڈیشن میں آکے بیٹھ گئے۔ یا اتنا بڑا فرق کیوں پیدا ہو گیا۔ کیوں اپنے گھروں کو چھوڑا۔ کیوں زحمتیں برداشت کیں، کوئی تو محرک ہوگا؟ اگر یہ فرشِ عزا نہ ہوتا، اگر یہ ایامِ عزا نہ ہوتے، اگر یہاں ذکرِ آلِ محمدؐ نہ ہوتا، اگر یہاں تذکرۂ حسینؑ نہ ہوتا تو کوئی شریف مومن یہاں آکر نہ بیٹھتا۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک محرک تھا جو آپ کو گھروں سے نکال کر یہاں تک لے آیا ہے۔ بغیر تحریک کے کوئی کام دنیا میں انجام نہیں پاتا ہے۔ جیسے بغیر سبب کے علم نہیں آتا ہے ویسے ہی بغیر تحریک کے عمل نہیں پیدا ہوتا ہے۔ علم کو بھی سبب درکار ہے چاہے مدرسہ ہو، چاہے استاد ہو، چاہے ماں باپ ہوں، چاہے معاشرہ ہو اور چاہے پروردگار ہو۔

میں نے ایک لفظ کہا ہے کوئی علم بغیر سبب کے نہیں آتا ہے۔ سارے بندے بندے

ہیں خدا کوئی نہیں ہے، سوائے وحدہ لاشریک کے۔ تو ہمارے پاس علم ماں باپ کے ذریعہ آیا، اُس کے بعد استاد کے ذریعہ آیا۔ کچھ معاشرے سے سیکھا، کچھ ماحول سے سیکھا، کچھ لوگوں سے سیکھا، یہی اسباب تھے جنھوں نے ہمیں صاحب علم بنا دیا ہے۔ جو اللہ کے نیک بندے ہیں، جو خدا کے نمائندے ہیں ان کا علم بھی اگر کہیں اور سے نہیں آیا ہے تو پروردگار کے یہاں سے آیا ہے۔ اسی لئے مالک نے بار بار اپنی تعریف کا ذکر کیا ہے الرحمٰن۔ علم القرآن۔ خلق الانسان۔ علمہ البیان۔ تو جیسے علم کے لئے سبب درکار ہے ویسے ہی عمل کے لئے ایک محرک درکار ہے۔ ایک تحریک چاہیے جس تحریک کے بغیر کوئی عمل نہیں ہو سکتا ہے۔ تو پروردگار عالم نے انسانی زندگی میں عمل کی تحریک پیدا کرنے کے لئے انسان کے اندر دو طاقتیں رکھ دی ہیں جن کا کام مسلسل تحریک عمل پیدا کرنا ہے۔

ایک طاقت ہے جس کا نام ہے خواہش، اور ایک طاقت ہے جس کا نام ہے غیظ و غضب۔

کوئی انسان دنیا کا ایسا نہیں ہے جو ان دو طاقتوں سے خالی ہو۔ ہر انسان میں خواہش بھی ہوتی ہے اور ہر انسان میں قوت غضب بھی ہوتی ہے۔

اگر قوت غضب نہ ہو تو انسان بے حیا ہو جائے اور اگر خواہش نہ ہو تو انسان مُردہ ہو جائے، دو لمحہ زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ یہ خواہشات ہی ہیں جو انسان کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ خواہش ہے جو کھانے پر آمادہ کرتی ہے۔ خواہش ہے جو پہننے پر آمادہ کرتی ہے۔ خواہش ہے جو نسلوں کو آگے بڑھانے پر آمادہ کرتی ہے۔ خواہش ہے جو انسان کو زندہ رکھتی ہے۔ خواہش ہے اولاد کی جو ماں کو نو مہینے زحمت برداشت کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ خواہش اولاد ہے جو باپ کو محنت کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ یہ خواہشات کی دنیا ہے جو نوع بشر کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ لہٰذا خواہشات کو گالیاں دینا یہ کوئی عقلمندی نہیں ہے۔ خواہشات میں جو بہک جاتے ہیں وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کو بُرا کہا جائے ورنہ خواہش تو ایک نعمت پروردگار ہے، ایک عطیۂ الٰہی

ہے اور یہی حال قوت غضب کا ہے اگر کسی کو کسی بات پر غصہ نہ آئے، کسی بات پر غیظ و غضب کا مظاہرہ نہ کرے تو ایسے آدمی کو بے غیرت کہا جاتا ہے، بے حیا کہا جاتا ہے۔ یہ صاحب کردار نہیں ہے تو پروردگار عالم نے انسانی زندگی میں تحریک عمل کے لئے دو طاقتیں رکھی ہیں۔ تو جب خواہش ثواب پیدا ہوئی تو گھر سے نکلے۔ جب خواہش جنت پیدا ہوئی تو گھر کو چھوڑ دیا اور اگر باہر فرش عزا پر بیٹھ گئے۔ یعنی ایک جذبہ تھا جو آپ کو کھینچ کے لے آیا ہے اور اس کے بعد انسانی زندگی میں غیظ و غضب کے لاکھوں مظاہرے ہیں۔ ان ساری تفصیلات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انسان کے صاحب کردار بننے کے لئے کسی ایک طاقت کا صحیح راستہ پر چلا جانا کافی نہیں ہے۔ بہترین بات اس موقع پر ابو حامد غزالی نے کہی ہے۔ اگرچہ بہت سی باتیں ان کی عجیب و غریب بھی ہیں لیکن بہرحال یہ ایک بات معقول ہے لہٰذا میں اس کو حوالہ کے طور پر آپ کے سامنے گذارش کر رہا ہوں۔ مثال اچھی ہے۔

کہا دیکھو اگر کسی حسین انسان کو تلاش کرنا ہے جو شکل و صورت کے اعتبار سے، وجاہت کے اعتبار سے اچھا دکھائی دے، حسین دکھائی دے۔ تو کیا انسانی حُسن کے لئے تنہا آنکھوں کا بہتر ہونا کافی ہے؟ کیا انسانی حُسن کے لئے تنہا چہرے کا رنگ اچھا ہونا کافی ہے؟ کیا انسانی حُسن کے لئے پیروں کا ٹھیک ہونا کافی ہے؟ کیا انسانی حُسن کے لئے ہاتھوں کا صحیح ہونا کافی ہے؟ کیا انسان کے حُسن کے لئے زبان کا بہترین ہونا کافی ہے۔ نہیں حُسن بشر کسی ایک عضو کے حُسن کا نام نہیں ہے اور نہ کسی ایک عضو کے ٹھیک ہونے سے حُسن پیدا ہوتا ہے۔

اگر حسین ترین چہرہ ہے اور آنکھیں نابینا ہیں تو کیا ایسے آدمی کو حسین کہا جائیگا؟ آنکھیں ایسی ہیں کہ اگر نظر اٹھا لے تو زمین سے آسمان کی خبر لے آئے مگر چہرہ وہ جو دیکھنے لائق نہ ہو تو کیا اُسے حسین کہا جائے گا؟ بہترین چہرہ ہے، بہترین آنکھیں ہیں مگر ناک ٹیڑھی ہے تو کیا اُسے حسین کہا جائے گا؟ بہترین ناک ہے مگر کان بڑے ہیں یا چھوٹے ہیں تو کیا اُسے حسین کہا جائے گا؟ سب صحیح ہے مگر پیر ایک ہی فٹ

کے ہیں تو کیا اسے حسین کہا جائے گا؟ پیر بھی ٹھیک ہے مگر ہاتھ ایسا ہے جو بہت ہی مختصر ہے یا بہت طویل ہے تو کیا اسے حسین کہا جائے گا؟ ہاتھ ٹھیک ہیں مگر انگلیاں صحیح نہیں ہیں تو کیا اسے حسین کہا جائے گا؟ تو جیسے حسن ظاہر محتاج ہے کہ بال بھی سر کے صحیح ہوں، سر بھی جسم کے اعتبار سے صحیح ہو، آنکھیں بھی ٹھیک ہوں، کان بھی صحیح ہوں، ناک بھی صحیح ہو، چہرہ کا رنگ بھی صحیح ہو، لب بھی صحیح ہوں، ہاتھ بھی ٹھیک ہوں، پیر بھی صحیح ہوں یعنی سر سے پیر تک سارا جسم متوازن ہو کہ اگر ایک عضو بھی ٹیڑھا ہو جائے تو انسان حسین کہے جانے کے قابل نہیں ہے۔ تو یہی حال حسن باطن کا بھی ہے جس کا نام ہے کردار اور کیرکٹر۔ کہ یہ بھی کسی ایک چیز سے طے نہیں ہوتا ہے۔ بہت پڑھے لکھے ہیں مگر جھوٹے ہیں۔ بہت بڑے سچ بولنے والے ہیں مگر میدان چھوڑ کے بھاگ جاتے ہیں۔ بہت بڑے سپاہی ہیں مگر کبھی سچ نہیں بولتے ہیں۔ بہت بڑے بہادر ہیں مگر فقیر کے ہاتھ پر کبھی ایک پیسہ نہیں رکھا ہے۔ ایسا انسان صاحب کردار نہیں کہا جا سکتا ہے۔ کیرکٹر کے لئے ضروری ہے کہ نہ علم میں کوئی کمزوری ہو اور نہ عمل میں کوئی کمزوری ہو۔ صلوات

انسانی وجود میں جتنے اوصاف ہیں وہ سارے اوصاف اسی طرح اتنے معتدل ہوں جس طرح حسن ظاہر میں پورے بدن کے ایک ایک عضو کا معتدل اور متناسب ہونا ضروری ہے، کہیں سے نقص و عیب نہ پایا جاتا ہو۔

اگر میرے اس نکتہ کو آپ نے پہچان لیا ہے تو میں ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ اب پہچانئے پروردگار نے کیوں اپنے پیغمبرؐ سے کہا تھا اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ میرے پیغمبرؐ آپ عظیم ترین اخلاق کی منزل پر فائز ہیں اس لئے کہ اخلاق کے لئے جتنا کمال درکار ہے وہ سارا کمال آپ کے پاس ہے۔

———— اس لئے کہ نہ آپ نے علم کسی اور سے لیا ہے اور نہ عمل کسی اور سے لیا ہے، جو آپ کے پاس ہے وہ سب میرا ہی دیا ہوا ہے۔ اب اگر آپ میں کمزوری پیدا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دینے والے کے خزانہ میں کوئی کمی پائی جاتی ہے اور جب نہ لینے والے کے ظرف میں کمی ہے اور نہ دینے والے کے کرم

میں کمی ہے تو جب دونوں کا مجموعہ سامنے آئے گا تو دینے والا خدائے عظیم ہوگا اور لینے والا صاحب خلق عظیم ہوگا۔ صلوات

اور اس کے بعد معصومینؑ کے ارشادات میں یہ لفظ پایا جاتا ہے جس کو عالم اسلام نے اپنے حوالے سے نقل کیا ہے لیکن در اصل یہ لفظ معصومینؑ کے ارشادات میں پایا جاتا ہے کہ اگر سرکار دو عالم کی تاریخ اخلاق کو مرتب کرنا چاہو اور یہ دیکھنا چاہو کہ پیغمبرؐ کا اخلاق کیا تھا تو ایک مختصر لفظ یہ ہے کہ پیغمبرؐ کا اخلاق تھا قرآن۔ پیغمبرؐ کا کردار تھا قرآن، یعنی پورے قرآن میں کردار کے لئے جتنی باتیں بیان کی گئی ہیں، جن اوصاف و کمالات اور شرائط کا ذکر کیا گیا ہے اُن سب کو اگر الفاظ میں دیکھنا چاہو تو قرآن میں دیکھو اور مجسم شکل میں دیکھنا چاہو تو پیغمبرؐ کے کردار میں دیکھو۔ سرکار کا اخلاق وہی ہے جو قرآن حکیم ہے یعنی ہر وہ چیز جس کو قرآن نے بُرا کہا، سمجھو کردارِ پیغمبرؐ میں نہیں ہے اور ہر وہ بات جس کو قرآن نے قابلِ تعریف قرار دیا ہے، سمجھو وہ کردارِ پیغمبرؐ میں ہے۔ اب حوالوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اخلاق پیغمبرؐ کو اگر پہچاننا ہے تو اس کا آسان نسخہ معصوم کی زبان سے بھی اور غیر معصومین کی زبان سے بھی یہ معلوم ہو گیا ہے کہ اخلاقِ پیغمبرؐ وہی ہے جو اخلاق قرآن ہے۔ جسے قرآن نے کردار قرار دیا ہے، پیغمبرؐ میں وہی کردار پایا جاتا ہے۔ اب اگر حیاتِ پیغمبرؐ میں واقعات نہ بھی ملیں، اگر پیغمبرؐ کی تاریخ لکھنے والے، سیرت لکھنے والے ہزاروں واقعات جمع بھی نہ کر سکیں تو بھی پیغمبرؐ کو یوں پہچان لیجئے کہ اگر کسی چیز کو قرآن نے قابلِ تعریف قرار دیا ہے تو وہ کردارِ پیغمبرؐ میں ہے اور اگر کسی چیز کو قرآن نے عیب کہا ہے تو سمجھو کردارِ پیغمبرؐ میں نہیں ہے، چاہے (صحیح) کتاب ہی میں کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ کوئی کتاب اخلاقِ پیغمبرؐ نہیں ہے۔ کوئی کتاب کردارِ پیغمبرؐ نہیں ہے۔ کردارِ پیغمبر قرآن ہے، لہٰذا نبوت کو قرآن کے آئینہ میں دیکھا جائے گا، نبوت کو کتابوں کے آئینہ میں نہیں دیکھا جائے گا۔ بلکہ میں تو یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ کتابوں کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ بھی کردارِ پیغمبرؐ سے کیا جائے گا۔ قرآن سے مل جائے

تو صحیح کہے جانے کے قابل ہے ورنہ قرآن سے ٹکرا جائے تو غلط کہے جانے کے قابل ہے۔ صلوات

تو اخلاق قرآنی اخلاق انسانی میں مجسم ہو گیا سرکار دو عالمؐ کی زندگی میں۔ اگر قرآن کہتا ہے جھوٹ بولنا غلط ہے تو سمجھو پیغمبرؐ، کوئی پیغمبرؐ کبھی غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید ذکر جناب ابراہیمؑ کر رہا ہے "ابراہیمؑ کو یاد کرو، ابراہیمؑ کا ذکر کرو اگرچہ تمہارا دَور ان کا دَور نہیں ہے مگر وہ ہمارا پیغمبر تھا، اسے یاد رکھو، اس کے کردار کو یاد رکھو، اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا ابراہیمؑ ایک نبی صدیق تھے، ابراہیمؑ ایک سچ بولنے والے تھے۔

قرآن کہتا ہے وہ سچ بولنے والے صدیق پیغمبر تھے، اگر کوئی کتاب کہے کہ ابراہیمؑ زندگی میں ایک دفعہ جھوٹ بولے تو بتاؤ عزیزو قرآن کو جھٹلایا جائے یا کتاب کو جھٹلایا جائے یا اتنی وسعتِ دل پیدا کر لی جائے کہ یہ بھی صحیح اور وہ بھی صحیح۔ یہ بھی سچا وہ بھی سچی۔ صلوات

اگر غلط بیانی کو قرآن نے غلط کہا ہے تو پیغمبر اسلامؐ کے کردار میں غلط بیانی کبھی نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر بزدلی کو قرآن نے غلط کہا ہے تو پیغمبر کبھی بزدل نہیں ہو سکتا ہے۔ اگر بخل کو قرآن نے غلط کہا ہے تو پیغمبر کبھی بخل نہیں کر سکتا ہے۔ اگر حسد کو قرآن نے غلط کہا ہے تو پیغمبر کبھی حسد نہیں کر سکتا ہے۔ اگر غیبت کو قرآن نے غلط کہا ہے تو پیغمبرؐ غیبت نہیں کر سکتا ہے۔ اگر اتہام والزام کو قرآن نے غلط کہا ہے تو پیغمبرؐ کسی پر الزام نہیں لگا سکتا ہے۔ پیغمبرؐ کا اخلاق وہی ہے جو قرآن کہہ رہا ہے۔ یہ پیغمبرؐ کی زندگی کو پہچاننے کا بہترین طریقہ ہے۔ ایک ایک برائی کو قرآن سے پڑھتے جائیے اور حیاتِ پیغمبرؐ سے نفی کرتے جائیے۔ ایک ایک عیب کا ذکر قرآن میں پڑھتے جائیے اور پیغمبرؐ کی زندگی سے اُسے الگ کرتے جائیے اور اس کے بعد ایک فہرست بنا لیجئے اچھائیوں کی کہ مالک نے قرآن میں کن باتوں کی تعریف کی ہے۔ جس بات کی قرآن نے تعریف کر دی ہے سمجھئے وہ کردارِ پیغمبرؐ میں ہے۔

تو اب تو آپ کو اندازہ ہو گیا کہ پیغمبرؐ کا وجود الگ نہیں ہے۔ قرآن قلب پیغمبرؐ پر اُترا ہے۔ اخلاق پیغمبرؐ قرآن ہے "قرآن لفظوں کی شکل میں کردار ہے۔ پیغمبرؐ عمل کی شکل میں قرآن ہے"۔ غور کر رہے ہیں آپ؟ اب نبیؐ ہی کی زبان سے سنئے فرماتے ہیں "اِنَّهُمَا لَنْ يَّفْتَرِقَا" قرآن و اہلبیتؑ ہرگز الگ نہیں ہو سکتے ہیں۔ اب اگر ایک جگہ بھی اہلبیتؑ کا عمل قرآن سے الگ ہو جائے تو پیغمبرؐ کی بات غلط ہو جائے گی لہٰذا جہاں بھی قرآن ہے وہیں اہلبیتؑ ہیں اور جہاں بھی قرآن ہے وہیں پیغمبرؐ ہیں۔ صلوات

اب معیار قرآن مجید ہے سرکار دو عالم کے اخلاق کو پہچاننے کے لئے بھی اور اہلبیتؑ کے کردار کو پہچاننے کے لئے بھی کہ حضور سرور کائناتؐ نے خود فرمایا ہے کہ "اِنَّهُمَا لَنْ يَّفْتَرِقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ" یہ اس وقت تک الگ نہیں ہو سکتے ہیں جب تک حوض کوثر پر وارد نہ ہو جائیں۔ تو جب ان دونوں میں جدائی نہیں ہو سکتی ہے تو جہاں قرآن ہے وہاں اہلبیتؑ ہیں، اور جہاں قرآن نہیں ہے جس چیز کا قرآن ساتھ نہیں دیتا اہلبیتؑ اس چیز کا ساتھ نہیں دے سکتے ہیں۔ جو اچھائی قرآن نے بیان کی ہے وہ کردار اہلبیتؑ میں ہے اور جس کو قرآن نے برا کہا ہے وہ کردار اہلبیتؑ میں نہیں ہے۔ وہی معیار جو پیغمبرؐ کے اخلاق کو پہچاننے کا تھا وہی بقول پیغمبرؐ اہلبیتؑ کے کردار کو پہچاننے کا ہے لہٰذا اگر تفصیلی واقعات تاریخ میں نہ بھی ہوں تو بھی ہم یہ جانتے ہیں کہ قرآن کی ہر خوبی کردار اہلبیتؑ میں ہے اور جسے بھی قرآن نے غلط اور برا کہہ دیا ہے وہ کردار اہلبیتؑ میں نہیں ہے۔

اس کے بعد چند جملے ظاہری برتاؤ کے بارے میں بھی گذارش کر دینا چاہتا ہوں کہ اہلبیتؑ کا ظاہری اخلاق، ظاہری برتاؤ بھی دنیا کے ساتھ کتنا طیب و طاہر تھا، کتنا پاک و پاکیزہ تھا ــــ پاکیزگی نفس کا تو آپ نے اندازہ کر ہی لیا ہے کہ علم انھوں نے کسی سے لیا نہیں ہے کہ کم ہو جائے یا کمزور ہو جائے۔ وہ خدا کا دیا ہوا ہے لہٰذا اس میں کوئی کمزوری

نہیں ہو سکتی ہے۔ یہی حال خواہشات کا ہے کہ پروردگار عالم نے خواہشات پر عصمت کے پہرے بٹھا دیئے ہیں اور قوت غضب پر آیت تطہیر کا پہرا بٹھا دیا ہے نہ خواہش بہک سکتی ہے نہ غضب بہک سکتا ہے۔ لہٰذا جس بات کی خواہش کریں سمجھو مطابق قرآن ہے، مطابق وحی ہے، مطابق اسلام ہے۔ اور اس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ اگر اہلبیتؑ کی کوئی ایک خواہش بھی مرضیٔ پروردگار کے خلاف ہوتی تو یہ ناممکن تھا کہ وہ پیغمبرؐ کو کسی طرف اشارہ کریں اور پیغمبر اُدھر مڑ جائیں، وہ پیغمبرؐ سے کسی راستہ پر چلنے کے لئے کہیں اور حضور اسی راستہ پر چلنے لگیں۔ اس لئے کہ حضورؐ کسی کی خواہش کا اتباع نہیں کر سکتے ہیں۔ پیغمبر تو بولتے بھی نہیں ہیں جب تک وحی الٰہی نہ آجائے۔ حالانکہ پیغمبرؐ کے دل میں جو خواہش پائی جاتی ہے وہ بھی قلب پیغمبرؐ کی خواہش ہے۔ ہماری اور آپ کی خواہش نہیں ہے اور قلب پیغمبرؐ قلب ہونے کے اعتبار سے بھی ہمارے دلوں سے زیادہ طیب و طاہر اور پاکیزہ ہے کہ وہ سارے نفوس کو پاکیزہ بنانے کے لئے آئے ہیں تو ان کے نفس میں اگر پاکیزگی نہ ہوگی تو کہاں ہوگی۔ تو نبی میں جو خواہش پیدا ہو ظاہر ہے کہ وہ پیغمبرانہ خواہش ہے۔ مگر اس کے بعد بھی خدا کہتا ہے کہ میرا پیغمبر ایسا پاکیزہ کردار ہے کہ اپنی خواہش سے بولتا بھی نہیں ہے، عمل تو بڑی بات ہے تو جو نبی بول بھی نہ سکتا ہو اپنی خواہش سے وہ بچوں کے کہنے پر ادھر اُدھر چلا جائے گا؟ وہ بچوں کے پشت پر آ کے بیٹھ جانے سے سجدہ کو طول دے دیگا؟ جو اپنی خواہش کا اتباع نہ کر سکتا ہو وہ غیر کی خواہش کا اتباع کیسے کرے گا۔ اب اگر نبی مڑ جائے تو پہچانو کہ حسینؑ کی خواہش، خواہش نہیں ہے مرضی خدا ہے۔ بچپنے کا تقاضہ نہیں ہے مرضیٔ پروردگار ہے۔ اس لئے کہ اخلاق پیغمبرؐ مطابق قرآن ہے۔ صلوات

یہ چھوٹے چھوٹے واقعات جو سرکار سید الشہداؑ کے ہمارے سامنے صبح و شام آتے رہتے ہیں ضرورت ہے کہ انسان اُن واقعات کی معنویت پر غور کرے اور سرکار دو عالمؐ کے کردار کی روشنی میں، حضورؐ کی عظمتوں کی روشنی میں شہزادہ کی عظمتوں کا اندازہ کرے۔ معاملہ اگر یکطرفہ ہو تو کوئی بھی تنقید کی جا سکتی ہے۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ

ایک بچہ نماز پڑھ رہا ہو اور بہت خضوع وخشوع سے پڑھ رہا ہو تو آپ کے لئے یہ کہہ دینا بہت آسان ہے کہ بچہ ہے اس کا آج یہی موڈ آ گیا ہے لہٰذا نماز ایسی پڑھ رہا ہے۔ ایک بچے کو آپ نے دیکھا کہ وہ نماز جلدی جلدی پڑھ رہا ہے۔ آپ نے کہا بچہ تو پھر بچہ ہی ہے، اس کا اعتبار ہی کیا ہے۔ تو کسی ایک انسان سے مسئلہ کا تعلق ہو تو جو چاہے کہہ دیجئے کون روکنے والا ہے۔ مگر مسئلہ یہ نہیں ہے کہ حسینؑ بچے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ پیغمبر سجدہ میں ہیں اگر حسینؑ اپنی مرضی سے سجدہ میں طول بھی دینا چاہتے ہیں تو پیغمبرؐ تو کوئی بچے نہیں ہیں، وہ تو صاحب منصب ہیں۔ اس لئے کہ نماز آئی ہے اعلانِ رسالت کے بعد۔ ایک ایک لفظ کے معنی پہچانئے گا۔ اگر "پہلے نبی نہ بھی رہے ہوں" تو اب تو ہیں۔ "پہلے معصوم نہ رہے ہوں" اب تو معصوم ہیں۔ اب تو نماز پڑھ رہے ہیں مسلمانوں کو نماز پڑھا رہے ہیں۔ اب کم از کم بچوں کی خواہش کا احترام نہیں کرنا چاہیے۔ لہٰذا اگر کوئی انسان کہتا ہے کہ حسینؑ نے نبیؐ کو سجدہ میں روک لیا بچپنا تھا حسینؑ کاندھے پر آ کے بیٹھ گئے یہ بچپنا تھا۔ حسینؑ نے نانا کو ناقہ بنا لیا یہ بچپنا تھا۔ تو بچوں کا بچپنا تھا پیغمبرؐ کا بچپنا تو نہیں تھا۔ میں کبھی یہ دیکھتا ہی نہیں کہ یہ کیسے ہیں۔ میں تو انھیں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیسے ہیں۔ اور جب اُن کے کردار کو دیکھتا ہوں تو اِن کی بلندیٔ کردار کا اندازہ ہوتا ہے۔ صلوات

عزیزانِ محترم! ظاہری اخلاق اور ظاہری برتاؤ کے بارے میں جو باتیں میں گذارش کر رہا تھا۔ دو جملے اور عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ امام حسینؑ اور پیغمبرؐ اسلام کا اتحاد بھی سامنے آ جائے اور سرکار سید الشہدا کا ظاہری برتاؤ اور ظاہری اخلاق بھی آپ کے سامنے آ جائے۔ تاریخ میں دو واقعات ہیں جو عام مورخین نے بھی نقل کئے ہیں اور دونوں واقعات کا تعلق فقیروں سے ہے اور میں ان واقعات کو اس لئے آپ کے سامنے نقل کر رہا ہوں کہ برتاؤ کی اس سے اچھی مثال دنیا میں نہیں مل سکتی ہے اور اس کے لئے دو لفظیں اور تمہیداً گذارش کر دوں۔ غریب آدمی غریبوں کے ساتھ بیٹھ جائے تو کوئی ہنر نہیں ہے۔ فقیر آدمی فقیروں میں آ کے بیٹھ جائے

کوئی ہنر نہیں ہے۔ چھوٹا آدمی چھوٹے لوگوں میں آ کے بیٹھ جائے کوئی ہنر نہیں ہے۔ ہم تو اپنے دور میں بڑے آدمی کو غریبوں کی طرف سے گذرتے بھی نہیں دیکھتے ہیں، بیٹھنا تو بڑی بات ہے۔ یعنی غریب آدمی کے دل میں تو خالی حسرت رہ جاتی ہے بڑے آدمی کو دیکھنے کی۔ کبھی کبھی زندگیاں گذر جاتی ہیں اور بڑی شخصیتیں لوگوں کی نگاہ کے سامنے بھی نہیں آتی ہیں۔

امام حسینؑ تو دونوں اعتبار سے بڑے ہیں۔ دنیاوی اور ظاہری اعتبار سے بھی اور واقعی اعتبار سے بھی۔ اس لئے کہ وہ امام واجب الاطاعہ ہیں۔ اور ظاہری اعتبار سے بھی کون کائنات میں ایسا ہے جس کا نسب امام حسینؑ جیسا ہو۔ کوئی دنیا میں ایک انسان ایسا ڈھونڈ کے لائے کہ جس کا نسب امام حسینؑ جیسا ہو، جس کا باپ ویسا ہو جیسا ان کا باپ ہے۔ جس کی مادرِ گرامی ویسی ہو جیسی ان کی ماں ہے۔ جس کا نانا ویسا ہو جیسا ان کا نانا ہے۔ جس کا بھائی ویسا ہو جیسا ان کا بھائی ہے۔ جس کا بیٹا ویسا ہو جیسا ان کا بیٹا ہے۔ تو امام حسینؑ جیسا عظیم النسب، جلیل النسب، کریم النسب تاریخ میں کوئی انسان نہیں ہے۔

اس کے بعد دیکھئے کہ امام حسینؑ ایک راستے سے گذر رہے ہیں، ایک مقام پر دیکھا کہ فقیروں کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی ہے اور لوگوں نے کہا فرزندِ رسولؐ! ہم لوگ کھانا کھا رہے ہیں اور آپ اِدھر سے گذر رہے ہیں، ہمارا دل چاہتا ہے کہ آپ بھی ہمارے ساتھ بیٹھ جائیں۔

فرزندِ رسولؐ فوراً بیٹھ گئے، اُسی خاک پر بیٹھ گئے۔

لوگوں کو حیرت ہوئی کہاں امام حسینؑ، کہاں ہم غریب و فقیر؟ یہ دولتِ دین و دنیا کے مالک ہیں۔ یہ پیغمبرؐ کے نواسے ہیں۔ علیؑ کے بیٹے ہیں۔ ہر جلالت، ہر عظمت، ہر بزرگی، ہر بلندی ان کے واسطے ہے اور یہ ہمارے ساتھ کہاں بیٹھ گئے؟

امام حسینؑ چاہتے ہیں کہ میرے اخلاق کو پہچانو۔ یہ مروّت کا سودا نہیں ہے۔ یہ دکھاوے کا سودا نہیں ہے۔ یہ ریاکاری کا معاملہ نہیں ہے۔ میں اس لئے بیٹھ گیا کہ اپنے

لَا یُحِبُّ الْمُتَکَبِّرِیْنَ خدا مغرور لوگوں کو متکبر لوگوں کو، اپنے کو بڑا سمجھنے والوں کو دوست نہیں رکھتا ہے۔ چونکہ خدا نے اخلاق یہ قرار دیا ہے کہ انسان میں تکبر نہ ہو، لہٰذا میں بیٹھ گیا۔

اس کے بعد جو غریبوں کے پاس روکھی سوکھی روٹیاں تھیں امامؑ نے اس میں شرکت بھی فرمائی اور کھا لیا۔ اور اب دوسرا حکم قرآن آگیا هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۔ جیسے ہی دسترخوان سے اٹھے فرمایا تم نے مجھے مدعو کیا میں تمہارے ساتھ خاک پر بیٹھ گیا۔ میں نے تمہاری روکھی سوکھی روٹیوں میں حصہ لیا۔ اب میں تمھیں مدعو کر رہا ہوں، تمہارا بھی فرض ہے کہ میری دعوت کو قبول کرو۔

گویا کہ یہ ایک قرآنی تمثیل ہے جو کردارِ حسینؑ میں مجسم ہو رہی ہے۔ جب خدا نے فرمایا ہے کہ احسان کا بدلا احسان ہے تو اب میں تم کو اپنے گھر مدعو کر رہا ہوں۔ لوگوں نے کہا ٹھیک ہے، حضور بلا رہے ہیں ہم ضرور آئیں گے۔ آئے بیت الشرف میں۔ گھر کے اندر جا کے فرمایا۔ کیا ہے گھر کے اندر، جو کچھ ہے وہ جا کے لے آؤ اس لئے کہ ہم نے ان کو مدعو کیا ہے۔ اس کے بعد بلایا، بٹھایا۔ کھانا کھلانے کے بعد، جو کچھ بھی گھر میں سرمایہ تھا سب اٹھا کے ان غریبوں کے حوالہ کر دیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ قرآن مجید نے یہ بھی تعلیم دی ہے اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اگر تم کو کوئی ہدیہ دیا جائے کوئی تحفہ دیا جائے تو تم اس کو بہتر بنا کے واپس کرو۔ حد یہ ہے کہ اسلام، سلام میں بھی راضی نہیں ہے کہ اگر کوئی سلام کرے تو ویسے ہی جواب دو بلکہ اس سے بہتر جواب دو۔ تو جو لفظوں میں یہ چاہتا ہے کہ بہتر بنا کے واپس کیا جائے وہ کردار میں تو اس سے زیادہ مطالبہ کریگا۔ واقعہ دو لمحوں میں گذر گیا، مگر جس کی دو لمحوں کی زندگی میں اتنی قرآنی آیتیں مجسم ہو جائیں اس کی پوری حیات کا جائزہ لیا جائے تو قرآن اسی کردار میں مجسم دکھائی دے گا۔ صلوات

بس عزیزو بات کو سمیٹ رہا ہوں۔ یہ ایک واقعہ تھا۔ دوسرا واقعہ بھی بعینہ ایسا ہی ہے کہ غریبوں کی جماعت بیٹھی ہوئی ہے، لوگ کھانا کھا رہے ہیں۔ فرزند رسولؐ کا گذر ہو گیا۔ لوگوں نے گذارش کی آئیے حضور آپ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو جائیے۔

امام بیٹھ گئے۔ لوگوں نے کہا حضور کچھ کھا لیجئے؟ فرمایا میری مجبوری ہے۔ میں کچھ کھا نہیں سکتا ہوں۔ خدا متکبروں کو دوست نہیں رکھتا ہے لہٰذا میں بیٹھ گیا، مگر افسوس کہ میں تمہارے ساتھ کھانا کھا نہیں سکتا ہوں۔ شائد بیچاروں نے سوچا ہو کہ ہم نے تو دیکھا تھا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں اور مولا کھا بھی لیتے ہیں، لیکن ہمارے ساتھ کھانے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ کیا ہمارے اندر کوئی عیب ہے، ہمارے کھانے میں کوئی خرابی ہے؟ شائد ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا ہو تو امام نے خود وضاحت فرمادی کہ تم لوگ جو کھانا کھا رہے ہو یہ لوگوں کے گھروں سے بطور صدقہ لائے ہو، اور ہم اہلبیتؑ کو پروردگار عالم نے اس منزل پر رکھا ہے کہ ہمارے جدِّ بزرگوار نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ لوگوں کے ہاتھوں کا صدقہ ہم اہلبیتؑ کے لئے جائز نہیں ہے۔ اگر ہمارے لئے یہ پابندیٔ شریعت نہ ہوتی تو جیسے ان غریبوں کے ساتھ بیٹھ گئے تھے اور کھانا کھایا تھا تمہارے ساتھ بھی کھا لیتے۔ یعنی اگر کل کھایا تھا تو وہ بھی قانون شریعت کی تمثیل تھی اور اگر آج نہیں کھا رہے ہیں تو یہ بھی قانون الٰہی کی تمثیل ہے اور اس کے بعد اسی انداز سے انہیں مدعو کیا۔ اپنے گھر لے گئے۔ فرمایا قنبر بتاؤ گھر کے اندر کیا ہے؟ قنبر نے گذارش کی مولا! کچھ پیسے ہیں اور کچھ سامان ہے، مگر وہ پیسے اور سامان آپ نے کسی ضرورت کے واسطے رکھوایا ہے۔ فرمایا کوئی حرج نہیں۔ اس سے اچھی ضرورت کیا ہے کہ بندگانِ خدا محتاج ہیں لہٰذا ان کے ساتھ اچھا برتاؤ ہونا چاہئے۔ بالآخر جو بھی تھا وہ ان غریبوں کے حوالہ کر دیا۔ تو میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ بظاہر واقعات بہت مختصر دکھائی دیتے ہیں مگر ان واقعات کی روشنی میں اس اسلامی کردار کو پہچانا جا سکتا ہے جو اہلبیتؑ نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور بات تمام کرتے ہوئے ایک آخری فقرہ اور سُن لیجئے کہ اسلامی اخلاق وہی ہے جس میں تعلیمات قرآن کو مجسم کر دیا جائے۔ یہ نہ کوئی ظاہری برتاؤ ہے اور نہ زندگی کا رکھ رکھاؤ ہے۔ نہ کوئی مظاہرہ ہے نہ کوئی ریاکاری ہے۔ اگر تعلیم قرآن کے مطابق ہے تو اس کا نام اخلاق ہے چاہے دیکھنے میں بُرا معلوم ہو۔ اور اگر تعلیمات قرآن کے خلاف ہے تو چاہے دیکھنے میں اچھا دکھائی دے مگر اسی کا نام بداخلاقی ہے۔ اس لئے کہ ہمارے یہاں اخلاق کا فیصلہ انسانی برتاؤ

سے نہیں ہوتا ہے، قرآنی تعلیمات سے ہوتا ہے۔ الٰہی تعلیمات سے ہوتا ہے یعنی ہو سکتا ہے کہ برتاؤ اچھا دکھائی دے مگر بد اخلاقی ہو، اور ہو سکتا ہے کہ برتاؤ غلط دکھائی دے مگر اسی کا نام اخلاق پڑ جائے۔ اس لئے کہ پیغمبرؐ یا اہلبیت پیغمبرؐ قانون الٰہی کے پابند ہیں، لوگوں کی پسند اور ناپسند کے پابند نہیں ہیں۔ ہم نے اخلاقِ پیغمبرؐ کے دو واقعات دیکھے ہیں کہ اغیار، بہکے ہوئے لوگ، گمراہ لوگ، راہِ حق سے ہٹے ہوئے، عیسیٰ جیسے بندۂ خدا کو خدا کا بیٹا کہنے والے مگر جب پیغمبرؐ کی محفل میں آگئے، تو حضورؐ کھڑے ہو گئے، کیوں اسلئے کہ قرآن کی تعلیم ہے، جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ جب بحث کرنے کا وقت آئے تو ویسے بحث کرو جو بہترین طریقہ ہو۔ اگر اس وقت ان کا احترام نہ کیا جائے گا تو یہ پہلے ہمیں بد اخلاق سمجھ لیں گے اور پھر ہماری بات کا اعتبار کیسے پیدا ہو گا۔ تو چونکہ مسئلہ دین اسلام کے تعلیمات کو سمجھانے کا ہے لہٰذا غیر آیا تو کھڑے ہو گئے۔

مسلمانوں کو شاید بُرا لگا ہو، مگر اسلام نے اسی کا نام اخلاق رکھا ہے اور اسی کا نام اخلاق ہے چاہے کسی کو بُرا لگے۔

اب تو معلوم ہو گیا کہ بُرا لگنا معیار نہیں ہے۔ قانونِ الٰہی معیار ہے۔ لہٰذا ہم نے حیاتِ پیغمبرؐ میں دونوں منظر دیکھ لئے۔ اغیار آئے تو ان کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، اپنے آئے تو انھیں اٹھا دیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے لئے اُٹھ جانے میں مذہب کا بچاؤ تھا۔ انھیں محفل سے اٹھا دینے میں مذہب کا تحفظ تھا۔ صلوات

کردار پیغمبرؐ، کردار آل محمدؐ، سلوک سرکار سید الشہداءؑ غریبوں کے ساتھ، مسکینوں کے ساتھ، فقیروں کے ساتھ، یہ اس بات کی بہترین علامت ہے کہ قرآن مجید کی تجسیم ہے کردار اہلبیتؑ میں۔ امام حسینؑ کی زندگی کو اگر پہچاننا ہے تو آئینۂ قرآن میں دیکھو۔

یہ تو غریبوں کا ذکر ہے۔ غریب تو پھر آزاد ہوتے ہیں۔ غلاموں کی تو کوئی اوقات ہی نہیں ہوتی ہے، آج تک ساری دنیا جو ہنگامہ کر رہی ہے کہ اسلام نے چند دنوں کے لئے بھی غلامی کو کیوں قبول کر لیا؟۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ساری دنیا یہ محسوس

کر رہی ہے کہ غلامی کوئی بہت بڑی ذلّت ہے، غلامی بہت بڑی حقارت ہے۔ لہٰذا اسلام کو روزِ اوّل ہی غلامی کے خلاف آواز اٹھا کے اس کا خاتمہ کر دینا چاہئے تھا۔ گویا معاشرہ میں غلاموں کی کوئی اوقات نہیں تھی۔ مگر اسی معاشرے میں اگر اہلبیتؑ کا برتاؤ غلاموں کے ساتھ دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ دنیا کے لوگوں نے آزاد افراد کے ساتھ وہ برتاؤ نہیں کیا ہے جو برتاؤ اہلبیتؑ نے غلاموں کے ساتھ کیا ہے اور اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ غلامی کا مزاج ہوتا ہے آزادی طلب ہونا۔ اسی لئے اسلام نے ہزار راستے آزادی کے نکالے ہیں۔

کفّارہ میں غلام کو آزاد کر دو۔

کارِ خیر میں آزاد کر دو۔

غلاموں کو راستہ بتایا کہ اپنے مالک سے سودا طے کر لو اور پھر محنت و مشقت کر کے اپنی آزادی کا انتظام کر لو۔

زکوٰۃ نکالنے والوں سے کہا۔ غلاموں پر صَرف کرو تا کہ یہ بیچارے آزاد ہو جائیں۔

بہر حال غلامی کا مزاج ہوتا ہے آزادی طلب ہونا۔ یہ تنہا اہلبیتؑ کے غلاموں میں دیکھا ہے کہ اگر آزاد بھی کر دیا تو کوئی جانے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے۔

یہ ایک واقعہ نہیں، کتنے واقعات ہیں اہلبیتؑ کی زندگی میں۔ خود امام حسینؑ کا واقعہ ہے کہ غلام مولا کی خدمت میں آیا اور اس کے اعمال میں کچھ کوتاہی پیدا ہو گئی، اُس نے محسوس کیا کہ کہیں امام کو غصّہ نہ آجائے۔ لہٰذا اس نے کہا وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ خدا نے ان بندوں کی تعریف کی ہے جو غصّہ کو پی جاتے ہیں۔ فرمایا ہاں ہاں میں نے غصّہ کو ضبط کر لیا۔

کہا۔ مگر خدا کہتا ہے وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ۔ یہ وہ ہیں جو بندوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

فرمایا جاؤ میں نے معاف بھی کر دیا۔

کہا۔ مگر خدا تو کہتا ہے وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۔ خدا نیک عمل کرنے والوں

کو دوست رکھتا ہے۔

فرمایا جاؤ راہ خدا میں آزاد کر دیا۔

امامؑ نے تو قرآن کی ہر آیت کو، ہر جملہ کو، ہر فقرہ کو مجسم کر دیا۔ مگر جب آزادی مل گئی تو اب غلام جانے کا ارادہ نہیں کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا کی آزادی میں وہ لذت ملنے والی نہیں ہے جو آلِ محمدؐ کی غلامی میں ہے۔

آج مختصر سا تذکرہ چند لمحوں میں انھیں افراد کا پیش کرنا ہے جو کربلا میں سماجی اعتبار سے اور معاشرتی اعتبار سے غلام تھے، مگر حسینؑ نے انھیں محسوس نہیں ہونے دیا کہ یہ غلام ہیں۔

انھیں یہ خیال تھا کہ ہم میں کچھ کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا امام کے سامنے ان ساری باتوں کو رکھ دیا تاکہ دنیا میرے مولا کے کردار کو پہچان لے۔

جب غلام آیا آقا کے سامنے اجازت لینے کے لئے، اور فرزندِ رسولؐ نے فرمایا کہ میں نے آج سب کو اجازت دے دی ہے جو جانا چاہے وہ چلا جائے۔ مگر غلاموں میں ابوذر کا ایک غلام جون ہے جو مولا کے سامنے کھڑا ہے۔ آپ نے فرمایا جون! تمھیں تو معلوم ہے کہ میں نے سب سے کہہ دیا ہے کہ جو جانا چاہے چلا جائے۔ میں مسلسل اعلان کر رہا ہوں کہ یہ میرے خون کے پیاسے ہیں۔ یہ میری جان کے دشمن ہیں۔ جو جانا چاہے چلا جائے۔ ہر ایک کی گردن سے میں اپنی بیعت کو اٹھائے لیتا ہوں۔ جون نے عجیب فقرہ کہا۔ مولا! جب اس زندگی میں کچھ آرام کرنا تھا تو آپ کے ساتھ رہا اور جب مصیبت کا وقت آیا ہے تو آپ کو چھوڑ کے چلا جاؤں؟ پیغمبرؐ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ مولائے کائناتؑ کی بارگاہ میں روزِ قیامت کیسے جاؤں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ آپ کو چھوڑ کے چلا جاؤں۔ مجھے تو آپ ہی کی خدمت میں رہنا ہے۔ یہاں تک کہ وقت آگیا اور قربانی کا مرحلہ سامنے آگیا تو پھر گئے۔ کہا مولا اجازت دیجئے؟ فرمایا کیسے جانے دوں اے جون، میں نے تم کو اپنے بیمار بیٹے کی عیادت کے لئے رکھا ہے۔ اس لئے کہ خیام حسینؑ کا جو عالم ہے ابھی میرے بیمار کو ایک خدمت گذار چاہئے، ایک تیماردار چاہئے۔ میں نے تم کو بیمار کی تیمارداری کیلئے

محفوظ رکھا ہے۔ اگر تم بھی چلے جاؤ گے تو میرے بیمار کی تیمارداری کون کرے گا۔ ہاں اگر بیمار ہی اجازت دیدے تو میں روکوں گا نہیں۔ بس یہ سننا تھا عزیزو کہ جون آئے خیمۂ بیمار کی پشت پر اور آکے آواز دی۔ نبیؐ کے لال! بیمار امامؑ کے کانوں میں آواز جون آئی آنکھیں کھول دیں۔ ارے یہ تو جون کی آواز ہے۔ خیر تو ہے۔ جون کیوں آئے؟ کہا مولا میں آقا کے سامنے گیا تھا۔ میدان میں جانے کی اجازت مانگ رہا تھا۔ فرمایا میں نے تم کو بیمار کی خدمت کے لئے بچا کے رکھا ہے۔ آقا آپ فرمائیے آپ کیا کہتے ہیں۔ میں آپ کی خدمت کروں یا آقا پر قربان ہو جاؤں؟ ہاں رونے والو عابد بیمارؑ نے یہ فقرہ سنا فرمایا:

"جون اگر میرے مقدر میں نہیں ہے کہ میں بابا پر قربان ہو جاؤں تو کم سے کم تم ہی جا کے قربان ہو جاؤ، مجھے کوئی تیمارداری درکار نہیں ہے، مجھے کوئی خدمت درکار نہیں ہے۔"

جون مولا کے سامنے آئے، دست ادب جوڑ کے کھڑے ہوئے۔ کہا آقا بیمار نے تو رخصت کر دیا ہے اب آپ مجھے کیوں روکنا چاہتے ہیں؟ کیا اس لئے روکیں گے کہ میرا رنگ سیاہ ہے؟ کیا اس لئے روکیں گے کہ میرے پسینہ سے بو آتی ہے؟ کیا میرا خون اس قابل نہیں ہے کہ شہیدوں کے خون میں شامل ہو جائے؟ بس یہ کہہ کے جون نے عجب فقرہ کہا۔ اے میرے مولا! اے زہراؑ کے لال! اگر میری محبت سچی ہے، اگر میرا جذبۂ غلامی صادق ہے۔ تو یہی کہ میرا خون بھی آپ کے خون میں شامل ہو جائے۔

حسینؑ نے کلیجہ سے لگالیا۔ جون یہ کیا کہا جاؤ میں نے اجازت دے دی۔ چاہنے والا میدان میں آیا، راہ خدا میں جہاد کرتا رہا۔ مگر جب گھوڑے سے گرا۔ سن لو عزیزو غلام نوازی کی دو منزلیں، دو غلاموں کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ تاریخ کربلا میں ہے۔ ایک جون ہیں اور ایک غلام اور ہے۔ دونوں کی زندگی کے دو واقعات دو لفظوں میں۔ اس سے زیادہ گذارش نہیں کروں گا۔ آپ کے رونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ جیسے ہی جون کی آواز کانوں میں آئی۔ مولا غلام دنیا سے جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ جانتے ہیں سارے اصحاب حسینؑ گھر والوں سے پہلے کام آگئے ہیں۔ صبح سے حملۂ اولیٰ سے چاہنے والے قربان ہو رہے ہیں۔ ظہر سے پہلے چاہنے والے قربان ہوتے رہے۔ ظہر کے بعد جو باقی رہے وہ قربان ہوتے رہے جب تک

ایک ایک ناصر، ایک ایک مددگار کام نہیں آ گیا اس وقت تک بنی ہاشم کے جوانوں کی باری نہیں آئی۔ جون کا شمار اصحاب میں ہے یا انصار میں ہے یعنی جب جون کام آ گئے ہیں، گھوڑے سے گرے ہیں تو عباسؑ موجود تھے، علی اکبرؑ موجود تھے، ہاشمی جوان موجود تھے۔ مگر مولانے یہ بھی گوارا نہیں کیا کہ غلام کو اتنی ہی عزت دیدیتے کہ بیٹا تم چلے جاؤ، عباسؑ تم چلے جاؤ، برادران عباسؑ سے کہتے تم چلے جاؤ۔ ہاشمی جوانو! تم چلے جاؤ۔ نہیں کوئی نہ جائیگا میں خود جاؤں گا۔ مولا دوڑ کے مقتل میں آئے جون کا لاشہ اٹھانے کے لئے۔ یہ ایک غلام نوازی تھی جس کو جون کی زندگی میں دیکھا۔ اور دوسرا غلام جب گھوڑے سے گر کر آواز دیتا ہے تو حسینؑ مقتل میں آئے مگر اس وقت پہونچے جب غلام غش کے عالم میں تھا۔ سر اٹھا کے زانو پر رکھا۔ چاہتے ہیں غلام کو ہوش میں لایا جائے۔ مگر کوئی قطرۂ آب تو نہیں ہے، رخسارہ پر رخسارہ رکھ دیا۔ اب جو حسینؑ کے آنسوؤں کی گرمی محسوس ہوئی تو غلام نے آنکھیں کھول دیں۔ ارے مولا یہ کیا کر رہے ہیں؟ کہاں آپ کا رخسارہ جسے پیغمبرؐ بوسہ دیتے تھے اور کہاں غلام کا رخسارہ؟۔ فرمایا تم نے راہِ خدا میں قربانی دی ہے، یہ تمہارا حق ہے جو حسینؑ تمہارے ساتھ یہ برتاؤ کر رہا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

چوتھی مجلس

خطابت امام حسین علیہ السّلام

"حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اللہ اس سے محبت کرے جو میرے حسینؑ کو دوست رکھے"

سرکارِ دو عالمؐ کے اس ارشادِ گرامی کی روشنی میں عرفانِ حسینؑ کے حوالے سے جو سلسلۂ کلام آغازِ محرم سے آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اس کے چوتھے مرحلہ پر کچھ باتیں خطابت امام حسین صلوات اللہ وسلامہ علیہ سے متعلق پیش کرنا ہیں۔

امام حسینؑ کے خطبات کو پیش کرنے سے پہلے چند لفظیں اصل موضوع "خطابت" سے متعلق۔ اگرچہ یہ لفظ ہمارے یہاں اتنا عام ہو گیا ہے کہ جس کے معنی بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی نہ کسی مقدار میں تمام سُننے والے لفظ خطابت سے باخبر ہیں۔ بلکہ شائد بعض حضرات اتنا باخبر ہوں جتنا واقعاً نہیں ہے۔

انسانی زندگی میں دو مرحلے ہوتے ہیں۔ ایک مرحلہ بات کی حقیقت کا پیش کرنا ہے، چاہے کسی کے لئے قابلِ قبول ہو یا نہ ہو۔ اور دوسرا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ بات کو دوسرے سے منوا لیا جائے، اُس کے دل میں اُتار دیا جائے، چاہے اس کی کوئی حقیقت ہو یا نہ ہو۔

انسانی گفتگو میں دونوں طرح کی باتیں پائی جاتی ہیں۔ ایسے بولنے والے بھی آپ کو ملیں گے جو غلط کبھی کچھ نہیں کہتے۔ ان کی ہر بات عقل و منطق کے مطابق ہر بات حقائق کے مطابق اور ہر بات عقل کی میزان پر تلی ہوئی ہوتی ہے۔ مگر اس کے بعد ان کے اندر

یہ صلاحیت نہیں ہوتی ہے کہ وہ اپنی سچی بات کو بھی دوسروں سے منوا سکیں، اور ان حقائق کے بارے میں دوسروں کو مطمئن کرسکیں۔

اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی بات کو وہ خود بھی جانتے ہیں کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور شائد سننے والا بھی اگر غور کرے تو اُسے یہ اندازہ ہوجائے گا کہ اس بات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ لیکن ان میں بولنے کی ایسی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے بولنے سے سننے والے کو بہرحال مطمئن کر لیتے ہیں۔

خطابت درحقیقت اسی دوسرے رُخ کا نام ہے جہاں انسان میں فطری اعتبار سے یا فنی اعتبار سے اتنی صلاحیت پائی جاتی ہے کہ انسان اپنی بات سے دوسرے انسان کو مطمئن کرسکے، چاہے وہ خود بھی مطمئن نہ ہو۔ اگر آپ دورِ حاضر کی تاریخ خطابت کا جائزہ لیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ شائد یہ ایک بڑی جماعت اور ایک بڑی تعداد ہے جس میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ اپنی بات سننے والوں کو سمجھا بھی دیں اور اسے منوا بھی لیں، چاہے اپنے ضمیر کے اعتبار سے خود اس بات سے مطمئن نہ ہوں جس بات سے دوسرے کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ ساری پریشانی یہی ہے کہ کہنا وہ ہے جو لوگوں کے دل کو لگ جائے، لوگوں کو پسند آجائے۔ اس کے بعد خدا خوش ہوگا کہ ناراض ہوگا، اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ "اب تو آرام سے گذرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے"۔ بہرحال یہ دونوں رُخ انسانی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ خطابت کا تعلق دوسرے رُخ سے ہے جہاں بات سے دوسرے کو مطمئن کیا جائے، اُسے قائل اور قانع بنایا جائے۔ لیکن اگر اسی کے ساتھ ساتھ پہلا رُخ بھی جمع ہوجائے تو یہی معراج خطابت ہے۔ یعنی انسان جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ واقعاً حق ہو، صداقت ہو، سچائی ہو، واقعیت ہو اور صلاحیت اتنی ہو کہ اس واقعیت کو انسان کے دل و دماغ تک پہونچا دے اور واقعیت سے انسان کو مطمئن کردے جب کہ عوام الناس غیر حقیقی باتوں سے جلدی مطمئن ہوتے ہیں اور حقائق سے دیر میں مطمئن ہوتے ہیں۔

یہ بولنے والے کا کمال ہوتا ہے کہ حقائق کو لوگوں کے دلوں میں اُتار دے اور

حقائق سے سامعین کو مطمئن کر دے، یہی معراج خطابت ہے۔

دنیا کے سارے اہلِ خطابت میں اور مذہب کے ذمہ دار خطیبوں میں ایک بنیادی فرق یہی ہوتا ہے کہ بات سمجھانا سب کو آتا ہے، بات منوانا سب کو آتا ہے، ہمخیال بنالینا سب کو آتا ہے۔ مگر کتنے ایسے بھی ہیں کہ انھیں حقائق معلوم ہی نہیں ہیں، یا حقائق کا اظہار نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ مذہب کی ذمہ داری انسان کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ فنکاری کا مظاہرہ بعد میں ہو، حقیقت بیانی پہلے ہو۔ پہلے حقیقت بیانی کی صلاحیت پیدا کرو اس کے بعد اگر مالک نے بولنے کی طاقت دی ہے تو اس طاقت کو راہِ حقیقت میں صَرف کرو۔ اوہام، خیالات، تصورات اور بے بنیاد باتوں میں خبردار صَرف مت کرنا۔ یہ پروردگارِ عالم کی ایک امانت ہے جس کا نام ہے قوتِ خطابت۔ اور امانت میں خیانت بہرحال جائز نہیں ہے۔

مالکِ کائنات نے انسان پر جو سب سے پہلا احسان کیا ہے اور بتایا ہے کہ میری رحمت کا سب سے بڑا مرتبہ اور سب سے پہلا مرتبہ یہ ہے کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وہ رحمٰن ہے جس نے قرآن کی تعلیم دی ہے۔ انسان کو پیدا کیا ہے اور انسان کو قوتِ بیان دی ہے۔

خلقت کے بعد کسی احسان کا ذکر خدا نے کیا ہے تو وہ قوتِ بیان ہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ساری زندگی میں دو عظیم احسانات ہیں۔ ایک وجودِ انسانی ہے اور ایک بیانِ انسانی ہے۔

جتنا بڑا احسان انسان کو پیدا کر دینا ہے اتنا ہی بڑا احسان انسان کو قوتِ بیان دے دینا ہے۔ ورنہ جذبات ہوتے، خواہشات ہوتے، ضمیر میں باتیں ہوتیں، اور قوتِ بیان نہ ہوتی تو انسان لمحوں میں گھٹ کے مر جاتا۔

ایک تجربہ آپ نے دنیا میں کیا ہوگا کہ اگر کوئی انسان ایسا پایا جاتا ہے جو گونگا ہو، بولنے کے لائق نہ ہو تو وہ بہرا بھی ہوتا ہے۔ یعنی یہ تو ہو سکتا ہے کہ آدمی بہرا ہو، گونگا نہ ہو، لیکن ایسے افراد مشکل سے ملیں گے جو گونگے ہوں اور بہرے نہ ہوں ــــ یہ

پروردگار کا کرم ہے انسان پر کہ انسان نہ سُنے مگر دل کی بات کہہ تو سکتا ہے اپنے جذبات کا اظہار تو کر سکتا ہے۔ لیکن اگر زبان بند ہو جائے اور بولنے کے لائق نہ رہ جائے تو خدا ایسے انسان پر یہ احسان کرتا ہے کہ اس کی قوت سماعت کو بھی روک لیتا ہے کہ اگر دنیا کی باتیں سُنے گا اور اپنی بات کہنے کے لائق نہ رہ جائے گا تو تھوڑی دیر میں گھٹ جائیگا اور انسان فنا ہو جائے گا۔ ایسے ہی حالات میں اندازہ ہوتا ہے کہ قوتِ بیان کتنی بڑی نعمتِ پروردگار ہے۔ صلوات

یہ اتنا بڑا احسان الٰہی ہے کہ اللہ نے خلقت کے بعد اسے دوسرا احسان قرار دیا ہے۔

اس کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ قوت بیان میں اللہ نے کتنے شعبے قرار دیئے ہیں۔

ایک لفظ کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا کہ مولائے کائنات نے ارشاد فرمایا ہے کہ پروردگار عالم نے وجود انسانی پر جو احسانات فرمائے ہیں ان میں ایک بڑا احسان یہ بھی ہے کہ دنیا میں کہیں گوشت کو بولتے نہیں دیکھا ہے۔ مگر اس نے اسی گوشت کو دہن میں رکھ دیا ہے تو قوت گویائی بھی دے دی ہے۔ یہ زبان کیا ہے ایک گوشت کا ٹکڑا ہی تو ہے۔ نہ اس پر کوئی جلد ہے نہ اس میں کوئی ہڈی پائی جاتی ہے۔ ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جسے پروردگار عالم نے قوت گویائی دیدی ہے۔ بولنے کی طاقت دیدی ہے اور اللہ کے اس احسان کا قیاس نہ دنیا کی کسی مشین پر کیا جا سکتا ہے اور نہ دنیا کے کسی ٹائپ رائٹر پر۔

آپ دیکھتے ہیں کہ اکثر دفتروں میں یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ آپ عربی اور انگریزی دونوں خانہ بھر دا کرلے آئیں۔ یعنی جو عربی والا خانہ ہے وہ بھی پُر کرنا ہے اور جو انگریزی والا ہے وہ بھی پُر کرنا ہے۔ آپ اس فارم کو پُر کرنے کے لئے کسی دوکان پر گئے جہاں وہ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں جو فارم بھرنا جانتے ہیں۔ اب جو وہاں پہونچے تو ان سے کہا بھائی یہ فارم اس طرح بھرا جائے کہ جو عربی والا خانہ ہے وہ بھی بھر جائے اور جو انگریزی والا ہے وہ خانہ بھی بھر دیا جائے۔ ہم نے دیکھا کہ وہاں دو آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔

پہلے ایک نے ہمارے فارم کو لیا، اس نے سارے فارم کو بھر دیا۔ اس کے بعد اسی کاغذ کو بڑھا دیا دوسرے کی طرف۔ اب اس نے لکھنا شروع کر دیا۔ میں نے کہا کیا آپ تنہا یہ کام نہیں کر سکتے ہیں دو آدمی کریں گے تو دُہرے پیسے مانگیں گے۔ آپ اکیلے اس کو کر دیں گے تو شائد کوئی ڈسکاؤنٹ ہو جائے۔ کہنے لگے ہمارے پاس جو مشین ہے، جو ٹائپ رائٹر ہے اس میں انگریزی کے حروف پائے جاتے ہیں، لہٰذا ہم نے انگریزی والا ٹائپ کر دیا ہے اب آپ ان کے پاس لے جائیں وہ عربی والا ٹائپ کریں گے یعنی اِس کے حروف الگ ہیں اُس کے حروف الگ ہیں۔ اِس کے آلات الگ ہیں اُس کے آلات الگ ہیں۔ یعنی ایک مشین دُہرے کام نہیں کر سکتی ہے۔ مگر ایک انسان جو عربی بھی جانتا ہے، اردو بھی جانتا ہے، انگریزی بھی جانتا ہے، اس کے وجود میں کتنی مشینیں فٹ کی گئی ہیں کہ ایک ہی زبان جو آپ کو اللہ نے دی ہے اسی زبان سے ابھی آپ مڑ کے اردو والے سے بات کر رہے تھے کہ ایک لمحہ کے بعد اُدھر مڑ گئے عربی بولنے لگے۔ ایک لمحہ کے بعد اِدھر مڑ گئے انگریزی بولنے لگے اُدھر مڑ گئے پنجابی میں بات کرنے لگے۔ اِدھر چلے گئے پشتو میں بات کرنے لگے۔ ہر آدمی حیرت زدہ ہے، یہ کتنی مشینیں اندر فٹ کر دی گئی ہیں۔

لاکھوں کا سرمایہ خرچ کرنے کے بعد جو ایک مشین بنائی جاتی ہے وہ اُس زبان میں کام آئی تو اس لہجہ میں کام نہ آئی۔ اُس زبان میں کام آئی تو اِس زبان میں کام نہ آئی۔ اور اگر کوئی مشین کام بھی آ گئی تو لفظوں میں کام آئی لہجہ میں کام نہیں آئی مگر پروردگار عالم نے جو قوت بیان انسان کو دی ہے اِس زبان میں اتنی طاقت دیدی ہے کہ لفظیں بھی اسی میں پائی جاتی ہیں، لہجے بھی اسی میں پائے جاتے ہیں۔ کوئی مشین ایسی نہیں ہے جو ہمارے لہجہ کی ترجمانی کر سکے۔ لفظیں تو ہماری سب ٹائپ ہو گئیں مگر ہم یہ لفظیں کیوں ٹائپ کر رہے تھے۔ یہ الفاظ ہم نے بطور احترام کہے تھے یا بطور توہین کہے تھے یہ مشین کا کام نہیں ہے۔ یہ اللہ نے صلاحیت صرف زبان کو دی ہے۔ اگر اس نکتہ پر آپ غور کریں گے تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ دیکھنے میں بڑا چھوٹا سا

وجود ہے مگر وہ بابرکت وجود ہے کہ جذبات گھٹ جاتے اگر یہ وجود نہ ہوتا، انسانی بیان کی ترجمانی نہ ہوسکتی اگر یہ وجود نہ ہوتا، انسانی لہجوں میں فرق واضح نہ ہوسکتا اگر یہ وجود نہ ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے مولانے فرمایا ہے اَلْمَرْءُ بِاَصْغَرَیْهِ انسانی وجود کا دارومدار دو چھوٹی چیزوں پر ہے۔ ہاتھ کی وہ اہمیت نہیں ہے پیروں کی وہ قیمت نہیں ہے۔ دو چھوٹی چیزیں ہیں ایک اندر رکھ دی گئی ہے۔ ایک باہر رکھ دی گئی ہے۔ اندر دل رکھا گیا ہے۔ باہر زبان رکھی گئی ہے۔ انھیں دونوں پر انسانی کمال کا دارومدار ہے۔ اندر اس کا دل ہے جس میں معلومات ہیں، جذبات ہیں، خواہشات ہیں۔ اور باہر وہ زبان ہے جو ان جذبات کا اظہار کرتی ہے۔ تو جب انسانیت کا دارومدار انھیں دو پر ہے تو جب تک ان کے تعلقات ٹھیک رہیں گے کام انسانیت کے مطابق ہوتا رہے گا اور جب ان میں جھگڑا شروع ہوجائے گا تو کام تباہ ہوجائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کی پہچان ہی یہ قرار دی گئی ہے کہ جو دل میں ہوتا ہے وہ زبان پر ہوتا ہے اس کے خلاف نہیں ہوتا ہے۔ اور منافق کی پہچان یہ ہے کہ زبان پر کچھ اور ہوتا ہے اور دل میں کچھ اور ہوتا ہے۔

پروردگار عالم نے انسانیت کا دارومدار انھیں دو پر رکھا ہے جتنا انھیں ہم آہنگ بنادوگے اتنی ہی انسانیت ترقی کرتی جائے گی۔ صلوات

تو یہ قوت بیان جو پروردگار نے انسان کو عنایت فرمائی ہے اسی قوتِ بیان کے ایک کرشمے کا نام ہے "خطابت"۔

اسی قوت بیان سے آپس کی باتیں بھی ہوتی ہیں، اسی قوتِ بیان سے رازداری بھی ہوتی ہے، اسی قوتِ بیان سے جذبات کا اظہار بھی ہوتا ہے اور اسی قوتِ بیان کے ایک شعبے کا نام ہے خطابت۔ جہاں انسان کو مالک اتنی صلاحیت دیدیتا ہے کہ وہ اپنی بات سے دوسروں کو مطمئن کرسکتا ہے۔ تو اگر پروردگار عالم نے سارے انسانوں میں یہ صلاحیت رکھ دی ہے کہ اپنی بات کو منوا سکتے ہیں تو جن کو خدا بھیجتا ہی ہے اپنی بات منوانے کے لئے، انسانیت کو پیغامِ خدا سنانے کے لئے، بشریت کو

راہِ حق پر لانے کے لئے۔ انھیں خدا جو قوت بیان دے گا وہ یقیناً عام انسانوں کی قوتِ بیان سے زیادہ ہو گی۔

سب کی قوت بیان میں اور ان کی قوت بیان میں فرق یہ ہو گا کہ سب کی قوت بیان جب ظاہر ہو گی تو اسے بلاغت کہا جائے گا' اور ان کی قوت بیان جب سامنے آئے گی تو اسے نہج بلاغت کہا جائے گا۔ صلوات

ہمارا آپ کا بیان' ہماری آپ کی گفتگو اور ہماری آپ کی تقریر بلاغت کی حدود میں آسکتی ہے لیکن بلاغت کا نہج نہیں بن سکتی ہے' بلاغت کا راستہ نہیں قرار پا سکتی ہے۔ یہ پروردگار عالم کے وہ بندے ہیں جن کو مالک نے اسی مقصد کے لئے بھیجا تھا کہ عالم انسانیت کو پیغام الٰہی سے مطمئن کریں۔ لہٰذا ان کو وہ صلاحیت بیان دیدی ہے جو دنیا میں کسی اور انسان کو حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے جب اپنے فضائل و مناقب کا اعلان فرمایا تو فرمایا کہ میرے امتیازات میں ایک امتیاز خدا نے یہ رکھا ہے کہ مجھے "جوامع الکلم" عنائت فرمائے ہیں۔ ایسے کلمے مجھے سکھائے ہیں کہ لفظ ایک ہی ہو گا مگر معنی میں اتنی جامعیت ہو گی کہ اک کائناتِ معنی ہو گی جو لفظوں کے اندر سمٹ جائے گی۔

بہر حال خطابت کا کام ہوتا ہے اپنی بات سے دوسروں کو مطمئن کر دینا' اپنی بات کو لوگوں کے دلوں میں اُتار دینا۔ چاہے بات صحیح ہو یا غلط ہو۔ صحیح ہو جائے تو یہ کمال خطابت ہے لیکن کارِ خطابت نہیں ہے۔ خطابت کا کام ہے فقط مطمئن کر دینا۔

اب اگر اتنی بات آپ کے ذہن میں ہے تو میں قرآن مجید کی انھیں آیات کو جن کو میں نے ابھی آپ کے سامنے پڑھا ہے پھر دُہرانا چاہتا ہوں تاکہ آپ اللہ کے بندوں کی خطابت کے انداز اور اللہ کے نمائندوں کی خطابت کے انداز میں فرق محسوس کر سکیں۔ بندوں کی خطابت اور ہے' نمائندوں کی خطابت اور ہے۔ بندوں کی خطابت' ایسا بولنے کا سلیقہ جو اپنے سُننے والوں کو مطمئن کر لے' چاہے صحیح ہو یا غلط۔ لیکن نمائندوں کی خطابت میں یہ گنجائش نہیں ہے۔ وہ مطمئن بھی کر لیں گے اور جو بات کہیں گے

سچی اور واقعی بھی ہو گی۔ اَلرَّحْمٰنُ وہ رحمن ہے۔ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ اس نے قرآن کی تعلیم دی ہے۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ انسان کو پیدا کیا ہے۔ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ اُسے بیان سکھایا ہے۔ تو خلقت کے بعد بیان کا ذکر آیا جو اک عام طاقت ہے۔ جسے اللہ نے بندوں کو عنایت کیا ہے۔ لیکن نمائندوں کی طاقت کو پہچنوانے کے لئے خلقت سے پہلے تعلیم قرآن کا ذکر کیا۔ یعنی خلقت کے بعد جن کا بیان سامنے آتا ہے وہ یہ سب بندے ہیں۔ اور جن کا علم قرآن پہلے ہے خلقت بعد میں ہے ان کا بیان جب سامنے آتا ہے تو بیان کی بنیادیں اسی قرآن پر ہوتی ہیں جس کا علم انھیں دیا گیا ہے اور وہ نمائندے ہیں۔ صلوات

گویا کچھ ایسے بندے بھی ہیں جنھیں مالک نے پہلے علم قرآن دیا ہے، اس کے بعد اس دنیا میں بھیجا ہے اور وہ جب بیان کریں گے تو اس قوت بیان کی بنیاد قرآن اور کلام الٰہی ہو گا۔

ان کی خطابت اور ان کی تقریر میں خبردار کوئی بے بنیاد بات تلاش نہ کرنا۔ اس کی بنیاد ہم نے خود بتا دی ہے۔ تو ہماری خلقت کے ساتھ خدا نے قوت بیان رکھی مگر علم نہیں رکھا ہے۔ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا ایسا پیدا کیا ہے کہ بالکل جاہل تھے۔ ہم دنیا میں آئے تو خدا نے یوں بھیجا کہ بالکل جاہل تھے۔ ہمارے پاس خلقت اور خلقت کے ساتھ بیان تھا علم نہیں تھا۔ ان کے پاس علم۔ علم کے بعد خلقت، اور خلقت کے ساتھ بیان، تو دونوں کا فرق واضح ہو گیا کہ ہم جب بولیں گے تو اپنی معلومات سے بولیں گے۔ جتنا سیکھتے جائیں گے بولتے جائیں گے۔

بچہ گود میں ہے۔ کسی نے کہا ان کو ماں کہو۔ اس نے ماں کہہ دیا۔ کہا ان کو باپ کہو۔ اس نے باپ کہہ دیا۔ ماں نے گود میں بٹھا کر کہا بیٹا کہو اللہ ایک۔ اللہ ایک کہہ دیا۔ تو جو کہا جا رہا ہے اسی کو بچہ دُہرا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے کی زبان کو مادری کہا جاتا ہے کہ جو ماں بتاتی جاتی ہے وہی وہ دُہراتا جاتا ہے۔ اب میں ایک لفظ کہوں گا شائد آپ کو یاد رہ جائے۔ جو ماں کے بتانے سے بات کو دُہراتا

ہے۔ اس کی زبان کو ماں کی زبان کہا جاتا ہے اور جو خدا کے پڑھانے سے بات کو دُہراتا ہے۔ اس کی زبان کو لسان اللہ کہا جاتا ہے۔ صلوات

یہ وہ نہیں ہیں جو دنیا کی سکھائی ہوئی باتوں کو دُہراتے ہوں۔ یہ اپنا علم اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں پروردگار عالم نے انھیں علم قرآن دے کر بھیجا ہے۔ لہٰذا جتنی ان کی گفتگو ہے سب قرآن کی ترجمانی ہے۔ قرآن کی تفسیر ہے۔ قرآن کی شرح ہے جب پروردگار عالم نے قرآن دے کر بھیجا اور ان کی ساری قوت بیان تفسیر قرآن ہے۔ تو جب ضرورت پڑے گی کہ قرآن کو کوئی مفسر دیا جائے تو کس کا نام لیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک سرکار دو عالمؐ رہے خود تفسیر قرآن کرتے رہے اور جب جانے لگے تو قرآن کو لاوارث نہیں چھوڑا ہے، نہ امت کے رحم وکرم پر چھوڑا ہے کِتَابَ اللہِ وَعِتْرَتِیْ اَهْلَبَیْتِیْ میں کتاب خدا بھی چھوڑے جا رہا ہوں اور اہلبیتؑ کو بھی چھوڑے جا رہا ہوں اس لئے کہ یہی وہ ہیں جو قرآن سے بولتے ہیں، یہی وہ ہیں جو قرآن کی ترجمانی کرتے ہیں، یہی وہ ہیں کہ جن کا ہر لفظ تفسیر قرآن حکیم ہے۔ لہٰذا بندوں کی زبان اور ہے نمائندوں کی زبان اور۔ یہ اللہ کے نمائندے ہیں تو بندوں کی خطابت پر نمائندوں کی خطابت کا قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے اور نمائندوں کی خطابت پر دنیا کے بندوں کا قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اسی ایک لفظ کو آپ ذہن میں رکھیں گے اور اسی سلسلۂ بیان کو میں آخر تک پہونچانا چاہتا ہوں۔ جو اللہ کے نمائندے ہیں ان کا لہجہ بھی، ان کا انداز بھی، ان کا اسلوب بھی، ان کا سلیقہ اور طریقہ بھی وہ ہے جو لوگوں کو مطمئن کر سکے، بات کو دل میں اُتار سکے اور ان کی باتیں، ان کے حقائق اور ان کی گفتگو کا مواد جو دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں وہ سب حقیقی ہے، منطقی ہے، عقلی ہے۔ اس میں کوئی بات نہ بے بنیاد ہے اور نہ کوئی بات ایسی ہے کہ جو فضا میں اُڑ جانے کے قابل ہو۔ یہاں تک آنے کے بعد اب خطابت کی ایک کمزوری بھی آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ قوانین اسلام کی مصلحتیں بھی ہم پہچان سکیں۔ اور وہ یہ ہے کہ جب انسانی خطابت

اور اس کی قوت بیان کا سب سے اچھا مصرف یہ ہے کہ انسان اپنی بات سے سب لوگوں کو مطمئن کر سکے۔ لیکن اس کمال کے اظہار سے ایک کمزوری انسان میں پیدا ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب انسان دیکھ لیتا ہے کہ لوگ ہماری بات سے مطمئن ہو جاتے ہیں، ہماری بات پر قانع ہو جاتے ہیں، ہماری بات مان لیتے ہیں تو اس وقت کمزوریاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔

پہلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ ذہن میں غرور پیدا ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنے بچپنے میں یہ سنا تھا لیکن نہ میں کل اس سے متفق تھا اور نہ آج متفق ہوں لیکن بہرحال بزرگ ہمیشہ یہی سکھایا کرتے تھے کہ اگر مجلس پڑھنا سیکھنا ہو تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ منبر پر بیٹھنے کے بعد یہ سمجھو کہ سب سے بڑے پڑھے لکھے ہم ہیں، باقی جتنے بیٹھے ہیں سب جاہل ہیں تاکہ بولنا آجائے اور ہمت پیدا ہو جائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جب بچے نے یہ سیکھ لیا تو واقعاً ایسی ہمت پیدا ہو گئی کہ کتابیں پڑھنے کی توفیق بھی نہیں ہوتی اور کہتے ہیں کہ پچیس سال کی ریسرچ کا رزلٹ ہے جو آپ کو دے رہا ہوں۔ اگر کوئی پوچھ لے کہ کتاب کی ہجے کیا ہوتی ہے، کس زبان کی کتاب پڑھ لی ہے تو جواب دیتے نہ بن پڑے۔ لیکن بہرحال دھیرے دھیرے جب لوگ بات ماننے لگتے ہیں تو یہ خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ انسانی ذہن میں غرور پیدا ہو جائے۔ اور دوسرا عیب خطابت کا یہ ہے کہ انسان کو ہمہ وقت یہ فکر لگی رہتی ہے کہ سامعین خوش ہو جائیں، اس لئے کہ اس نے کل فن ہی یہی سیکھا ہے کہ انھیں مطمئن کرنا ہے۔ لہٰذا اگر یہ سچ سے مطمئن ہوتے ہیں تو سچ بولو اور اگر یہ جھوٹ سے مطمئن ہوتے ہیں تو جھوٹ بولو اور اسطرح کبھی جھوٹ بولنے کا یا خلاف مرضیٔ پروردگار بولنے کا جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ رضائے خدا ذہن سے نکل جاتی ہے اور بندوں کی رضا ذہن میں سما جاتی ہے۔

اگر دنیا کے کسی گوشے میں، کسی خطے میں خطابت کا کوئی عیب پایا جاتا ہے تو وہ عیب یہی ہے کہ بولنے والے کو ساری پریشانی یہی رہتی ہے کہ لوگ ہم سے خوش ہو جائیں۔ ہمارے سماج کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک صاحب ایک مقام پر گئے تقریر

کرنے کے واسطے اور دیکھا کہ جو لوگ سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، بالکل ہی دین سے مذہب سے، اللہ رسول سے کوئی رشتہ نہیں رکھتے ہیں۔ تو بیچارے نے سوچا کہ ان کو راہِ حق پر لایا جائے لہٰذا شروع ہو گئے۔ یہ کام نہ کرو گے تو جہنم میں جاؤ گے، وہ کام نہ کرو گے تو جہنم میں جاؤ گے۔ ایسا کرو گے تو جہنم میں جاؤ گے، ویسا نہ کرو گے تو جہنم میں جاؤ گے۔

ایک بیچارہ درمیان میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا حضور! کچھ جنت کی باتیں بھی کیجئے، کہا۔ وہاں کی بات سن کے کیا کرو گے جہاں جانا ہی نہیں ہے۔ ارے اس جگہ کو پہچانو جہاں جانا ہے تاکہ ابھی سے تیار ہو کے جاؤ۔ ظاہر ہے کہ جن کے پاس دین و مذہب نہیں ہے، ان کے پاس خطیب کا احترام کیا ہوگا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے ہی سب کو جہنم میں ڈھکیلنے کا ارادہ کیا ویسے ہی سب نے حملہ کر دیا۔ کسی صورت سے بیچارے وہاں سے جان بچا کے بھاگے۔ لیکن اس تلخ تجربے نے اس بات پر آمادہ کر دیا کہ اب آئندہ جہنم کا نام ہی نہ لیا جائے گا۔ چنانچہ اب جو دوسرے گاؤں میں پہونچے تو وہاں جنت کا ذکر شروع کر دیا۔ کوئی کام کرو یا نہ کرو جنت تمھاری ہے۔ دین دار ہو جاؤ جنت تمھاری ہے۔ بے دین ہو جاؤ جنت تمھاری ہے۔ نماز پڑھو جنت تمھاری ہے۔ نماز چھوڑ دو جنت تمھاری ہے۔ جو چاہو کرو جنت تمھاری ہے۔ ایک بیچارہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا حضور! اگر ایسے ہی آپ سب کو جنت میں پہونچا دیں گے تو جہنم کا کیا ہوگا۔ کچھ جہنم کے بارے میں بھی تو بتلائیے؟۔ کہا بھئی جو میں جانتا تھا وہ میں نے بتا دیا ہے، باقی جب آپ جائیں گے تو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔

تو انسانی کردار میں یہ عیب پیدا ہو جاتا ہے کہ انسان کی فکر ہوتی ہے کہ سننے والا کیسے خوش ہو جائے، کیسے مطمئن ہو جائے۔ لیکن یہ بندوں کی خطابت ہے۔ جو اللہ کے نمائندے ہیں ان کی خطابت میں نہ وہ تصور پیدا ہو سکتا ہے اور نہ یہ تصور پیدا ہو سکتا ہے۔ غرور کا وہاں کیا گذر ہے جہاں مالک انھیں ساری کائنات سے بلند تر بنا دے اور اتنا اونچا بنا دے کہ سید الملائکہ بھی نہ جا سکے۔ اور پھر وہاں بھی جائے تو سر سجدۂ معبود ہی میں رکھے اور پھر جن کو پروردگار نے اپنی مشیت کا ترجمان بنا دیا ہے ان کی زندگی

میں غلط بیانی کا کیا تصور ہو سکتا ہے کہ وہ بندوں کو راضی کرنے کے لئے خدا کو ناراض کر دیں۔ یہ ہر ایک کے کردار میں ہو سکتا ہے، نمائندۂ پروردگار کے کردار میں نہیں ہو سکتا ہے۔ مگر چونکہ ہمارے کردار میں یہ خطرہ تھا لہٰذا پروردگار نے اس کا بھی ایک انتظام کر دیا۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ مسجدوں میں ایک مرکزی جگہ ہوتی ہے جس کا نام ہوتا ہے محراب اور اُسی محراب کے برابر میں دو چار زینے یا کوئی نہ کوئی بلندی معین کیجاتی ہے جس کا نام ہوتا ہے منبر۔ ہر مسجد میں یہ دونوں جگہیں پائی جاتی ہیں۔ مرکزی جگہ کا نام ہے محراب اور بلندی کو کہا جاتا ہے منبر۔

منبر کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ تین زینے یا چار زینے کا ہو، بلکہ ہر وہ بلندی جہاں سے بات کہی جائے اسی کو منبر کہا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ لکڑی کا بنایا جائے، ہو سکتا ہے پتھر کا بنایا جائے، ہو سکتا ہے پلاسٹک کا بنایا جائے، ہو سکتا ہے لوہے کا بنایا جائے اور مصلحت پروردگار ہو تو اونٹوں کے کجاؤں کا بنا دیا جائے۔ ہر وہ بلندی جہاں سے بات کہی جاتی ہے اسے منبر کہا جاتا ہے۔ یہ وہ اسلامی طریقۂ کار ہے جو سرکار دو عالمؐ نے رائج کیا۔ کہ مسجد میں انتظام محراب بھی کیا اور انتظام منبر بھی کیا۔ اور پھر وہ نماز جس میں ہفتہ میں ایک دن بھی سارے مسلمانوں کو ایک مقام پر لا کر جمع کیا گیا یعنی نماز جمعہ۔ اس نماز جمعہ میں دونوں کا مصرف مقرر کر دیا۔

نماز جمعہ میں دونوں کا مصرف ہوتا ہے۔ نماز ظہر میں محراب کام آتی ہے منبر کام نہیں آتا ہے اور موعظہ کا وقت آجائے تو منبر کام آتا ہے محراب کام نہیں آتی ہے لیکن نماز جمعہ میں دونوں کا مصرف ہوتا ہے، منبر بھی کام آتا ہے اور محراب بھی کام آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں جمعہ کی نماز ہو گی وہاں خطبہ بھی ہوگا اور کسی فقہ اسلامی میں یہ اجازت نہیں دی گئی ہے کہ کسی بیچارہ بڑا بڑے بوڑھے مقدس کو محراب میں کھڑا کر دیا جائے اور تیز طرار بولنے والے بلیغ انسان اور بہترین خطیب کو منبر پر کھڑا کر دیا جائے۔ بلکہ اسلامی قانون میں جو خطیب ہوگا وہی امام

بھی ہو گا۔ جو خطبہ پڑھے گا وہی امام بھی ہو گا۔ گویا اسلام نے ایک بہترین سلیقہ سکھا دیا ہے دونوں کے مصرف کا کر لوگوں کے سمجھانے کے لئے وہ آئے جو محراب میں کھڑے ہونے کے لائق ہو اور نصیحت وہ کرے جو خود صاحب کردار ہو اور امامت وہ کرے جو نصیحت کرنے کے قابل ہو، یہ دو الگ دنیا میں نہیں ہیں۔

ہماری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہم نے امامت کو عدالت سے مربوط کر دیا ہے اور خطابت کو عدالت سے آزاد کر دیا ہے، حالانکہ اسلام کا مزاج یہ نہیں ہے اسلام نے دونوں کو ساتھ رکھا ہے۔ دونوں کو الگ کرنے کا فساد یہ ہے کہ منبر تقویٰ سے الگ ہو گیا ہے۔ کردار سے الگ ہو گیا ہے۔ دینداری سے الگ ہو گیا ہے۔ کتنے نالائق دنیا کے ایسے ہوں گے جو منبر کے اوپر آکر بیٹھ جاتے ہیں اور محراب کے قابل نہیں ہوتے ہیں اور شائد الگ کرنے والوں نے مصلحتاً ہی الگ کیا تھا اور اسلام نے دونوں کو یکجا کر دیا ہے کہ وہی خطابت کرے گا اور وہی امامت بھی کرے گا تاکہ معلوم ہو جائے کہ جیسے امام بننے کے واسطے عدالت ضروری ہے ویسے ہی خطیب بننے کے واسطے بھی کردار چاہئے، دینداری چاہئے۔ ایسا نہیں ہے کہ جو چاہے تقریر کرنا شروع کر دے اور جو چاہے کہنا شروع کر دے۔ اگر صاحب کردار نہ ہو گا تو اس کی بات کا اثر کس پر ہو گا اور دوسروں کو دعوت عمل کیسے دے گا۔

اس کے بعد ایک مسئلہ جو میں گزارش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہاں ایک ہی آدمی خطیب بھی ہے اور امام بھی ہے وہاں بھی دونوں کاموں میں ایک فرق ہے کہ جب اُدھر سے اِدھر رُخ کرتا ہے تو خطیب کہا جاتا ہے۔ یعنی جب اس کا رُخ بندوں کی طرف ہوتا ہے تو اسے خطیب کہا جاتا ہے اور جب بندوں سے منھ موڑ کے اُدھر رُخ کرتا ہے تو اسے امام کہا جاتا ہے۔ آدمی ڈو نہیں ہوتے ہیں آدمی ایک ہی ہوتا ہے۔ لیکن خطیب اور امام میں فرق یہ ہوتا ہے کہ جب تک ہماری طرف رُخ کر کے بولتا ہے کہا جاتا ہے مولانا ابھی خطبہ پڑھ رہے ہیں اور پھر تھوڑی دیر کے بعد خطبہ پڑھ چلے گئے تو نماز شروع ہو گئی۔ کیسے معلوم ہوا؟ ۔ کہا دیکھتے نہیں مجمع سے منھ موڑ لیا۔ تو

جب اِدھر رُخ ہوتا ہے تو خطیب ہوتا ہے اور جب رُخ اُدھر ہو جاتا ہے تو امام ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ دو طرح کے کیرکٹر نہیں ہیں، دو طرح کے کردار نہیں ہیں، دو طرح کے کام ہیں۔ ایک کام کا نام ہے خطابت، جو مجمع کی طرف رُخ کر کے انجام پاتا ہے۔ اور دوسرے کا نام ہے امامت جو اُدھر رُخ کر کے انجام دیا جاتا ہے۔ اب پروردگار یہ چاہتا ہے کہ کام بٹ جائیں لیکن کردار نہ بٹنے پائے۔ لہٰذا خطیب سے کہا کہ جیسے ہی بندوں کی طرف رُخ کرو پہلے کہو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یعنی خطبہ شروع کرو تو حمد خدا سے شروع کرو، تاکہ یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ اُدھر سے مڑ گئے ہیں تو اُسے بھول گئے ہیں۔ آپ خطبۂ جمعہ کے احکام پڑھ لیجئے گا رسالۂ عملیہ میں۔ اس میں لکھا ہے کہ واجبات میں یہ ہے کہ حمد پروردگار کرے۔ ایسا نہ ہو کہ جب بندوں کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہو گئے تو خدا کو بھول گئے اور صرف مومنین کرام یاد رہ گئے۔ ان کا ذکر تو بعد میں آئے گا۔ پہلے کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تاکہ ہر سُننے والا محسوس کرے کہ رُخ اِدھر ہے مگر ذہن اُدھر ہے۔ اور جب رُخ محراب کی طرف کیا تو اسلام نے دوسرا انتظام کر دیا۔

اگر دور سے آواز آجائے یا اللہ! ۔ اگر آخری صف سے آواز آجائے یا اللہ! تو رکوع کو طول دو (سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ وَبِحَمْدِهٖ ۔ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ وَبِحَمْدِهٖ) تاکہ یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ اُدھر گئے تو اِدھر والوں کو بھول گئے۔ صلوات

اِدھر رُخ کرو تو حمد پروردگار کرو تاکہ خدا ذہن سے نہ جانے پائے۔ اُدھر رُخ کرو تو کمزوروں کا خیال رکھو تاکہ بندے ذہن سے نہ جانے پائیں۔ ہم نے ایک انسان کو دو کام اسی لئے حوالہ کئے ہیں تاکہ ہر انسان اپنے اندر یہ جامعیت پیدا کرے۔ نہ خدا کو لے کے بندوں کو بھول جائے اور نہ بندوں کو لے کے خدا کو بھول جائے۔

جو اس نکتہ کو نہ سمجھے وہ یہی سوچتے رہ گئے کہ جب سائل کو انگوٹھی دے دی تو نماز کا کیا ہوگا؟ یہ بیچارے یہ سمجھے کہ نماز بندوں سے غافل ہونے کا نام ہے۔ انہیں کیا خبر کہ یہی کمال نماز ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ خدا نے علیؑ کی ولایت کے اعلان کیلئے

وہ موقع منتخب کیا جہاں نماز بھی ہو اور زکوٰۃ بھی ہو۔ نماز علامت ہے کہ اُدھر ہے۔ زکوٰۃ علامت ہے کہ ادھر ہے۔ صلوات

اب بات آگئی ہے تو اک آخری جملہ اس سلسلہ کا اور سُن لیجئے اور اس کے بعد چند فقرے اپنے اس موضوع سے متعلق گذارش کروں گا۔

گویا کمال امامت یہی ہے کہ بندوں کو ساتھ لے کے چلو۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری فقہ کا قانون ہے کہ امام اگر پستی میں ہو تو ماموم بلندی پر ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ماموم پستی میں ہو تو امام بلندی پر نہیں ہو سکتا ہے، اس لئے کہ امام کا کام ہے کہ قوم کو بلند بنائے۔ امام کا کام یہ نہیں ہے کہ قوم کے کاندھوں پر خود بلند ہو جائے۔ صلوات

یہاں تک اگر آپ متوجہ ہیں تو ایک آخری لفظ اور سن لیجئے۔ یہ ہفتہ وار اجتماع جو رکھا گیا تھا جس کی بہت سی برکتوں سے ہم آپ محروم ہو گئے ہیں غیبت امام کی بنیاد پر۔ پروردگار عالم وہ وقت لائے جب وہ منظر عام پر آجائیں اور عالم اسلام واقعی برکتوں سے فائدہ اٹھا سکے۔ انشاء اللہ المستعان۔ یہ نماز مسلمانوں کے اجتماع کے لئے ہے، اس کا اور کوئی پس منظر نہیں ہے۔ لہٰذا کہا گیا کہ جن کو ہم نے بُلایا ہے پہلے ان کو سمجھاؤ اس کے بعد مصلے پر آؤ۔ اور اس کے بعد جو نماز عید کے دن ہوتی ہے یہ ایک مہینے کے روزے کی توفیق کا شکریہ ہے۔ لہٰذا پہلے خدا کا شکریہ ادا کرو تب بندوں سے بات کرو۔ شائد یہی وجہ ہے کہ جمعہ کا خطبہ پہلے ہوتا ہے اور نماز بعد میں ہوتی ہے۔ اور عید کا سجدہ پہلے ہوتا ہے اور خطبہ بعد میں ہوتا ہے۔ صلوات

اتنی باتیں جو آپ کے ذہن عالی میں ہیں ان کا نچوڑ دو لفظوں میں یہ ہے کہ خطابت ایک انداز بیان ہے اور ایک سلیقہ ہے جو پروردگار عالم عنایت کرتا ہے۔ اس سلیقہ کو صحیح راستے پر لگانا یہ ہماری آپ کی ذمہ داری ہے۔ مگر جو نمائندگان پروردگار ہیں ان کو اللہ نے یہ سلیقہ دیا ہے کہ وہ ہمیشہ صحیح راستے پر ہی لگائیں گے، کبھی غلط راستے پر نہیں لگا سکتے ہیں۔ اس کے بعد اب ائمہ طاہرین کی زندگی پڑھیں، سرکار دو عالم کی حیات کا جائزہ لیں، حضورؐ کے خطبے، مولائے کائنات کے خطبے جن کا مجموعہ ہمارے سامنے

نہج البلاغہ" کی شکل میں موجود ہے۔ امام حسینؑ کے خطبات جن کا مجموعہ ہمارے سامنے موجود ہے اور میں آخری مرحلہ میں آپ ہی کے خطبات میں سے چار فقرے گذارش کر کے بیان کو تمام کر دینا چاہتا ہوں جن خطبوں کے فقرات کا تعلق ہے واقعۂ کربلا سے۔

یوں تو زندگی میں امام حسینؑ کے خطبات بہت ہیں لیکن یہ چار خطبات ہیں جن کا تعلق واقعۂ کربلا سے ہے، جہاں امام حسینؑ نے قوم کو خطاب کر کے، لوگوں کی طرف رُخ کر کے انھیں حقائق سے آگاہ کرنا چاہا ہے۔ میں چار ہی جملے سناؤں گا۔ کتابیں موجود ہیں جائیں آپ ان کا مطالعہ کریں۔ خود میری کتاب بھی ہے اور دیگر کتابیں حضرات علمار نے تفصیلی لکھی ہیں انھیں پڑھیں — میں اجمالی طور پر اس لئے بتا رہا ہوں کہ جب کتاب پڑھیں آپ، تو اس کتاب سے مطالب کو نکالنے میں سہولت ہو۔

ایک موقعہ تھا جب امام حسینؑ مکہ سے نکل رہے تھے، ہر ایک کو یہ خیال تھا کہ مدینہ چھوڑا تھا کہ مدینہ خطرہ کی جگہ ہے۔ مدینہ میں پناہ نہیں مل سکتی ہے۔ تو مکہ تو حرم خدا ہے "مَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا" جو یہاں آجائے اس کے لئے امن و امان ہے۔ اب حسینؑ مکہ چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں، لہٰذا فرزند رسولؐ نے اپنا فریضہ سمجھا کہ لوگوں کو آگاہ کر دیا جائے کہ میں مکہ چھوڑ کے کیوں جا رہا ہوں۔

یہ پہلا موقع تھا جب امام حسینؑ نے راہِ کربلا میں، کربلا جاتے ہوئے خطبہ ارشاد فرمایا مکہ کی سرزمین پر اپنے قیام کی بنیادوں کو سمجھانے کے لئے اور اس میں یہ سمجھایا کہ میں نے کیوں قیام کیا ہے۔ میرے جدّ بزرگوار کی تعلیم کیا تھی، میرے جدّ بزرگوار کی ہدایات کیا ہیں۔ جن ہدایات پر عمل کرنے کے لئے اب میں مکہ چھوڑ کے عراق جا رہا ہوں۔ اس کے بعد دوسرا موقع آیا جب امام حسینؑ کی ملاقات ہوئی حُر کے لشکر سے۔ اس موقع پر امام حسینؑ کے دو خطبے ہیں چھوٹے چھوٹے۔ مگر دونوں میں حقائق ہیں۔

پہلا خطبہ امام حسینؑ نے لشکر سے خطاب کر کے فرمایا کہ میں خود نہیں آیا ہوں جو تم میرا راستہ روکنے آئے ہو۔ تمھارے خطوط میرے پاس آئے ہیں۔ تم نے مجھے بلایا ہے، تم نے مجھے وطن سے باہر نکالا ہے، اب اس کے بعد تم میرا راستہ روکنا چاہتے ہو۔ آخر یہ

کون سا طریقہ ہے۔ امام کے اس مختصر خطبے کا بہر حال اتنی مقدار میں اثر یقیناً ہوا کہ جب وقت نماز آگیا اور نماز کے لئے امام نے فرمایا کہ حُر میں نماز ادا کرنے جا رہا ہوں۔ تم بھی اپنی قوم کے ساتھ، اپنے سپاہیوں کے ساتھ نماز ادا کر لو کہ مسلمان تم بھی ہو کلمہ پڑھتے ہو اور ہر مسلمان کو نماز پڑھنا چاہیے۔

حُر نے کہا فرزند رسولؐ! یقیناً یہ میرے سپاہی ہیں، میں ان کا سردار ہوں، میں ان کا امیر و رئیس ہوں، مگر یہ ناممکن ہے کہ میں آپ کے ہوتے ہوئے نماز پڑھاؤں۔ آپ نماز پڑھائیں گے میں بھی آپ کے پیچھے نماز پڑھوں گا اور یہ لشکر بھی پڑھے گا۔ یہ امام حسینؑ کے خطبہ کا پہلا اثر تھا۔ جہاں امام حسینؑ نے نماز پڑھائی اور جب نماز تمام ہو گئی تو اس کے بعد پھر گفتگو شروع ہوئی یہاں تک کہ نماز عصر تمام ہو گئی۔ اب لوگ آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو پھر امام حسینؑ نے ایک مختصر سا خطبہ ارشاد فرمایا۔ تم لوگوں کو معلوم ہے کہ میرے جدّ بزرگوار نے فرمایا تھا کہ اگر کوئی ظالم بادشاہ کو دیکھے جو حرامِ خدا کو حلال بنا رہا ہے، عہدِ خدا کو توڑ رہا ہے اور پیغمبر اسلامؐ کے کردار کی مخالفت کر رہا ہے اور اس کے بعد چُپ رہ جائے تو اس قابل ہے کہ خدا اس کو جہنم میں ڈال دے۔ اور تمھیں معلوم ہے کہ یزید کا کردار کیا ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ تمھارے حاکم کا کردار کیا ہے۔ میرے جدّ بزرگوار کی ہدایت ہے کہ ایسے موقع پر مسلمان خاموش نہیں رہ سکتا ہے لہٰذا قیام واجب ہے۔ میں اپنے واجب کو ادا کرنے کے لیے اٹھا ہوں۔

تیسرا موقعہ ہے کربلا کے میدان میں۔ امام حسینؑ نے روز عاشور دو خطبے ارشاد فرمائے ہیں۔ ایک خطبہ اوّل صبح امام حسینؑ نے ارشاد فرمایا اور وہ خطبہ میدان میں جا کے نہیں بلکہ خیمہ گاہ کے سامنے۔ اور دوسرا خطبہ تھا جو امام حسینؑ نے اس کے بعد میدان میں صفِ دشمن کے سامنے آکے ارشاد فرمایا تھا۔ پہلا خطبہ تھا خیمہ گاہ سے قریب اور دوسرا خطبہ تھا میدان میں آنے کے بعد۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ امام حسینؑ نے جب پہلا خطبہ پڑھا ہے تو امام حسینؑ ناقہ

پر تھے اور جب دوسرا خطبہ پڑھا ہے تو امام حسینؑ گھوڑے پر تھے۔ یہ ساری باتیں وہ ہیں کہ اگر انسان غور کرے تو اندازہ ہوتا ہے کہ خطابت کوئی اتنا آسان کام نہیں ہے۔ اس فریضہ کو ادا کرنے کے لئے انسان کو کتنا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔

پہلا خطبہ امام نے ارشاد فرمایا جب آپ پُشتِ ناقہ پر تھے۔ اور دوسرا خطبہ ارشاد فرمایا جب آپ پُشتِ فرس پر تھے۔ اتنا فرق تو آپ لوگ جانتے ہیں کہ میدان جنگ میں جو جانور استعمال ہوتے ہیں ان میں گھوڑا شامل ہے اونٹ شامل نہیں ہے۔

امام حسینؑ نے پہلا خطبہ ناقہ کی پُشت پر ارشاد فرمایا۔ اس لئے کہ پہلا ہی خطبہ پُشتِ فرس پر فرمائیں گے تو دشمن کو خیال ہوگا کہ امام حسینؑ جنگ کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ امام حسینؑ چاہتے ہیں کہ پہلے حُجت تمام کی جائے لہٰذا اتنا اہتمام کیا کہ سواری بھی وہ استعمال نہ کی جو جنگ میں کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ امن کا پیغام پُشت ناقہ سے دیا جاسکتا ہے، پُشتِ فرس سے نہیں دیا جاسکتا ہے۔

اب آئیے دیکھیں مضمون کیا ہے۔ فرمایا اِنسِبُوْنِیْ مَنْ اَنَا۔ دشمنو! فوجیو! شام والو! میں کچھ نہیں کہنا چاہتا ہوں، صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر تم مجھے جانتے ہو تو بتاؤ کہ میں کون ہوں؟۔ میرا نسب بتاؤ۔ میری نسبتیں بتاؤ۔ مجھے پہچانو کہ میں کون ہوں۔ اور اگر نہیں پہچانتے ہو تو میں پہچنوائے دیتا ہوں۔ میں تمھارے نبیؐ کی بیٹی کا بیٹا ہوں۔ مجھ سے لڑنا چاہتے ہو۔ مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔ میرے نانا کا کلمہ پڑھنے کے بعد مجھے ذبح کرنا چاہتے ہو۔ پہچان لو میں تمھارے نبیؐ کی بیٹی کا بیٹا ہوں۔ اگر اب بھی نہیں پہچانا تو جن جن شخصیتوں کو پہچانتے ہو سب کو پہچانو۔ نبیؐ کو جانتے ہو وہ میرے نانا ہیں۔ حمزہؓ کو جانتے ہو وہ میرے باپ کے چچا ہیں۔ جعفرؓ کو جانتے ہو وہ میرے چچا ہیں۔ کس کو پہچانتے ہو۔ جتنی شخصیتیں اسلام میں گذری ہیں میں ساری شخصیتوں کا ایک نمائندہ ہوں۔ یعنی مجھ سے جنگ، تنہا مجھ سے جنگ نہیں ہے۔ مجھ سے جنگ، حمزہؓ سے جنگ ہے۔ جعفرؓ سے جنگ ہے۔ مجھ سے جنگ، پیغمبر اسلامؐ سے جنگ ہے۔ اب بھی غنیمت ہے مجھے پہچان لو۔

لیکن اس کا کیا جواب علاوہ آپ کو معلوم ہے، حملۂ اولیٰ شروع ہو گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ امام جب مقتل میں آئے اور آپ نے اپنے چاہنے والوں کو دیکھا تو بچاس لاشے چاہنے والوں کے خاک پر پڑے ہوئے تھے۔

بس عزیزو بیان تمام ہو رہا ہے، چند منٹ کے اندر مجلس تمام ہو جائے گی جب امام حسینؑ نے دیکھ لیا کہ حملہ شروع ہو گیا۔ جنگ کا آغاز ہو گیا، تو اب دوسرا خطبہ پڑھنے کے لئے پشتِ فرس پر سوار ہو کے آئے، فوجِ دشمن کے سامنے آئے اور اس کے بعد فرمایا:

آگاہ ہو جاؤ یہ نا تحقیق کا نا تحقیق بیٹا اس نے مجھے دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ یا تو میں تلوار کھینچ لوں یا ذلت برداشت کر لوں اور علیؑ کا بیٹا ذلت برداشت نہیں کر سکتا ہے، فاطمہؑ کا لال ذلت برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ لہٰذا میں آگیا ہوں۔ حجت تمام ہو چکی ہے۔ اب میں تلوار چلانے کے لئے تیار ہوں۔ اب میں جہاد کرنے کے لئے تیار ہوں۔

یہ ہے امام حسینؑ کے خطبوں کا خلاصہ جو میں نے آپ کے سامنے عرض کر دیا۔ مگر اس کے ایک ایک لفظ نے کتنا اثر کیا کہ جب در خیمہ کے قریب خطبہ پڑھ رہے تھے تو آواز خیمے میں جا رہی تھی۔ کہرام برپا ہو گیا سیدانیوں میں، بیبیوں میں۔ ارے مولا مرنے کی خبر سنا رہے ہیں، شہادت کی خبر سنا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر خاتون کا جذبۂ قربانی جوش مارنے لگا۔

میں سیدانیوں کا ذکر نہ کروں گا، علیؑ کی بیٹیوں کا کردار تو بہت بلند ہے۔ جو باہر کے افراد ہیں ان پر حسینؑ کی تقریر کا اثر کیا ہوا۔ بس تین جملے سنیں اور اس کے آگے کچھ گذارش نہ کروں گا۔

ایک منظر یہ دیکھا کہ جب بیٹا میدان میں جانے لگا اور ایک لمحہ کے لئے ٹھہر کے زوجہ سے باتیں کرنے لگا تو ماں نے پکار کے کہا بیٹا! کیا یہ زوجہ سے باتیں کرنے کا وقت ہے؟ جا اور جا کے فرزندِ رسولؐ کے قدموں پہ قربان ہو جا۔ ورنہ اگر بنی ہاشم کا کوئی بچہ بھی کام آگیا تو میں شہزادیوں کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہ جاؤں گی۔

یہ ماتا ہے ماتا، جو بیٹے کو میدان میں مرنے کے لیے بھیج رہی ہے۔ یہ پہلا اثر تھا۔

دوسرا اثر یہ دیکھا کہ جب شوہر میدان میں آگیا اور وہب نے جہاد شروع کر دیا تو ایک مرتبہ آہٹ محسوس کی۔ اب جو پلٹ کے دیکھا تو کیا دیکھا کہ زوجہ چلی آرہی ہے۔ کہا مومنہ! ابھی ابھی تو مجھے لے کے مولا کے پاس گئی تھی۔ یہ میدان میں کیوں آگئی؟ کہا تمہارے جانے کے بعد جب میں خیمہ میں گئی تو میں نے دیکھا کہ مولا کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں اور فرمارہے ہیں وَاغُرْبَتَاهُ۔ وَاقِلَّةَ نَاصِرَاهُ ہائے میری غربت میرے چاہنے والے مرے جارہے ہیں۔ اے وہب، کیا یہ منظر دیکھ کر میں خیمے میں بیٹھ جاؤں؟ یہ نہ ہوسکے گا۔

وہ ایک ماتا کا کردار تھا کہ بیٹے کو میدان میں بھیج دیا۔ یہ زوجہ کا کردار ہے کہ شوہر کے ساتھ میدان میں آگئی۔

اب ایک تیسرا کردار دیکھئے کہ امام حسینؑ مقتل سے خیمہ گاہ کی طرف آرہے ہیں۔ دیکھا خیمے کا پردہ اٹھا اور ایک بچہ خیمہ گاہ سے برآمد ہوا۔ آتے ہوئے بچے کو دیکھ کر فرمایا۔ حبیب ذرا اس بچے کو روکو۔ دیکھو یہ کہاں جارہا ہے۔ حبیب آگے بڑھے۔ بچے کو کلیجے سے لگایا۔ کہا بیٹا کہاں جارہے ہو، کیا ارادہ ہے؟ کہا جارہا ہوں مولاؑ کے قدموں پر سر قربان کرنے کے لئے! حبیب نے کہا ذرا پہچنواؤ تو کہ تم کون ہو؟ بچے نے اپنا تعارف کرایا۔ حبیب بچے کو لے کے مولاؑ کے سامنے آئے۔ بس اولاد والو آخری جملہ۔ میری بہنیں بھی سُن رہی ہیں اللہ ان کی اولاد کو سلامت رکھے۔ یہ کربلا ہے کربلا۔ جہاں مائیں یوں بچوں کو قربان کرتی ہیں۔ کہا بیٹا کیا ارادہ ہے؟ کہا جارہا ہوں آپ پر جان قربان کرنے کے لئے۔ کہا بیٹا ابھی تو میں تیرے باپ کو رو کے آرہا ہوں۔ اے میرے لال! تیری ماں کے لئے تیرے باپ کا صدمہ بہت کافی ہے۔ اب یہ نیا غم کیوں دینا چاہتا ہے؟ کہا مولا یہ کیا فرمارہے ہیں، مجھے سجایا کس نے ہے؟ مجھے میدان میں جانے کے لئے تیار کس نے کیا ہے؟ میری ماں نے مجھے سجا کے بھیجا ہے۔ حسینؑ روکنا چاہتے تھے کہ پس پردہ سے آواز آئی۔ مولاؑ!۔ اک بیوہ کا ہدیہ ہے، رد

نہ کیجیے گا۔ سنو سنو تاریخ کربلا۔ ایک واقعہ اِدھر مسلم کا لال اُدھر عمرو بن جنادہ۔ بیٹا میدان میں آیا، جہاد کرتا رہا۔ ماں درِ خیمہ پر کھڑی ہوئی آواز دے رہی ہے۔ شاباش میرے لال۔ شاباش میرے لال۔ مولاؑ پر قربان ہو جا بیٹا۔ تاکہ ماں منہ دکھانے کے لائق ہو جائے۔ بیٹا جنگ کر رہا تھا۔ اک مرتبہ ظالموں نے گھیرا۔ جب بچہ خاک پر گرا تو سر قلم کر کے ماں کی طرف پھینکا۔ ماں نے بڑھ کے بچے کا سر اٹھایا۔ خون کو صاف کیا اور مقتل کی طرف پھینک دیا۔ آواز دی ہم جو کچھ راہِ حق میں دیدیتے ہیں پھر واپس نہیں لیتے ہیں۔ شاباش میرے لال، تو نے بیدانیوں کے سامنے ماں کو سرخرو کر دیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

پانچویں مجلس

محبّت امام حسین علیہ السّلام

"حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اللہ اُسے دوست رکھے جو میرے حسینؑ سے محبت کرے۔"

سرکار دو عالمؐ کے اس ارشاد گرامی کی روشنی میں "عرفانِ حسینؑ" سے متعلق جو سلسلۂ کلام آپ کے سامنے پیش کیا جارہا تھا اس کے پانچویں مرحلہ پر کچھ باتیں محبتِ حسینؑ ابن علیؑ سے متعلق گذارش کرنا ہے۔ اس لفظ سے آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ اس موضوع کے دو رُخ ہیں۔

لفظ "محبت حسینؑ" کا ایک مفہوم یہ ہے کہ اگر حسینؑ سے محبت کی جائے تو محبت کا مرتبہ کیا ہے۔

اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اگر حسینؑ کسی سے محبت کریں تو اس محبت کا مرتبہ کیا ہوگا۔ اور اس انسان کی حیثیت اور شخصیت کیا ہوگی کہ جس سے فرزند رسول الثقلین امام حسینؑ محبت کریں۔

میں اس گفتگو میں یہ دونوں باتیں آپ کے سامنے گذارش کروں گا اور اس سلسلہ میں چند ضمنی مسائل پر بھی آپ توجہ دیں گے۔

ایک مسئلہ یہ ہے کہ محبت کے معنی کیا ہیں؟

اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ محبت کے اسباب کیا ہیں؟

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ محبت کا نتیجہ کیا ہے اور آخری مسئلہ یہ ہے کہ تمام محبتوں کے درمیان محبتِ حسینؑ کا مرتبہ کیا ہے؟

تمہیدی طور پر اس نکتہ کو آپ ذہن میں رکھیں کہ اس دنیا میں جتنے بھی اعمال انجام دیئے جاتے ہیں ان کی تین قسمیں ہوتی ہیں:

بعض اعمال وہ ہیں جو امتیوں کے شایانِ شان ہیں، پیغمبروں کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ اور بعض پیغمبروں کے شایانِ شان ہیں، مگر پروردگار کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

ہر ایک کا اپنا ایک مرتبہ ہے۔ ہر ایک کی اپنی ایک منزل ہے اور اس کا عمل اسی کی منزل اور اُسی کے مرتبہ کے مطابق ہوگا۔

مثال کے طور پر کائنات کو پیدا کرنا، کائنات کو زندہ رکھنا یا اُسے فنا کر دینا، بندوں کو روزی دینا، یہ سارے کام پروردگار کے ہیں۔ ان کا تعلق بندوں سے نہیں ہے۔ سجدے کرنا، نمازیں پڑھنا، روزے رکھنا، بندگی کرنا، عبادت کرنا، یہ کام بندوں کے ہیں۔ ان سے پروردگار کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی لئے آپ کو یاد ہوگا کہ جب فرزندِ رسول امام علیؑ ابن موسیٰ الرضاؑ اور عیسائی عالم سے گفتگو ہو رہی تھی اور اس نے مسلمانوں کو دعوت اتحاد دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ہمارے پیغمبر کو ہم بھی پیغمبر مانتے ہیں اور مسلمان بھی پیغمبر مانتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے پیغمبر کو مسلمان مانتے ہیں اور ہم عیسائی نہیں مانتے ہیں۔ لہٰذا اتحاد اور مصالحت کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ جس پیغمبر پر دونوں متفق ہیں اُسے مان لیا جائے اور جس پیغمبر کی رسالت میں اختلاف ہے اُسے چھوڑ دیا جائے۔

تو امامؑ نے فرمایا کہ ہم مسلمان جس عیسیٰ پر ایمان رکھتے ہیں وہ آخری پیغمبر نہیں تھے بلکہ آخری پیغمبر کی بشارت دینے والے تھے لہٰذا کسی ایک عیسیٰ پر دونوں کا اتفاق نہیں ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اگر انصاف کرو تو جناب عیسیٰ کو بھی ہم ہی مسلمان مانتے ہیں، تم عیسائی تو انھیں مانتے بھی نہیں ہو۔ ظاہر ہے کہ جذباتی طور پر اسے غصہ آنا چاہئے۔ اس نے

کہا اتنا بڑا الزام، اتنا بڑا اتہام۔ ہم عیسائی کہے جاتے ہیں اور آپ ہم سے کہتے ہیں کہ ہم عیسیٰ کو نہیں مانتے ہیں۔ آپ مسلمان کہے جاتے ہیں اور آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ آپ جناب عیسیٰ کو مانتے ہیں، یہ کیسی بات آپ فرما رہے ہیں؟

فرمایا یہ بھی کوئی ماننا ہے کہ عیسیٰ کو تارک الصلوٰۃ کہا جائے، بے نمازی کہا جائے، روزہ خور کہا جائے، بے عمل کہا جائے۔ کسی نبیؑ خدا کو ماننے کا یہی طریقہ ہوتا ہے؟

اس نے کہا یہ آپ مسلمانوں کا الزام ہے ہم پر۔ ہم عیسیٰ کو ایسا نہیں مانتے ہیں۔ ہم عبادت گذار مانتے ہیں۔ سجدہ گذار مانتے ہیں۔ نمازی مانتے ہیں۔ روزہ دار مانتے ہیں۔ فرمایا اور یہ سب کچھ مان کے پروردگار مانتے ہیں۔ صلوات

اگر کوئی بندگی کرنے والا ہے، عبادت کرنے والا ہے، سجدہ گذار ہے، تو وہ بندہ ہوگا، پروردگار کیسے ہو جائے گا؟ اس کا نام بندۂ خدا ہوگا فرزند خدا نہیں ہوگا۔

تو میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ کچھ کام بندوں کے ہیں جو خدا نہیں کرتا ہے اور کچھ کام خدا کے ہیں جو بندہ انجام نہیں دیتا ہے۔ اور یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں صرف ربطِ کلام کے لئے اشارۃً ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں، جن کے ذہن میں بات ہے وہ خود محسوس کر لیں گے۔ بندوں کے کام الگ ہیں، خدا کے کام الگ ہیں۔ بندوں کی شان الگ ہے، خدا کی شان الگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کو لوگ بندۂ خدا ماننے کے لئے تیار نہیں تھے پروردگار نے اس کے وجود میں بندگی کا انتظام کیا۔ اور جس کو لوگ خدا ماننے والے تھے اللہ نے اس کے سلسلہ میں وہ انتظام کیا کہ کوئی خدا نہ ماننے پائے۔ واقعات آپ کے سامنے ہیں۔ مادر جناب عیسیٰ خانۂ خدا میں تھیں۔ یہ خانۂ کعبہ نہیں تھا لیکن بہر حال بیت المقدس بھی اللہ ہی کا گھر ہے۔ مگر جب عیسیٰ کی ولادت کا وقت آیا تو حکم ہوا پروردگار کا۔ مریمؑ باہر جاؤ، یہ خانۂ عبادت ہے، یہ خانۂ ولادت نہیں ہے۔ لیکن دوسرا منظر یہ ہے کہ کنیز خدا گھر سے باہر ہے اور دیوار میں در بنا کر بلایا جائے بنت اسد اندر آجاؤ۔ خدایا کیا اب یہ گھر خانۂ عبادت نہیں ہے۔ کیا یہ کوئی زچہ خانہ ہو گیا ہے۔

مالک نے کہا مجھے نہ سمجھاؤ۔ میں دونوں کی مصلحتوں کو جانتا ہوں۔ عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہا جانے والا تھا۔ ان کے معاملہ میں بہکنے والے انھیں بیٹا کہنے والے تھے۔ لہٰذا میں نے کہا مریمؑ تم باہر چلی جاؤ تاکہ یہ نالائق یہ نہ کہنے پائیں کہ جس کا بیٹا تھا اس کے گھر میں پیدا ہوا ہے۔ علیؑ کو کوئی بیٹا کہنے والا نہیں تھا۔ علیؑ کو بہکا ہوا نصیری خدا کہنے والا تھا۔ لہٰذا ہم نے کہا کہ بنت اسد اندر آجاؤ تاکہ نصیری کی آنکھ کھل جائے کہ جو پیدا ہوتا ہے وہ بندہ ہوتا ہے خدا نہیں ہوتا ہے۔ صلوات

تو میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ کچھ کام بندے انجام دیتے ہیں، ان کا خدا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور کچھ کام خدا کرتا ہے اس کا بندوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

پھر بندوں میں بھی کاموں کی تقسیم ہے۔ کچھ کام ایسے ہیں جو امتیوں کے شایانِ شان ہیں، پیغمبروں کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ اور کچھ کام ایسے ہیں جو پیغمبروں کے شایانِ شان ہیں، اُمتی وہاں تک پہونچ بھی نہیں سکتے ہیں۔

گویا کام دنیا میں تین طرح کے ہیں:

۱۔ عام انسانوں کے کام الگ ہیں۔

۲۔ پیغمبر کے کام الگ ہیں۔

۳۔ خدا کا کام الگ ہے۔

جب ہم نے یہ اندازہ کر لیا کہ کام بٹے ہوئے ہیں۔ جو کام خدا کے کرنے کا ہے وہ نبی نہیں کرتا ہے۔ جو کام نبی کے کرنے کا ہے وہ کام امتی نہیں کرتا ہے، اور جو کام پیغمبروں کا ہے وہ امتی نہیں کرتا ہے۔ تو اس کے بعد ہم نے محبت حسینؑ کو دیکھا۔ تو ہمیں ایک ایسا کام مل گیا جو سب کے شایانِ شان ہے۔ درمیان میں حسینؑ ابن علیؑ ہیں۔ خدا بھی ان سے محبت کرتا ہے۔ نبیؐ بھی ان سے محبت کرتا ہے اور اُمتی بھی ان سے محبت کرتے ہیں۔

محبتِ حسینؑ اس بلند مرتبہ عمل کا نام ہے، جو بندوں کے بھی کام آتا ہے، خدا بھی وہی کام انجام دیتا ہے اور نبیؐ بھی وہی کام کر رہا ہے۔ دائرہ بہت وسیع ہے اور مرکز ہے ذاتِ حسینؑ ابن علیؑ۔ صلوات

اور اگر میری بات کا اندازہ میرے بعض بچوں کو نہیں ہو سکا ہے، تو میں ذرا اور وضاحت سے گذارش کروں کہ مسئلہ محبت حسینؑ ابن علیؑ کا اتنا عظیم ہے ورنہ ہر محبت ایسی نہیں ہے۔ کتنے افراد ایسے ہیں جن سے عام لوگ محبت کرتے ہیں۔ مگر سرکار دو عالمؐ محبت نہیں کرتے ہیں اور کتنے افراد ایسے ہیں جن سے سرکار محبت کرتے تھے مگر لوگ محبت نہیں کرتے تھے۔ حسابات سب بٹے ہوئے ہیں۔ ان کے محبوب الگ ہیں دنیا والوں کے محبوب الگ ہیں۔ کتنے ایسے انسان ہیں کہ جن سے خدا ہمیشہ محبت کرتا رہا مگر بندگان خدا محبت نہیں کرتے۔ اور کتنے ایسے افراد ہیں جو بندوں کی نظر میں انتہائی محبوب ہیں، مگر خدا کی نگاہ میں دیکھنے کے بھی لائق نہیں ہیں۔ تو جب محبتوں کی یہ تقسیم دیکھ لی اور اس کے بعد حسینؑ ابن علیؑ کو دیکھا تو محبت کرنے والا پیغمبرؐ یہ اعلان کر رہا تھا "جو حسینؑ سے محبت کرے خدا اُس سے محبت کرے گا" یعنی حسینؑ تنہا میرا محبوب نہیں ہے۔ بلکہ یہ محبوب کردگار بھی ہے۔ اور دیکھو تنہا یہ حسینؑ محبوب نہیں ہے بلکہ اگر تم اس سے محبت کر لو گے تو تم بھی محبوب کردگار بن جاؤ گے۔ صلوات

ذکر آگیا ہے تو بات کو مکمل کرنے کے لئے دو لفظیں اور گذارش کر دوں۔ یہ تنہا ایک محبت حسینؑ ہی کی بات نہیں ہے بلکہ اگر آپ غور کریں گے اور قرآن مجید کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ بہت سے کام ایسے ہیں جن کو پروردگار عالم نے اپنے اور بندوں کے درمیان مشترک رکھا ہے اور انھیں کاموں کے ذریعہ شخصیتوں کو پہچنوایا ہے۔

یہ تو میں نے محبت کی ایک مثال دی ہے ورنہ دوسری مثال صلوات کی بھی ہے کہ پروردگار نے فرمایا ذرا میرے حبیب کو پہچانو! اس کا مرتبہ یہ ہے کہ:

"اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ"

اس صلوات میں خدا بھی شریک ہے، ملائکہ بھی شریک ہیں۔ اور اے ایمان والو! اگر شریک عمل خدا بننا چاہتے ہو تو تم بھی پیغمبرؐ پر صلوات بھیجو۔

یہ پیغمبرؐ کی عظمت کی علامت ہے کہ خدا بھی نبیؐ کے لئے صلوات پڑھے، ملائکہ بھی پڑھیں اور اُمتیوں کو بھی حکم دیا جائے۔

یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔ اس کے بعد جب دشمنوں کی باری آئی تو وہاں بھی کوئی الگ نہیں رہا۔ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ایسے لوگ بھی ہیں جن پر خدا بھی لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔

صلوات

میں چاہتا ہوں اس لفظ پر آپ توجہ دیں کہ دشمنانِ خدا سے بیزاری، اور دشمنانِ خدا اور رسولؐ پر لعنت کرنا یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے، بہت بڑا کام ہے۔ یہ کام اللہ انجام دیتا ہے اور آپ صاحبانِ ایمان ہیں شائد اس بات کو بہت جلدی محسوس کر لیں گے۔ نماز سے بڑا اسلام میں کوئی عمل نہیں ہے۔ فروعِ دین میں اوّل نماز کا ذکر آتا ہے۔ لیکن اتنا عظیم عمل جن پر بنیاد دین قائم ہے۔ یہ تحفظِ دین ہے۔ یہ عمادِ دین ہے۔ رکن مذہب ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ کام ہے جسے بندے کرتے ہیں خدا نہیں کرتا ہے۔ اتنا مقدس اور پاکیزہ عمل مگر بندے پڑھتے ہیں خدا نہیں پڑھتا ہے۔ اور لعنت کا عمل اس قدر پاکیزہ ہے کہ اس میں بندوں کے ساتھ خدا بھی شریک ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کیسے کہا جائے کہ یہ کوئی ذلیل عمل ہے۔ ذلیل عمل بندے کر سکتے ہیں خدا نہیں کر سکتا ہے۔ صلوات

دشمنانِ خدا سے بیزاری، دشمنانِ خدا پر لعنت، یہ نہ کوئی خبیث عمل ہے اور نہ کوئی کثیف عمل ہے۔ اتنا طیب و طاہر، اتنا پاکیزہ عمل ہے کہ جس کو پروردگار انجام دیتا ہے، جس کو مالک کائنات انجام دیتا ہے۔ اور اس سے زیادہ سمجھنا چاہتے ہیں تو یوں پہچان لیجئے کہ جس کام میں ذرا کمزوری کا شبہ ہوتا ہے وہ کام ڈھکے چھپے انجام دیا جاتا ہے، سر میدان نہیں ہوتا ہے۔ مگر لعنت ایسا مقدس کام ہے کہ جس کے لئے پیغمبرؐ گھر والوں کو میدان میں لے کر آگئے تھے۔ صلوات

کون سا مشکل کام تھا جہاں عیسائیوں سے مسجد میں بحث ہو رہی تھی، وہیں حضور فرما دیتے کہ مانتے ہو تو مانو ورنہ تم پر خدا کی لعنت۔ قصّہ ختم ہو جاتا۔ مگر نہیں جب تک بحث تھی علمی باتیں ہو رہی تھیں۔ آیات پڑھی جا رہی تھیں تب تک بند مسجد کے اندر باتیں ہو رہی تھیں اور جب فیصلہ لعنت کے ہاتھوں میں آیا تو بند کمرہ کی بات نہیں رہی، مسجد کے اندر کا مسئلہ نہیں رہا۔ اب میدان میں آجاؤ کہ یہ کام اتنا عظیم ہے جو نہ صرف بچوں کے کرنے کا ہے اور نہ صرف بوڑھوں کے کرنے کا ہے، نہ صرف مردوں کا ہے اور نہ صرف عورتوں کا ہے۔ سب کے کام بٹے ہوئے ہیں مگر یہ کام اتنا مشترک ہے کہ جو بزرگ ترین ہے وہ بھی شامل ہے، جو جوان ہے وہ بھی شامل ہے، جو بچے ہیں وہ بھی شامل ہیں اور جو خاتون ہے وہ بھی شامل ہے۔ صلوات

بلکہ مباہلے کی آیت آپ کے سامنے ہے۔ پیغمبرؐ نے اسے بھی اللہ ہی کا کام قرار دیا ہے فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ۔

یعنی اصل کام تو خدا ہی کا کام ہے۔ اب جو خدا کے راستے پر چلنا چاہتا ہے وہ اسے اختیار کرلے، ورنہ اصل کام یہ پروردگار کے انجام دینے کا ہے۔ تو میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ محبّت حسینؑ ابن علیؑ ایک اتنا عظیم عمل ہے کہ حسینؑ سے خدا بھی محبّت کرتا ہے، رسولِ خدا بھی محبّت کرتا ہے اور صاحبانِ ایمان بھی محبّت کرتے ہیں۔ آسمان کے فرشتے بھی محبّت کرتے ہیں اور زمین کے بندگانِ خدا بھی محبّت کرتے ہیں۔

اسلام کو ایک ایسا محبوب مل گیا ہے جو سب کا محبوب ہے اور کتنا بڑا بدقسمت وہ مسلمان ہے کہ جس کے حصّے میں حسینؑ نہ آئے اور کتنی خوش قسمت وہ قوم ہے کہ جس کے حصّہ میں حسینؑ آگئے۔ جسے درمیان میں رکھ دیا جائے تو سب چاہنے والے ہوں گے اور سب کا محبوب ایک ہی ہوگا۔ صلوات

بس عزیزانِ محترم! محبّت حسینؑ ابن علیؑ ایک انتہائی عظیم شے ہے۔ جس کی قدر و قیمت انسان کو پہچاننا چاہیئے کہ اللہ اور رسولؐ سب حسینؑ سے محبّت کرتے ہیں۔

اب اس کے بعد دوسرا مرحلہ آتا ہے کہ محبّت کے دو طریقے ہوتے ہیں اور اس کے

دو طرح کے آثار ہوتے ہیں۔ محبّت اپنے چھوٹے سے بھی کی جاتی ہے اور اپنے سے بڑے سے بھی کی جاتی ہے۔ ماں باپ کو اولاد سے محبّت ہوتی ہے اور اولاد کو ماں باپ سے محبّت ہوتی ہے۔ لیکن دونوں کی محبتوں کے آثار میں ذرا فرق ہوتا ہے۔ اور دونوں کے اثرات کے نام الگ الگ ہیں۔ آپ کو اپنی اولاد سے محبّت ہے اور بیٹا کہتا ہے کہ ہمیں چاکلیٹ چاہئے۔ آپ گئے بازار سے لے آئے۔ بچّے کی بات بڑے نے مان لی۔ آپ کا چھوٹا بھائی ہے اس نے آپ سے مطالبہ کیا کہ آپ امارات میں رہتے ہیں، وہاں چیزیں بہت اچھی اچھی ملتی ہیں کچھ ہمارے واسطے بھیج دیجئے۔ آپ نے کہا چھوٹا بھائی ہے ہم اس سے محبّت کرتے ہیں اس نے تقاضا کیا ہے لہٰذا بھیج دیا۔

اس کے برخلاف کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے بزرگ سے محبّت ہے۔ اپنے استاد سے محبّت ہے۔ اپنے شہر کے حاکم سے محبّت ہے۔ اپنے شہر کے عالم سے محبّت ہے۔ اپنے خاندان کے بزرگ سے محبّت ہے تو جو انھوں نے فرمایا وہ بھی کر دیا مگر دونوں کے نام الگ الگ ہیں۔

جب بڑے سے محبّت کر کے اس کی بات پر عمل کیا تو اس کا نام رکھا گیا اطاعت اور جب چھوٹے سے محبّت کر کے اس کی بات مان لی تو اس کا نام رکھا گیا ناز برداری۔ اسے اطاعت نہیں کہا جاتا ہے مگر کام ایک ہی ہوتا ہے۔

یہ میں اس لئے گزارش کر رہا ہوں کہ عام طور سے لوگ جوش میں آ کے کہہ دیتے ہیں کہ محبّت کا ایک ہی اثر ہوتا ہے اطاعت۔ اور اس کے بعد پھر یہ شبہ پیدا کرایا جاتا ہے کہ اگر محبّت کا اثر اطاعت ہے تو جب پیغمبر حسینؑ سے محبّت کریں گے تو کیا پیغمبر حسینؑ کی اطاعت کریں گے؟ اگر خدا حسینؑ سے محبّت کرے گا تو کیا خدا حسینؑ کی اطاعت کریگا؟ نہیں عزیز و محبّت کا ایک ہی اثر ہوتا ہے اور وہ ہے بات کا مان لینا۔ لیکن بات مان لینے کی دو قسمیں ہیں۔ چھوٹے کی بات مانی جاتی ہے تو اُسے ناز برداری کہا جاتا ہے، اور بڑے کی بات مانی جاتی ہے تو اُسے 'اطاعت' کہا جاتا ہے۔

حسینؑ کو خدا سے محبت ہے۔ خدا کو حسینؑ سے محبت ہے۔ یہ محبت طرفینی ہے۔ تو اب دونوں کے اثرات کیا ہیں؟

حسینؑ کو خدا سے محبت ہے تو پوری زندگی میں ایک حکم خدا ڈھونڈھ نکالو جسے حسینؑ نے نہ مانا ہو۔ حسینؑ ابن علیؑ نے جب سے دنیا میں قدم رکھا ہے اور عصر عاشور تک ایک موقع تلاش کرو جہاں خدا نے حسینؑ سے کچھ کہا ہو اور حسینؑ نے نہ مانا ہو۔ تو اب میں گذارش کروں گا کہ خدایا! جب بندہ نے تجھ سے محبت کی تو وہ تو اطاعت میں اتنا کامل ثابت ہوا کہ تیری کوئی ایک بات نہ ٹال سکا۔ تو جب تو بندہ سے محبت کرے گا تو تیری شانِ محبت کیا ہوگی؟۔ کہا اچھا اب ڈھونڈھ کے کوئی ایسی جگہ بتاؤ جہاں حسینؑ نے مجھ سے کچھ کہا ہو اور میں نے نہ مانا ہو۔ صلوات

اگر حسینؑ کے کردار میں کوئی ایسا موقع نہیں آیا جہاں حسینؑ نے میری بات کو نہ مانا ہو تو مجھے بھی دیکھو کہ میری سنت و سیرت میں بھی کوئی ایک موقع ایسا نہ ملے گا جہاں میرے حسینؑ نے مجھ سے کوئی بات کہی ہو اور میں نے اس کی بات کو ٹال دیا ہو۔ اگر وہ اطاعت میں کامل ہے تو میں ناز اٹھانے میں کسی سے کم نہیں ہوں۔ وہ بندہ ہے، اس کا کام اطاعت کرنا ہے۔ میں پروردگار ہوں میرا کام اپنے بندہ کا دل رکھنا ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ سارے انسان جب دعا کرتے ہیں تو کوئی دعا قبول ہوتی ہے اور کوئی رد ہو جاتی ہے لیکن جو خدا کے معصوم بندے ہیں ان کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی ہے۔ تو کیا ان کی خدا سے کوئی رشتہ داری ہے؟۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ مستجاب الدعوات ہیں تو صرف اس لئے ہیں کہ یہ جو برتاؤ خدا کے ساتھ کرتے ہیں وہ کوئی دوسرا نہیں کرتا ہے۔ اور تمہارا کمال کردار صرف یہ ہے کہ تم نے میری بات کو جان بوجھ کے نہیں ٹھکرایا، مگر کبھی بھولے سے ٹھکرا دیا، کبھی سہو میں ٹھکرا دیا، کبھی نسیان کی نذر کر دیا، کبھی سونے میں بھول گئے۔ کتنے مواقع ایسے آئے جہاں تم ہم سے الگ ہو گئے! مگر یہ میرے بندے وہ ہیں کہ جن کی زندگی میں نہ سہو ہے نہ نسیان۔ نہ خطا ہے نہ غلطی ہے۔ حد یہ ہے کہ یہ اگر سو بھی جائیں تو میری مرضی ہی کا سودا کرتے ہیں۔ صلوات

تو عزادارانِ محترم! سرکارِ دو عالمؐ اگر مستجاب الدعوات ہیں۔ آلِ رسولؐ اگر مستجاب الدعوات

ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان سے پروردگار کی کوئی رشتہ داری ہے۔ انھوں نے مالک سے رشتۂ عبودیت قائم کیا ہے۔ انھوں نے بندگی کے رشتہ کو مستحکم اور مضبوط بنایا ہے۔ خدا کی کسی بات کو ٹالا نہیں ہے لہٰذا پروردگار نے بھی ان کی کسی خواہش کو ٹھکرایا نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ اگر ان کے زیر قبہ دعا کر دی جائے تو پروردگار اسے بھی رد نہیں کرنا چاہتا ہے۔ یاد رکھئے کہ شریعت میں اچھے کام کچھ وہ ہیں جن کو واجب کہا جاتا ہے۔ اور کچھ وہ ہیں جن کو سُنّت یا مستحب کہا جاتا ہے۔ واجبات کا مفہوم یہ ہے کہ ان کا ہونا ضروری ہے کہ انسان نہ کرے گا تو مستحق سزا ہو جائے گا۔ مگر مستحبات کی شان ہی یہ ہے کہ کرو گے تو ثواب مل جائے گا، نہ کرو گے تو عذاب بھی ہونے والا نہیں ہے۔ یعنی ہم کو ایک جگہ پابند بنایا گیا ہے تو ایک جگہ آزاد بھی رکھا گیا ہے۔ شلارات کے آنے کے بعد مغرب وعشاء کی نماز واجبات میں ہے کہ جو نہ پڑھے گا مستحق عذاب ہو جائے گا۔ لیکن نماز شب واجبات میں نہیں ہے، مستحبات میں ہے کہ پڑھ لوگے تو ثواب مل جائے گا ورنہ عذاب بھی نہ ہوگا۔

یہ اور بات ہے کہ یہ بہترین موقع ہوتا ہے، بہترین لمحات ہوتے ہیں جہاں بندہ مالک سے مناجات کرتا ہے لیکن پھر بھی پروردگار کہتا ہے اگر تم مناجات نہ کرو گے، اگر نصف شب کے بعد ہماری بارگاہ میں نہ آؤ گے تو میں نہ عذاب کروں گا اور نہ سزا دوں گا۔ میں نے مغرب وعشاء میں پابند بنایا ہے اور نماز شب میں آزاد چھوڑ دیا ہے۔ مگر مستجاب الدعوات کسے بنایا ہے؟ اُس پیغمبر کو بنایا ہے کہ جس کے لئے جیسے مغرب وعشاء کو لازم قرار دیا ہے ویسے ہی نماز شب کو لازم قرار دیا ہے۔

ہمارے یہاں ایک زوجہ گھر میں آجائے تو نماز شب کیا، نماز صبح بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اور وہاں نو ازواج گھر کے اندر ہیں مگر سرکار دو عالم کی نماز شب قضا نہیں ہوتی ہے۔ جب بندہ ایسی بندگی کرتا ہے تو مالک کہتا ہے، اے میرے بندے جب تو نے میری ہر بات کو مان لیا ہے تو تیری کسی بات کو میں ٹھکرانا نہیں چاہتا اور بات اس کی ٹھکرائی جاتی ہے جو مرضی سے ہٹ کے مانگتا ہے۔ جن کو مالک

نے اپنی مرضی کا محل و مرکز بنا دیا ہے۔ وہ نہ مرضیٔ خدا سے ہٹ کے بولنا جانتے ہیں اور نہ ان کی بات کے ٹھکرانے کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے۔ صلوات

عزیزانِ محترم! یہ گفتگو کا دوسرا مرحلہ تھا جس کو مختصراً گذارش کر دیا۔ اب تیسرا مرحلہ ہے لہٰذا آیئے محبت کی بنیادوں کو پہچانیں۔

مذہب کی سب سے پہلی محبت ہے محبتِ پروردگار۔ یہ سارا مذہب محبتوں کا مذہب ہے اگر کوئی محبت کے معنی جانتا ہو۔ لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم محبت کے معنی جانتے ہی نہیں ہیں۔ یہ لفظ بھی اسقدر بدنام ہو گیا ہے کہ ہر مہینے دو مہینے کے بعد مومنین کرام یا مسلمین کرام یہ سوال ضرور کرتے ہیں کہ کیا اسلام میں محبت حرام ہے؟ ہم کیا جواب دیتے ہیں یہ الگ مسئلہ ہے۔ آپ سوال کا مزاج پہچانیے کہ مسلمان نے یہ سوچا کیسے کہ محبت حرام ہے جب کہ قرآن مجید بار بار دُہرا رہا ہے یُحِبُّکُمُ اللّٰہُ۔ یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ۔

خدا ایسی قوم کو لے آئے گا کہ وہ خدا سے محبت کرنے والے ہوں گے اور خدا ان سے محبت کرنے والا ہو گا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔ سارا قرآن ذکرِ محبت سے بھرا ہوا ہے اور مسلمان مسئلہ پوچھتا ہے کہ کیا اسلام میں محبت حرام ہے۔ یعنی مسلمان ذہن ذلّت کی اس منزل پر آ گیا ہے جہاں محبت کے معنی سوائے ناجائز تعلقات کے اور کچھ نہیں ہیں۔

الحمدللہ کہ معاشرے میں سب ایک جیسے نہیں ہیں۔ لیکن اگر ایک بھی کہیں پیدا ہو گیا تو معاشرے کے لئے انتہائی شرمناک بات ہے کہ جہاں محبت کا لفظ اتنا پاکیزہ لفظ تھا کہ جس کو پروردگار اپنے واسطے استعمال کرتا تھا کہ "میں محبت کرتا ہوں" وہاں اُس لفظ کو اتنا ذلیل بنا دیا گیا کہ مسلمان اس کے بارے میں یہ نہ پوچھے کہ کیا محبت واجب ہے بلکہ یہ پوچھے کہ کیا محبت حرام ہے۔ یہ سب نتائج اس بات کے ہیں کہ دنیا داری میں مزاجِ انسانی اتنا ڈوب گیا ہے کہ مذہب کے تقدس سے یکسر غافل ہو گیا اور انھیں غفلتوں کا نتیجہ ہے کہ محبت کی قدر و قیمت سے بھی غافل ہو گیا ہے۔ مذہب

میں بنیادی طور پر سب سے پہلی محبت ہے پروردگار کی محبت۔ اس کے بعد پیغمبرِ خدا سے محبت۔ اس کے بعد اولیاء اللہ سے محبت۔ سب سے پہلا فرض مسلمان کا یہ ہے کہ خدا سے محبت کرے۔ اس کے بعد نبی خدا سے محبت کرے اور اس کے بعد ان سے محبت کرے کہ جن کی محبت کو رسولِ خدا نے رسالت کا اجر قرار دیا ہے۔ اس کے بعد ساری محبتیں آپس میں تقسیم ہو کے رہ جاتی ہیں۔

اگر اتنی باتیں آپ کے ذہن عالی میں محفوظ ہو گئی ہیں تو میں ایک سوال کرتا ہوں۔ یہیں سے سارے حقائق آپ پر واضح ہو جائیں گے۔

ہم آپ سب مسلمان ہونے کے رشتے سے خدا سے محبت کرتے ہیں یا نہیں؟ ہے کوئی انسان جو کہے ہم انسان ہیں اور خدا سے محبت نہیں کرتے ہیں۔ اگر کوئی بدنصیب یہ کہہ دے تو خدا تو کسی کا محتاج نہیں ہے۔ وہ کہے گا ٹھیک ہے اگر تم کو ہم سے محبت نہیں ہے تو ہم کو ہی کیا غرض ہے کہ تم جیسے نالائقوں سے محبت کریں۔ لہٰذا ہر مسلمان، ہر مومن، مسلمان، مومن ہونے کے اعتبار سے پروردگار سے محبت کرتا ہے۔ اب آپ اس سے پوچھئے کہ خدا کی کون سی ادا پسند آگئی ہے جو خدا سے محبت ہو گئی ہے، خدا کا چہرہ پسند آگیا ہے، جو دیکھا ہی نہیں۔ خدا کی آنکھیں پسند آگئی ہیں، جو دیکھی نہیں۔ خدا کی زلفیں پسند آگئی ہیں، جو کسی کے خیال میں بھی نہیں ہیں۔ تو خدا سے محبت کیسے ہو گئی؟ کیا مسلمان دیوانہ ہے کہ بغیر کسی بنیاد کے محبت کر رہا ہے یا جھوٹ بولتا ہے۔ محبت ہے ہی نہیں۔ یہیں ٹھہر کے فیصلہ کر لیجئے، تاکہ آگے سوچنے میں کوئی زحمت نہ ہو۔

ہر مسلمان کے پاس ایک ہی جواب ہے۔ خدا کے چہرے سے محبت نہیں ہے، آنکھوں سے نہیں ہے، حسن سے نہیں ہے، جمال سے نہیں ہے۔

پھر محبت کیوں ہے؟

محبت خدا کے کمال سے ہے۔ وہ عالم ہے اس لئے محبت ہے۔ وہ قادر ہے اس لئے محبت ہے۔ وہ حیّ ہے اس لئے محبت ہے۔ وہ صادق ہے اس لئے محبت ہے۔ وہ اتنے کمالات کا مالک ہے اس لئے محبت ہے۔

اب تو اندازہ ہو گیا کہ مذہب میں نہ جمال کی محبت ہے، نہ مال کی محبت ہے۔ مذہب میں تنہا کمال کی محبت ہے۔

اے پروردگار، جب تیرے دین میں سوائے کمال کے اور کوئی محبت نہیں ہے، تو تو نے کسی بندے سے محبت کرنے کا حکم کیوں دے دیا؟

خدا نے کہا۔ اگر بے کمال ہوتا تو کبھی حکم محبت نہ دیتا۔ جب میں سب پر کسی کی محبت کو واجب کر دوں تو سمجھ لو کہ اس میں اتنا کمال ہے کہ سب کے لئے محبوب بننے کے قابل ہے۔ صلوات

اور جب محبت پروردگار کی بنیاد ہے کمال، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ محبت کی دو قسمیں ہو گئیں۔ ایک جذباتی محبت اور ایک مذہبی محبت۔

جذباتی محبت جمال کو دیکھ کے پیدا ہوتی ہے، مال کو دیکھ کے پیدا ہوتی ہے، چہرے کو دیکھ کے پیدا ہو جاتی ہے۔ ظاہری شخصیت کو دیکھ کے پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر مذہبی محبت وہ نہ کسی کے جمال سے مرعوب ہوتی ہے اور نہ کسی کے مال سے مرعوب ہوتی ہے۔ مذہبی محبت کمال چاہتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو مادیت والے ہیں وہ حسن و جمال سے محبت کرتے ہیں اور جو مذہب والے ہیں وہ کمال سے محبت کرتے ہیں۔ وہ چاہے حبش والا ہو مگر محبوب ہے۔ چاہے عرب والا ہو مگر محبوب نہیں ہے۔ مذہبی محبت کا معیار جمال نہیں ہے بلکہ کمال ہے۔

دلیل سنیں گے آپ۔ جتنے جمال والے تھے، جتنے حسن والے تھے، جتنے حسین چہرے والے تھے کوئی اس قابل نہ ہوا کہ سرکار اُسے موذن بنا دیتے بلکہ کسی کی شان میں تَبَّتْ یَدَا کسی کی شان میں قُوْمُوْا عَنِّیْ۔ مگر ایک تھا جو ایسا بندہ تھا کہ نبی اُس سے محبت کرتے تھے تاکہ آج ہی سے پہچان لو کہ میری محبت کا تعلق جمال سے نہیں ہے کمال سے ہے۔ تو جو ایک بندہ موذن سے محبت کرنے میں اس کے کمال کو دیکھتا ہے تو جس سے اوّل سے لے کر آخر تک ساری زندگی محبت کرے سوچو وہ کتنا با کمال ہوگا اور جس کے حق میں دعا کرے خدا اس سے محبت کرے جو اس سے محبت کرے،

وہ کیسا صاحب کمال اور کیسا صاحب کردار ہوگا۔

یاد رکھیے گا مذہبی محبّت اطاعت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور کمال سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی بنیاد ہے محبّت کے لئے کمال اور اثر ہے اس کا اطاعت۔ مادّی محبّت کرنے والے اپنے محبوب کی راہ میں بہک جاتے ہیں، بھٹک جاتے ہیں، عزت بیچ ڈالتے ہیں، مال فنا کر دیتے ہیں، تباہ و برباد ہو جاتے ہیں، منھ دکھانے کے لائق نہیں رہ جاتے ہیں۔ مگر جو مذہبی محبّت کرنے والے ہیں، وہ نہ بہکنے والے ہیں، نہ بھٹکنے والے ہیں، نہ گمراہ ہونے والے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مادی محبّت والوں نے پیغمبرؐ کو محبّت کرتے دیکھا، سمجھے کہ شائد یہ بھی بہک گئے ہیں اس لئے کہ ان کے ذہن میں صرف بہکی ہوئی محبّت ہے۔ وہ کمال کی محبّت سے آشنا ہی نہیں ہیں، وہ تو رسولؐ کی محبّت میں بھی زلف و رخسار کو شامل کر لیتے ہیں، غیروں کا کیا ذکر ہے۔

تاریخ قرآن میں اس کی مثال موجود ہے کہ بے معرفت برادران یوسفؑ نے جب باپ کو یوسفؑ سے محبّت کرتے دیکھا تو فوراً کہہ دیا کہ یہ بہک گئے ہیں یعنی جناب یعقوبؑ اللہ کے ایک بندہ سے محبّت فرما رہے ہیں اور برادران یوسفؑ کہہ رہے ہیں کہ یہ بہک گئے ہیں۔ کیوں اس لئے کہ ان کی نگاہ میں سوائے بہکی محبّت کے اور کوئی محبّت تھی ہی نہیں۔ اگر برادران یوسفؑ نے کبھی کمال کی محبّت دیکھی ہوتی یا کمال کی محبّت کی ہوتی تو انھیں اندازہ ہوتا کہ جناب یعقوبؑ کی محبّت جناب یوسفؑ سے بربنائے کمال ہے اور کبھی یہ نہ کہتے کہ باپ بہک گئے ہیں لیکن پہلے مرحلے پر جب باپ کو بیٹے سے محبّت کرتے دیکھا تو کہا کہ بہک گئے ہیں اور آخر میں جب یعقوبؑ کو فراق یوسفؑ میں روتے دیکھا تو کہا "ابھی اسی پرانی گمراہی پر چل رہے ہیں"۔ اب یہ اندازہ ہوا جو مذہب کی حقیقت کو نہیں پہچانتے ہیں وہ اللہ والوں سے محبّت کو بھی گمراہی کہتے ہیں اور اللہ والوں کے غم میں رونے کو بھی گمراہی کہتے ہیں۔ صلوات

لیکن جو معنویت کو پہچانتے ہیں وہ محبت کی واقعی قدر و قیمت کو جانتے ہیں اور انھیں معلوم ہے کہ ہم نے سرکار دو عالمؐ سے محبت کی ہے تو حضور کے کمال کی بنا پر۔ ہم نے آلِ محمدؐ سے محبت کی ہے تو آلِ محمدؐ کے کمال کی بنا پر۔ ہم نے جن صحابۂ کرام سے محبت کی ہے وہ بھی ان کے کمال ہی کی بنا پر ہے۔ اور ہم نے دنیا میں اگر کسی سے محبت نہیں کی ہے تو پہچانو کہ وہ بے کمال ہے۔ اس لئے کہ ہم نے ہمیشہ کمال کو بنیاد بنایا ہے۔ لیکن عزیزو ہماری محبت سے واقعاً خدا کا کمال نہیں پہچانا جائے گا۔ ہماری محبت سے واقعاً سرکار کا کمال نہیں پہچانا جائے گا۔ ہماری محبت سے واقعاً آلِ محمدؐ کا کمال نہیں پہچانا جائے گا۔ البتہ اگر آلِ محمدؐ ہم سے محبت کر لیں تو ہمارا کمال پہچان لیا جائے گا۔ ان کی ذرہ نوازی سے، ان کی عزت افزائی سے ہمارے بارے میں یہ فیصلہ ہوگا کہ یقیناً یہ بندہ کچھ تو صاحب کمال ہے۔ جو اللہ کے نیک بندے اس سے محبت کرتے ہیں اور اسی بنیاد پر ہم نے پہچانا کہ وہ کتنا بڑا صاحب کمال ہوگا جس کو حسینؑ اپنا حبیب بنالیں۔ جس کو حسینؑ اپنا محبوب قرار دے دیں اور واقعہ یہ ہے کہ ایسا صاحب کمال جو اس قابل ہو کہ فرزندِ رسولؐ اسے اپنا محبوب بنالیں۔ اس کا نام حبیب غلط نہیں رکھا گیا ہے۔ تاریخ کربلا میں یوں تو سب باکمال ہیں۔ وہ چھ مہینے کا بچہ ہو یا اسّی سال کا سب باکمال ہیں۔ ان کے کمال میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن دو شخصیتیں ایسی ہیں کہ جن کا کمال پیدائشی طور پر ان کے ناموں میں جذب ہو گیا ہے اور یہ بھی انسان کے مقدر کی بات ہے کہ جیسا نام رکھ دیا جائے آدمی ویسا ہی ہو جائے۔ یا جیسا ہونے والا ہے ابتدا سے اس کا نام بھی ویسا ہی ہو جائے۔

ہم نے کربلا میں دو ایسے خوش قسمت دیکھے ہیں:

ایک حسینؑ کا وہ محبوب ہے جو محبوب بعد میں دکھائی دیا حبیب بچپنے سے تھا۔ اور ایک وہ تھا جس نے اپنی حریت کا مظاہرہ بعد میں کیا مگر نام پیدائشی طور پر اُسے "حُر" مل گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حق حریت ادا کر دیا اور یزید

کی غلامی سے آزاد ہو کر حسینؑ کی غلامی میں آگیا تو مولا نے سند دے دی۔

اے حُر! تیری ماں کتنی سچّی تھی کہ اُس نے تیرا نام حُر رکھا تھا۔ تو دنیا میں باطل کی غلامی سے آزاد ہو گیا اور آخرت میں آتشِ جہنم سے آزاد ہو گیا۔

وہ جس کو ماں نے حبیب بنایا تھا وہ حسینؑ کا حبیب بن کے سامنے آیا اور جس کو اس کی ماں نے حُر قرار دیا تھا اُس نے کربلا میں اپنی حُریت کا ثبوت دے دیا۔ لیکن چونکہ میں ذکرِ محبت کر رہا تھا لہٰذا اِسی تذکرہ حبیب ابن مظاہر پر گفتگو کو تمام کرنا چاہتا ہوں۔

حبیب میں وہ کون سا کمال تھا جس کی بنا پر حسینؑ نے ایسا محبوب بنایا کہ سب حسینؑ کے ساتھ آئے تھے۔ اور یہ ایک ایسا چاہنے والا تھا جس کے کمال کی بنا پر حسینؑ نے اس کو بلایا تھا اور شائد کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ اِسی ایک کو کیوں بلایا تو حسینؑ نے کسی اور محبت کا حوالہ نہیں دیا کمال ہی کا حوالہ دیا۔

"مِنَ الْحُسَيْنِ ابْنِ عَلِيٍّ إِلَى الرَّجُلِ الْفَقِيهِ"

یہ خط ہے حسینؑ ابن علیؑ کا ایک مردِ فقیہ کے نام۔ یہ مردِ فقیہ لکھ کے حسینؑ نے بتا دیا کہ میری محبت حبیب سے کمال کی محبت ہے۔ حبیب چونکہ مردِ فقیہ ہے لہٰذا میں اس سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ اس کا فراق گوارا نہیں کرتا۔ جہاں سب میرے چاہنے والے ہیں حبیب کو بھی آنا چاہیئے۔

حسینؑ نے خط لکھا، نامہ بر خط لے کے چلا اور اس وقت آیا حبیب کے دروازے پر، جب حبیب دسترخوان پر بیٹھے ہوئے تھے اور زوجہ کے ساتھ کھانا کھانا چاہتے تھے کہ ایک مرتبہ آنے والے نے دقّ الباب کیا۔ پوچھا کون؟ کہا أَنَا بَرِيدُ الْحُسَيْنِ میں فرزندِ رسولؐ کا قاصد، حسینؑ کا نامہ بر ہوں۔ آئے دروازے پر۔ آنے والے قاصد نے خط دیا۔ حبیب نے خط کو آنکھوں سے لگایا۔ سر پر رکھا سینے سے لگایا۔ نبی زادے کا خط ہے۔ زہراؑ کے نورِ نظر کا خط ہے۔ لفافہ کھولا خط پڑھا۔ حبیب تم تو جانتے ہو کہ پیغمبر سے ہماری قرابت کیا ہے۔ تم تو جانتے ہو کہ رسول اللہ سے ہمارا رشتہ کیا ہے۔ شائد تمہیں ہمارے حالات نہیں معلوم ہیں۔ اے حبیب! ہم مصیبتوں میں گھرتے جا رہے ہیں۔

ہم چاروں طرف سے زغۂ اعدا میں گھرتے جا رہے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو ہماری مدد کے لیے آجاؤ۔

حبیب گھر کے اندر آئے۔ زوجہ نے پوچھا:

کس کا خط ہے؟

کہا، میرے مولا حسینؑ ابن علیؑ کا خط ہے۔ نبیؐ کے نواسے کا خط ہے۔

کیا لکھا ہے؟ زوجہ نے کہا۔

خط کا مضمون سُنایا۔

حبیب کیا ارادہ ہے؟

کہا میں سوچ رہا ہوں کہ حالات تو زمانے کے بہت خراب ہیں۔ ہر طرف ناکہ بندی ہے۔ حسینؑ کی مخالفت پر دنیا آمادہ ہو گئی ہے۔ اس خط کا کیا جواب دوں؟

کہا، حبیب جواب کے بارے میں سوچ رہے ہو؟۔ اگر تم مولا کی نصرت کے لیے نہیں جا سکتے ہو تو تم گھر میں بیٹھو، میں جاؤں گی۔

حبیب نے کہا، مومنہ میں چاہتا تھا کہ تیرے جذبۂ محبت کا بھی اظہار ہو جائے ورنہ میرا آقا یاد کرے اور غلام نہ جائے۔ یہ بھلا کس طرح ممکن ہے۔

اس کے بعد اپنے خادم کو بُلایا اور بُلا کے کہا، یہ میرا رہوار ہے، اسے فلاں مقام پر لے جا کر میرا انتظار کرنا۔ میں کسی نہ کسی بہانے وہاں تک پہونچ جاؤں گا۔

حبیب چلے ایک مرتبہ راستہ طے کرتے ہوئے۔ جب اُس منزل پر پہونچے جہاں غلام گھوڑا لیے ہوئے انتظار کر رہا تھا تو حبیب نے عجب منظر دیکھا۔ دیکھا کہ گھوڑے کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور غلام اس سے باتیں کر رہا ہے:

اے اسپ باوفا! اگر کسی مجبوری کی بنا پر میرا آقا نہ آسکا تو میں تیری پُشت پر سوار ہو کے چلوں گا اور فرزندِ فاطمہؑ کی مدد کروں گا۔

بس یہ سُننا تھا کہ حبیب کا دل تڑپ گیا۔ کہا زہراؑ کے لال! مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ پر یہ وقت آگیا ہے کہ غلام جان قربان کرے اور جانور آنسو بہائے۔ اجرکم

عَلَى اللّٰهِ ۔ خدا آپ کو کسی غم میں نہ رلائے سوائے غمِ آلِ محمدؐ کے۔

آئے قریب۔ وفاداری کی داد دی غلام کو اور گھوڑے پر سوار ہوئے۔ کہا جاؤ تم جاؤ، اب میں جا رہا ہوں مولا کی مدد کے لئے۔

جیسے ہی غلام نے یہ فقرہ سُنا، حبیب کے پاؤں پکڑ لئے۔ کہا مالک یہ خوب انصاف فرمایا آپ نے۔ جب تک اپنی خدمت کا وقت تھا آپ نے مجھے اپنے ساتھ رکھا، اور جب فرزندِ رسولؐ کی خدمت کا وقت آیا ہے تو آپ مجھے الگ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نہ ہو سکے گا میں ساتھ چلوں گا۔

حبیب نے غلام کو بھی ساتھ لیا اور جب اس منزل کے قریب پہونچے، تو ایک مرتبہ فرزندِ فاطمہؑ نے آواز دی، میرے چاہنے والو اُٹھو۔ ہاشمی جوانو اُٹھو۔ بھیا عباسؑ۔ علی اکبرؑ۔ ارے میرا بچپن کا جاں نثار آ رہا ہے۔ اصحاب بڑھے۔ بنی ہاشم کے جوان بڑھے۔ حبیب کا استقبال کیا۔ حبیب جب درِ خیمہ کے قریب آئے، اصحاب میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ خیمہ کے اندر یہ خبر جیسے ہی پہونچی کوئی آیا ہے۔ شہزادی نے فرمایا فضہ! ذرا خبر لے کر آؤ کون آیا ہے؟ ہم جب سے بلا کے بن میں آئے ہیں یہی سُن رہے ہیں کہ فوجیں آ رہی ہیں۔ لشکر آ رہے ہیں۔ دشمن آ رہے ہیں۔ یہ اصحاب کیوں مسکرا رہے ہیں۔ خبر لے کر آؤ کون آیا ہے۔ کہا آقا کا بچپنے کا جاں نثار حبیب آیا ہے۔

جیسے ہی زینب نے یہ سُنا، کہا فضہ جاؤ، جا کے حبیب سے ہمارا سلام کہو اور کہنا حبیب تم نے بڑا احسان کیا جو میرے بھیا کی مدد کے لئے آ گئے۔

فضہ نے سلام پہونچایا۔ حبیب زمین پر بیٹھ گئے۔ خاک اُٹھا کر سر پر ڈالی منھ پر طمانچے مارے۔ ارے زہراؑ کی بیٹیوں پر یہ وقت آ گیا ہے کہ غلاموں کو سلام کہلا بھیجیں۔ حبیب بے قرار ہو گئے اب اُس وقت کے منتظر ہیں کہ کب وہ وقت آ جائے کہ حبیب اپنی جان قربان کر دیں۔ وقت گذرتا رہا۔ عاشور کا دن آیا۔ ظہر کا ہنگام آیا۔ نماز تمام ہو گئی۔ حبیب کو اجازت ملی، میدان میں آئے۔ جہاد تمام ہوا، گھوڑے سے گرتے

ہوئے مولاؑ کو پکارا۔

وہ پہلا کمال تھا جس کا حوالہ حسینؑ نے دیا خط لکھتے ہوئے، اور یہ آخری کمال ہے کہ حسینؑ مقتل میں آ کے سرہانے بیٹھے۔ سر اٹھا کے زانو پر رکھا۔ فرمایا رَحِمَہُ اللّٰہُ حَبِیْبًا خدا میرے حبیب پر رحمت نازل کرے۔ میرا حبیب ایک رات میں پورا قرآن ختم کر لیا کرتا تھا۔ یہ حبیب کا آخری کمال ہے ایک رات میں پورے قرآن کی تلاوت۔

اب جو حسینؑ لاشِ حبیب سے اُٹھے تو راوی کہتا ہے میں نے دیکھا حسینؑ کے چہرے پر خستگی کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ حسینؑ کے چہرے پر اُداسی چھائی ہوئی ہے۔ ارے مولا یہ کیا ہوا؟ فرمایا میرا بچپن کا جاں نثار مارا گیا۔

بس عزیزو فرق پہچانو۔ حبیب مارے گئے تو چہرے پر خستگی کے آثار تھے اور عباسؑ نے فرات سے آواز دی تو کمر کو تھام لیا۔

بھیا کمر ٹوٹ گئی۔ عباس اب تمہارا بھائی اکیلا ہو گیا۔ دشمن طعنے دے رہے ہیں۔ علمدار کہاں ہے۔ بتاؤ عباسؑ! حسینؑ کیا جواب دے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

چھٹی مجلس

حکمت امام حسین علیہ السّلام

"حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اللہ اس سے محبت کرے جو میرے حسینؑ سے محبت کرے۔"

سرکار دو عالمؐ کے اس ارشاد گرامی کی روشنی میں جو سلسلۂ کلام عرفانِ امام حسینؑ کے عنوان سے آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا۔ اس کے چھٹے مرحلہ پر کچھ باتیں حکمتِ امام حسینؑ سے متعلق آپ کے سامنے پیش کرنا ہے۔ سب سے پہلے اپنے عزیز بچوں اور نوجوانوں کے لئے لفظ حکمت کی مختصر سی تشریح۔ اور اس کے بعد یہ گذارش کرنا ہے کہ اسلام دین حکمت ہے اور اسلام کا کوئی قول، کوئی عمل حکمت سے خالی نہیں ہے۔ پروردگار عالم نے جب اپنے پیغمبرؐ کو بھیجا تو پیغمبرؐ کی بعثت کا بنیادی مقصد یہی قرار دیا کہ لوگ دو اہم چیزوں سے بے خبر ہیں، پیغمبرؐ انھیں دونوں سے باخبر بنائے گا۔ نہ یہ کتاب جانتے ہیں نہ حکمت جانتے ہیں۔ لہٰذا پیغمبرؐ کا کام ہے کہ انھیں کتاب کی تعلیم بھی دے اور حکمت کی تعلیم بھی دے۔

چونکہ قوم ایسی ہے جو "ضلال مبین" کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہے۔ علمی اعتبار سے بھی خالی ہاتھ ہے اور عملی اعتبار سے بھی یا بے عمل ہے یا بد عمل۔ لہٰذا پیغمبرؐ کی ذمہ داری ہے کہ انھیں علمی اعتبار سے مالا مال بنانے کے لئے کتاب کی تعلیم دے اور عملی اعتبار سے سدھارنے کے لئے حکمت کی تعلیم دے۔ جو چیز انسانی زندگی

میں علم کے کام آتی ہے اس کا نام ہے کتاب اور جو انسان کے کردار کی اصلاح کرتی ہے، اس کا نام ہے حکمت۔

فلسفہ کی دنیا میں علم بھی حکمت ہی میں شامل ہے۔ لیکن میں ان تمام تفصیلات میں آپ کا وقت نہیں صرف کرسکتا۔ صرف اجمالاً یہ گذارش کرنا ہے کہ انسانی زندگی کے جتنے عملی مرحلے ہیں، ذاتی اصلاح سے لے کر ملکی انتظام تک یہ سب دائرۂ حکمت میں شامل ہیں اور حکمت اس مستحکم، مضبوط، بامعنیٰ اور عقلی عمل کا نام ہے کہ جسکی بنیادیں علم پر قائم ہوں اور اس کے بعد انسانی کردار کی بنیاد اسی حکمت پر قائم ہو۔

حکمت کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے اپنے نفس کی اصلاح۔ اس لئے کہ جب تک اصلاح نفس نہ ہوسکے اس وقت تک دنیا کی اصلاح نہیں ہوسکتی ہے۔ اور آج دنیا کا ہر مصلح جو اصلاح کے مرحلے میں ناکام ہوجاتا ہے اس کا بنیادی راز یہی ہوتا ہے کہ دوسروں کو سنوارنا چاہتا ہے اپنی ذات سے بے خبر ہوکر۔ اور میں یہاں بھی ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں کہ دنیا کا کوئی مصلح اگر اپنے نفس کی اصلاح کرکے بھی دنیا کی اصلاح کرنا چاہے جب بھی وہ منزل اصلاح میں کامیاب نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لئے کہ بہت پرانی مثل ہے کہ طبیب، حکیم، ڈاکٹر اپنا علاج خود کرے تو وہ علاج اتنا کامیاب نہیں ہوتا ہے جتنا کامیاب وہ علاج ہوتا ہے جب مریض کوئی اور ہوتا ہے اور معالج کوئی اور ہوتا ہے۔ دور قدیم میں فن طب میں یہ محاورہ مشہور تھا کہ رَایُ العَلِیلِ عَلِیلٌ "بیمار کی رائے خود بھی بیمار ہوجاتی ہے۔ اس لئے کہ جو رائے قائم کرنے والا ہے اگر وہ خود ہی پہلے سے بیمار ہے تو اسے اپنی بیماری کا اندازہ ہی نہیں ہوتا ہے علاج کیا کریگا۔

ساری دنیا میں ساری بیماریوں کے علاج جو ناکام ہوتے ہیں اس کی ایک بڑی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جو علاج کرنے والا ہے وہ مرض کو نہیں جانتا ہے اور جو مریض ہے وہ علاج نہیں جانتا ہے۔ بیمار ڈاکٹر صاحب کے سامنے جاکے بیٹھ گیا۔ پوچھا کیا تکلیف ہے؟ اس نے اگر کہہ دیا کہ سر میں درد ہے، تو ہے۔ اور اگر کہہ دیا نہیں ہے، تو پھر نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس کوئی ایسا آلہ نہیں ہے جو بتاسکے کہ میرے سر میں

درد ہے یا نہیں؟ تکلیف میں بیان کروں گا دوا وہ دیں گے۔ تو اگر تکلیف بیان کرنے والا خود ہی اپنی تکلیف کو نہیں سمجھا یا اپنی ہی ذات سے خیانت اور بددیانتی کا عمل انجام دینے لگا تو بیچارہ طبیب اور ڈاکٹر کیا کرے گا۔ وہ علاج جانتا ہے بیماری نہیں جانتا ہے اور یہ جو بیمار ہے یہ بیماری جانتا ہے مگر علاج نہیں جانتا ہے۔ جب کام دو انسانوں میں تقسیم ہو جائے گا تو ناکامی کے اسباب زیادہ ہو جائیں گے۔

مقصد یہ ہے کہ ساری خرابی یہ ہوتی ہے کہ جو بیمار ہے وہ علاج نہیں جانتا ہے اور جو علاج کرنے والا ہے وہ بیماری نہیں جانتا ہے۔ اس لئے جب دونوں میں اتفاق ہو جاتا ہے تو علاج کام آجاتا ہے اور جب ذرا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ بیماری نہ سمجھ سکا یا یہ علاج نہ سمجھ سکا تو بیماری بڑھتی جاتی ہے اور علاج چلتا رہتا ہے اور ایک دن وہ آجاتا ہے جب مریض دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ علاج کرنے والا عالم الغیب نہیں تھا۔ تو جب تک علاج کرنے والا معالج ہوگا اور صاحب علم غیب نہیں ہوگا تو اگر صحیح بیماری معلوم کرلے گا تو علاج ہو جائے گا ورنہ تباہی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جسمانی علاج کے لئے بھی ایسے طبیبوں کی ضرورت ہے۔ جن کے ساتھ مریض غداری نہ کر سکے اور وہ لاکھ کہے کہ میں صحت مند ہوں مگر یہ پہچانتے ہوں کہ بیمار ہے۔ وہ لاکھ کہے کہ سر میں درد نہیں ہے، مگر یہ جانتے ہوں کہ کتنا درد سر ہے۔ اسی لئے خدا نے جنھیں طبیب بنایا تھا انھیں بیماروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا تھا بلکہ وہ ہر ایک کے نفس کی کمزوری جاننے والے تھے۔ وہ ہر ایک کی بیماری کو پہچانتے تھے۔ ورنہ جو سامنے آکے بیٹھتا یہی کہتا کہ ہم سے بڑا متقی کوئی نہیں ہے۔ ہم سے بڑا مصلح کوئی نہیں ہے۔ ہم سے بڑا بہترین کردار والا کوئی نہیں ہے۔ مگر جیسے ہی کہا بہترین کردار والے۔ پروردگار نے کہا پیغمبرا ہوشیار رہے گا یہ مصلح کہتے ہیں، اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ ہم بتا رہے ہیں کہ یہی مفسد ہیں۔

تو جب مریض ہی اپنے ساتھ غداری کرے گا تو معالج علاج کیا کرے گا۔

اسی لئے خدا نے اپنے معالج کو جس کو اس نے طبیب بنایا تھا ایسا صاحب علم و کردار بنایا تھا کہ لاکھ مریض کہتا رہے کہ میں بیمار نہیں ہوں، مگر پیغمبر بیماری کو جانتا ہے علاج کرنا بھی جانتا ہے۔

ہم زندگی بھر قرآن پڑھتے رہیں اور پڑھ پڑھ کر دم کرتے رہیں نزلے کا بھی علاج نہیں ہوتا ہے۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ بیمار کے سامنے نہیں اگر مُردے کے سامنے سورۂ حمد پڑھ دیا جائے اور مُردہ اٹھ کے بیٹھ جائے تو خبردار تعجب نہ کرنا کہ کلام پروردگار کا کام ہے مُردوں کو زندگی دینا۔ صلوات

تو میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ اگر ہم آپ دنیا کی اصلاح کرنا چاہیں تو اصلاح عالم کی بنیادی شرط ہے کہ پہلے اپنے نفس کی اصلاح کریں اور پھر مسئلہ یہ ہوگا کہ اپنی اصلاح کون کرے گا۔ ہم ہی آپ تو کریں گے۔ یعنی ہم ہی بیمار، ہم ہی معالج۔ آپ سے سُنا اصلاح یوں ہوتی ہے کام شروع کر دیا۔ ان سے سُنا اصلاحِ نفس یوں ہوتی ہے کام شروع کر دیا۔ جہاں جو کام سُن پایا کہ نفس اس سے پاکیزہ ہوتا ہے وہی کام شروع کر دیا۔ لیکن بہرحال یہ نفس اپنے مقام پر رہے گا۔ ہم ہی اپنے نفس کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو یہ اصلاح خود ہی کمزور رہ جائے گی اور پھر اس کے نتیجے میں جو اصلاحِ عالم ہوگی اس میں بھی استحکام نہیں ہو سکتا ہے۔

کاش میری بات واضح ہو جائے یہ مجھے بھی معلوم ہے اور ہر انسان جانتا ہے کہ دوسرے کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کرنی چاہئے۔ مگر کرے گا کون؟ ہم ہی تو اپنے نفس کی اصلاح کریں گے۔ یعنی جو بیمار ہے وہی تو معالج ہوگا اور جب تک یہ کمزوری رہے گی اُس وقت تک نہ اُس کی اصلاح ہو سکتی ہے اور نہ یہ کسی کی اصلاح کر سکتا ہے۔

اگر آپ نے اس نکتہ کو محسوس کر لیا ہے تو میں ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں جب تک ہم خود اپنی اصلاح کر کے اصلاح کرنا چاہیں گے نہ مصلح کا اعتبار ہوگا اور نہ اصلاح کا اعتبار ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جس کو اصلاح عالم کی ذمہ داری دی جائے

وہ خود اپنے نفس کی اصلاح کرنے والا نہ ہو، اور اس سے یہ نہ کہا جائے کہ پہلے اپنے نفس کی اصلاح کرو اس کے بعد لوگوں کو پاکیزہ بنانا۔

اور یہی وجہ ہے کہ پروردگار نے جن کو نفس پاکیزہ بنانے کا ذمہ دار بنایا تھا ان کے نفس کی پاکیزگی کو ان کے حوالہ نہیں کیا تھا بلکہ ان کے نفس کو اس نے خود پاکیزہ بنایا تھا تاکہ کائنات کے نفس کو وہ پاکیزہ بنائیں۔ صلوات

اگر نہیں سمجھے تو اب سمجھیں۔ آیۂ تطہیر کے معنی کیا ہیں۔ اہلبیتؑ! تمھاری طہارت کا خدا ذمہ دار ہے۔ تمھاری پاکیزگی کا خدا ذمہ دار ہے۔ تم میں اور ساری دنیا میں بنیادی فرق یہ ہے کہ سب اپنے نفس کی خود اصلاح کرتے ہیں۔ تمھارے نفس کو اس نے پاکیزہ بنایا ہے۔ اور جب تک مریض اور معالج ایک رہے گا کمزوری برقرار رہ جائے گی اور جب خدائی مصلح اصلاح کرنے والا اور پاکیزہ بنانے والا ہوگا تو جب تک ارادۂ خدا کمزور نہ ہو جائے طہارت آل محمدؐ کمزور نہیں ہو سکتی ہے۔ صلوات

تو عزیزو! حکمت علمی کا پہلا مرحلہ ہے اپنے نفس کو پاکیزہ بنانا اور دوسرا مرحلہ ہے اپنے احباب کو، گھر والوں کو، اپنے سے متعلق افراد کو پاک و پاکیزہ بنانا اور ان کے نفس کی اصلاح کرنا۔ آخری مرحلہ ہوتا ہے اصلاح عالم۔ اور یہ ساری باتیں وہ ہیں جو حکمت علمی کے مختلف مراحل کی شکل میں بیان کی جاتی ہیں۔ لیکن سب کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان وہ طریقۂ کار اختیار کرے جو طریقۂ کار واقعاً اصلاح کر سکتا ہو اور جس کے لئے بہترین نسخہ ہے قرآن حکیم۔ پیغمبر کتاب خدا کی تعلیم دیتا ہے اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ یعنی پہلے کتاب پڑھاتا ہے کہ دوا معلوم ہو جائے، نسخہ معلوم ہو جائے، علاج معلوم ہو جائے۔ اس کے بعد حکمت سکھاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ دوا کو کیسے استعمال کیا جائے گا، نسخے پر کیسے عمل کیا جائے گا۔ یہ خلاصہ ہے کتاب و حکمت کی تعلیم کا۔

سرکار دو عالمؐ نے یہ دونوں کام اپنی زندگی میں انجام دیئے اور فریضۂ الٰہی کو مکمل طریقے سے ادا کر دیا اور ایسا ادا کر دیا کہ پروردگار عالم سے سند کمال حاصل

کر لی۔

یہ مختصر تمہید تھی اب میں چاہتا ہوں کہ تاریخ اسلام کے چند اوراق آپ کے سامنے رکھوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ حکمت کی راہ میں آگے بڑھنے والے اور حکیمانہ اعمال انجام دینے والے کیسے افراد ہوتے ہیں۔ لیکن بات آگے بڑھانے سے پہلے دو لفظیں اور ضمناً یاد رکھیے گا۔

پروردگار عالم نے قرآن مجید میں بار بار اپنا تعارف کرایا ہے لفظ حکیم سے۔ یہ حکیم وہ نہیں ہے جو ہمارے یہاں طبیب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ اس نے بھی نسخہ ہی لکھا ہے اور اتنا طویل نسخہ لکھا ہے کہ جس میں دنیا کی ہر بیماری کا علاج موجود ہے لیکن پروردگار عالم نے اپنے کو حکیم قرار دیا ہے اور اس کے لئے دو شعبے قرار دئے ہیں اور دونوں میں اپنی حکمت کا مظاہرہ کرنا چاہا ہے۔

خدا کی اس کائنات میں ایک کا نام ہے "تخلیق" پیدا کرنا۔ اور دوسرا کام ہے ہر ایک کی زندگی کے لئے ایک قانون بنانا۔ اس نے اگر درخت کو پیدا کیا ہے تو درخت کی بقا کا ایک قانون بنایا ہے۔ اگر ذرّات کو پیدا کیا ہے تو ذرّات کی بقا کا ایک قانون بنایا ہے۔ اگر جانوروں کو پیدا کیا ہے تو ان کی زندگی کا ایک نظام بنایا ہے۔ اگر انسان کو خلق کیا ہے تو چونکہ صاحب عقل وارادہ تھا لہٰذا اس کی زندگی کے واسطے بھی ایک مفصّل قانون بنا دیا ہے، جس کا نام ہے "شریعت"۔ جو درختوں کی بقا کا قانون ہے اس کو شریعت نہیں کہا جاتا۔ جو جانوروں کی زندگی کا قانون ہے اس کو شریعت نہیں کہا جاتا ہے۔ لیکن جو انسانی زندگی کا قانون ہے اسے شریعت سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ شریعت اس نظام کا نام ہے جس کو بناتا ہے خدا، عمل میں لاتا ہے بندہ اپنے ارادہ اور اپنے اختیار سے۔ جانوروں کے یہاں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ پتھروں میں یہ بات نہیں ہے۔ درختوں میں یہ بات نہیں ہے۔ لیکن نظام پروردگار ہر جگہ اپنا کام کر رہا ہے تو تخلیق میں بھی اسی کا نظام ہے اور زندگی گذارنے میں بھی

اُسی کا نظام ہے۔ یہ دو شعبے ہیں پروردگارِ عالم کے کاموں کے۔

اب پروردگار نے کہا کہ میں ہوں خدائے حکیم۔ یعنی اگر میری حکمت کو پہچاننا ہے تو چاہے میری تخلیق میں دیکھو، چاہے میری تشریع میں دیکھو، جو قانون بھی بنادیا ہے وہ حکمت سے الگ نہیں ہے اور جو مخلوق بھی بنادی ہے وہ حکمت سے الگ نہیں ہے اگر آپ آلِ محمدؐ کے ارشادات کا جائزہ لیں گے تو آپ کو ان باتوں کی معنویت کا مزید اندازہ ہو جائے گا۔

آنے والا امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں آیا اور وہ امام سے کچھ حکمت پروردگار کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے۔ امام نے ایک وجودِ انسان کو سامنے رکھ کے پورے انسانی حلیہ کا نقشہ کھینچ دیا اور سر کے بالوں سے لے کر پیروں کے ناخونوں تک ہر جزءِ بدن کی حکمت و مصلحت کا ذکر کر دیا۔ اور اس کے علاوہ جب کوئی امام کے سامنے آگیا اور ذرا اپنی قابلیت کا اظہار کرنے لگا تو آپ نے فوراً پوچھ لیا کہ اگر خدا حکیم ہے تو ذرا اس کام کی حکمت بتاؤ۔ ساری قابلیت رکھی رہ گئی۔ واقعات آپ کو معلوم ہیں اور اگر نہیں معلوم ہیں تو کتابوں میں دیکھیں۔

آج ساری دنیا میں جتنے ڈگری پانے والے ہیں۔ سب خالی حکمتوں کو ڈھونڈھ رہے ہیں، کوئی حکمتوں کا موجد نہیں ہے۔ آنکھوں میں اتنے پردے کیوں رکھے گئے ہیں۔ روشنی اتنے پردوں سے کیوں گذرتی ہے۔ اِدھر سے کیوں جاتی ہے، اُدھر سے کیوں آتی ہے۔ پیر ایسے کیوں بنے۔ ہاتھ ایسے کیوں بنے۔ ناک ایسی کیوں بنی۔ بال اتنے کیوں ہیں۔ یہ ساری ریسرچ دنیا میں ہو رہی ہے اور ایک ایک جزءِ بدن کی ریسرچ پر بڑی بڑی ڈگریاں لوگ لے کر ٹہل رہے ہیں اور سب ان کی عظمتوں کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں۔ بات آئی ہے عزیزو تو ایک جملہ کہنا چاہتا ہوں کہ کم سے کم مومن مسلمان ہونے کے اعتبار سے اتنی معرفتِ خدا تو ہونی چاہئے کہ جب انھوں نے ناخون پر ریسرچ کرلی۔ انھوں نے ہاتھ کی انگلیوں پر ریسرچ کرلی۔ انھوں نے انگلیوں کے خطوط پر ریسرچ کرلی۔ انھوں نے پیشانی کے خطوط پر ریسرچ کرلی۔ انھوں نے آنکھوں پر

تحقیق کی۔ انھوں نے کانوں کے پردوں پر ریسرچ کی۔ انھوں نے ناک کے سوراخ پر تحقیق کی اور جب سیکڑوں تحقیق کرنے والے اکٹھا ہو گئے تو ایک انسان کے وجود کی تحقیق ہو سکی۔ اب تو پہچانو کہ لاکھوں محققین مل کے جس وجود کو پہچانتے ہیں اکیلا خدا اس وجود کو ایجاد کرتا ہے۔ صلوات

عزیزانِ محترم! بات دور نہ چلی جائے کہ موضوع نامکمل رہ جائے۔ میں بہت ہی اختصار کے ساتھ گذارش کرنا چاہتا ہوں ورنہ باتیں بہت ہیں۔ تو پروردگار عالم کا ایک نظام تخلیق ہے اور اسی کے مقابلہ میں ایک نظام تشریع ہے جہاں خدا قوانین بناتا ہے۔ زندگی گذارنے کے اصول طے کرتا ہے۔ لوگوں کو بتاتا ہے کیا کرنا ہے کیا نہیں کرنا ہے۔ لیکن دونوں شعبے وہ ہیں جہاں انسان جاہل ہے۔ نہ تخلیق کے بارے میں کچھ جانتا ہے نہ تشریع کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ خدا ہی کا کام یہ بھی ہے اور خدا ہی کا کام وہ بھی ہے۔

ایک صاحب آئے کہا یہ بتائیے کہ مغرب کی تین رکعتیں کیوں ہیں، آپ مولانا صاحب ہیں۔ میں نے کہا میں بتا دوں گا، میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے مگر ایک سوال میرا ہے اس کا جواب آپ دید یجئے۔ کہنے لگے پوچھئے؟ میں نے کہا یہ ہاتھ میں پانچ انگلیاں کیوں ہیں اور چھوٹی بڑی کیوں ہیں؟ کیا بنانے والے کا سانچہ ٹیڑھا ہو گیا تھا اور اگر بنانے والے کا سانچہ ٹیڑھا ہو گیا تھا تو اللہ نے چاقو بھی تو پیدا کر دیا ہے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ بنانے والے نے ٹھیک نہیں بنایا ہے یہ اونچ نیچ ہے مساوات کے خلاف ہے، عقل و منطق کے خلاف ہے تو چاقو آپ کے ہاتھ میں ہے کم سے کم اپنی انگلیاں تو ٹھیک کر لیجئے تاکہ یہ کہا جائے کہ ہم مساوات کے علمبردار ہیں۔

کہنے لگے یہ تو بنانے والا جانتا ہے میں کہاں سے بتاؤں گا۔

میں نے کہا عزیز محترم! اُسی بنانے والے نے دو چیزیں بنائی ہیں۔ آپ کی انگلیاں بھی اسی نے بنائی ہیں اور مغرب وعشار کی رکعتیں بھی اسی نے بنائی ہیں۔

ایک آپ بتا دیجئے ایک میں بتا دوں گا اور اگر یہ چھوٹی بڑی ہو سکتی ہیں اور اسی سے کاروبار چل رہا ہے تو وہ بھی چھوٹی بڑی نمازیں ہوں گی اور اسی سے کاروبار بندگی چلے گا۔ صلوات

عزیزانِ محترم! یہ میں کسی کو خاموش کرنے کے لئے بات نہیں کہہ رہا ہوں، میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس نکتہ کو پہچانیں کہ یہ نظام تخلیق بھی خدا کا..... اور نظام تشریع بھی خدا کا ہے۔ جو مخلوق آپ کے سامنے ہے اس مخلوق کے بارے میں بھی آپ کو کچھ نہیں معلوم ہے تو جیسے مخلوقات کے بارے میں نہیں جانتے ہیں اور توڑ پھوڑ کرنے کا ارادہ نہیں کرتے ہیں ویسے ہی اگر قانون کے بارے میں نہیں جانتے ہیں تو دخل اندازی کا ارادہ نہ فرمائیں۔ یہ چھوٹی بڑی انگلیاں ہیں جن سے زندگی کا کام چل رہا ہے وہ دو رکعت، چار رکعت کی نمازیں ہیں جن سے بندگی کا کام چل رہا ہے۔ اب کیسے زندگی کا کام چل رہا ہے یہ انگلیاں بنانے والا جانتا ہے اور کیسے بندگی کا کام چل رہا ہے یہ رکعتیں بنانے والا جانتا ہے۔

کہا یہ بتائیے قیام کیوں ہے؟ رکوع کیوں ہے؟ سجدہ کیوں ہے؟ ایک ہی طرح سے ہو جاتا۔؟

تو میں نے کہا آپ خود بتائیے کہ آپ کبھی سیدھے کیوں کھڑے ہوتے ہیں۔ کمر میں اتنی لچک کیوں ہے کہ جھک جاتے ہیں۔ نہ کمر میں لچک ہوتی نہ حکم رکوع آتا۔ تو پہلے تخلیق میں لچک پیدا ہوئی اس کے بعد تشریع کا قانون آیا۔ تو پہلے آپ بتائیے کہ یہ کمر بالکل سیدھی کیوں نہ کر دی گئی۔ چوبیس گھنٹے یوں ہی کھڑے رہتے اور آخر میں پارسیوں کی طرح دفن ہو جاتے۔ کہیں جھکنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ معلوم ہوتا کہ انسان ایسا سر بلند ہے کبھی جھکتا ہی نہیں ہے مگر معلوم ہوا کہ زندگی اس سر بلندی میں نہیں ہے کہ سیدھے کھڑے رہیں۔ اس زندگی کا نظام یوں ہی چلتا ہے کہ کبھی اٹھنا پڑتا ہے، کبھی جھکنا پڑتا ہے۔ تو اگر نظام زندگی یونہی چل رہا ہے کہ کبھی سیدھے ہو جاؤ اور کبھی جھک جاؤ تو نظام بندگی بھی یونہی چلتا ہے۔ مالک کہتا ہے کہ جیسے جیسے زندگی کے رنگ بدلتے جائیں ویسے ویسے

ہمارے سامنے سر جھکاتے جاؤ۔ اگر سیدھے کھڑے ہو تو مجھے یاد رکھو اور اگر جھک جاؤ تو مجھے یاد رکھو۔ اگر اور آگے بڑھ جاؤ تو بھی مجھے یاد رکھو۔ تخلیق تشریع سے الگ نہیں ہے اور تشریع تخلیق سے الگ نہیں ہے۔ صلوات

یہ ایک عنوان ہے جو میں نے آپ کے حوالے کیا ہے۔ اس پر غور کرنے کے لئے مہینوں کا وقت درکار ہے بلکہ پوری زندگی بھی ناکافی ہے اور کم از کم مجھ جیسے کم علم کو تو بیان کرنے کے لئے بھی ہفتوں چاہیے کہ پروردگار عالم نے تخلیق میں اور قانون میں کیسا ارتباط رکھا ہے اور جب تک انسان تخلیق کی مصلحتوں کو نہ پہچان لے اس وقت تک تشریع کی مصلحتوں کو نہیں پہچان سکتا ہے۔ یہ تو خالی زبان ہے کہ جس کو اللہ نے قوت گویائی دے دی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ کسی اور پر اعتراض کریں گے تو مار کھا جائیں گے۔ تو خدا ہی پر اعتراض کرنے لگتا ہے کہ وہی ایسا حلیم و کریم ہے کہ سب کی سن لیتا ہے۔

اللہ کیسا حلیم ہے وہ پروردگار۔ ارے حکمتوں کا کیا ذکر ہے وجود تک کا انکار کر دیا اور کروڑوں انسان اس کے وجود کے بھی قائل نہیں ہیں۔ مگر وہ نہ کسی سے لڑتا ہے نہ کسی سے بحث کرتا ہے نہ کسی کو سزا دیتا ہے نہ کہیں مار پڑتی ہے بلکہ جو جتنا انکار کرتا ہے اس کو اتنی ہی ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ بھی اسکی حکمت کا ایک شعبہ ہے کہ اگر سزا دے دی تو دونوں برابر سمجھے جائیں گے۔ ان کی اوقات ہی کیا ہے کہ ان سے مقابلہ کیا جائے۔ انھیں چھوڑ دو ان کے حال پر جتنا آگے بڑھنا چاہیں آگے بڑھیں جب وقت آجائے گا تو ہم ایسی سزا دیں گے کہ جس کے بل پر اکڑ رہے تھے وہی سزا دے گا۔ جس کی وجہ سے اکڑ رہے تھے وہی سزا دے گا۔

جناب موسیٰ نے آ کے فرعون سے کہا کہ ایک خدا ہے اس کے آگے تم بھی سر جھکاؤ۔ کہا تم کون ہو، جو میرے سامنے بات کرو گے؟ دیکھو میرے سامنے نہریں بہہ رہی ہیں۔ تم کو تو ایک چلو پانی بھی نصیب نہیں ہوتا ہے، تم ہمیں کیا سمجھاؤ گے۔

سارا غرور یہ ہے کہ نہریں میرے قبضے میں ہیں۔ پروردگار نے کہا اب میرا

بھی سزا نہ دوں گا یہ نہر ہی سزا دے گی۔

قارون کے سامنے قانون پروردگار آیا۔ کہا تم کون ہو۔ تمہیں تو رہنے کے لئے مکان نصیب نہیں ہے یہ زمینیں میرے قبضہ میں ہیں۔ پروردگار نے کہا میں کیا سزا دوں گا یہ زمین ہی سزا دے گی۔ یعنی جو جس کے بل پر اکڑا اسی نے سزا دی۔ جو جس کی بنا پر غرور میں مبتلا ہوا خدا نے اسی کے ہاتھوں سزا دلوائی۔ یہی وجہ ہے کہ جو عوامی طاقت سے اوپر آتے ہیں عوام ہی انھیں کھینچ کر نیچے اتارتے ہیں۔ صلوات

بس عزیزانِ محترم! میں چاہتا تھا کہ آپ کے سامنے ایک پورا تفصیلی جائزہ لیتا اس حکمت کا جو پروردگار عالم نے اپنے نمائندوں کے حوالے کی ہے تا کہ ہم محسوس کر سکیں کہ ان کے اعمال میں کتنی حکمت پائی جاتی ہے۔ اور انھوں نے اپنی زندگی میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جو قدم غیر حکیمانہ ہو۔ اللہ کے نمائندوں کا کوئی عمل خالی از حکمت نہیں ہے اور جو کام کیا ہے وہ ویسا ہی منظم اور مرتب ہے جیسے پروردگار عالم نے اپنی حکمت کا مظاہرہ اپنی تخلیق میں کیا ہے ویسے ہی اس نے اپنے نمائندوں کو ایسا حکیم بنایا ہے کہ ان کا کوئی عمل بھی خلاف حکمت نہیں ہے۔ مگر اب تفصیلی جائزے کے لئے وقت نہیں رہ گیا ہے۔ لہذا بات کے صرف دو رُخ ہیں، ابتدا اور انتہا تاکہ یہیں سے آپ کو اندازہ ہو جائے کہ دنیا میں کوئی آدمی ہم آپ جیسا جب اسے فکر اصلاح پیدا ہوتی ہے تو وہ اصلاح کے لئے فیلڈ تلاش کرتا ہے کہ کہاں سے کام شروع کرے اور عام طور سے ہر آدمی اپنے علاقہ سے کام شروع کرتے ہوئے گھبراتا ہے کہ جیسے ہی اپنے علاقہ کے لوگوں سے کہے گا کہ یہ جو آپ داڑھی منڈاتے ہیں یہ غلط کام ہے۔ فوراً کہیں گے اچھا اپنے ابا جان کو بھول گئے، اپنے چچا کو بھول گئے، اپنے بچپنے کی شرارتیں بھول گئے۔ کس قدر مشکل ہے کہ بچپنا انھیں کے درمیان گذرا۔ جوانی انھیں کے درمیان گذری۔ زندگی انھیں کے درمیان گذری۔ خاندان وہی جانتے ہیں۔ اعزا کو وہی جانتے ہیں۔ تاریخ کو وہی جانتے ہیں۔ لہذا سب سے اچھا کام یہ ہے کہ بڑھو کہیں اور، اور مظاہرہ کرو کہیں اور کہ وہاں نہ کوئی بچپنے کو جانتا ہے، نہ کوئی

جوانی کو جانتا ہے۔ سب سمجھیں گے کہ بڑے مولانا ہیں، بڑے مقدس ہیں۔ تو ہر مبلغ کو یہ فکر ہوتی ہے کہ وہاں سے کام شروع کرے جہاں کوئی کمزوریوں کو جاننے والا نہ ہو، تاکہ بات میں اثر ہو۔

لیکن ذرا حکمتِ پیغمبرؐ کو دیکھئے۔ اللہ نے کہا میرے حبیب! یہ پوری کائنات میری ہے۔ میں کہیں سے کہہ سکتا ہوں کام شروع کرو۔ لیکن پہلے اپنے عشیرہ سے کام شروع کرو۔ پہلے اپنے قبیلہ سے کام شروع کرو پہلے اپنے خاندان سے کام شروع کرو اس لئے کہ انھوں نے تمھارا بچپنا دیکھا ہے۔ انھوں نے تمھاری جوانی دیکھی ہے۔ اب تو چالیس سال کے ہوگئے ہو۔ اب وہ جذبات امنگوں کا زمانہ گذر گیا ہے۔ وہ سارا زمانہ ان کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ جب تم ان کے سامنے کھڑے ہوگے تو کوئی تو کہے گا بچپنے میں ایسے تھے۔ کوئی تو کہے گا دس سال کی عمر میں ایسے تھے۔ کوئی تو کہے گا بیس سال کی عمر میں ایسے تھے۔ کوئی تو کہے گا چالیس سال کی عمر تک ایسے تھے۔ کوئی تو بولے گا اور جب ان میں سے کوئی بولنے والا نہ پیدا ہو تو پھر اس کے بعد جب تمھارا پیغام باہر جائے گا تو باہر کسی کو بولنے کا حق نہیں ہے۔ حکمت تبلیغ پیغمبرؐ یہی ہے کہ وہاں سے کام شروع کیا جائے جہاں والوں نے پوری زندگی کو دیکھا ہو۔

اور بات آئی ہے تو یہ جملہ بھی یاد رکھیں کبھی کام آئے گا۔

معاشرہ نے پیغمبرؐ کے باپ کو دیکھا ہے خود پیغمبرؐ نے نہیں دیکھا ہے۔ تو کتنی آسان بات تھی کہ جیسے ہی کہتے قولوا لا الٰہ الا اللہ، یہ بُت پرستی غلط ہے، پتھروں کے سامنے جھکنا حماقت ہے۔ ویسے ہی کوئی پلٹ کر کہتا تمھارے باباجان تو ہمارے ساتھ بُت پرستی کرتے تھے۔ مگر کتنا پاکیزہ کردار ہے کہ دیکھنے والوں کے سامنے نہ دیکھنے والا بول رہا ہے مگر کسی میں ہمت نہیں ہے کہ کچھ کہہ سکے۔

پیغمبرؐ نے کہا کہ میں نے تنہا اپنے کمال کردار کا کلمہ نہیں پڑھوایا۔ عبداللہ کی توحید کا کلمہ پڑھوایا ہے۔ اپنے بابا کے کردار کا کلمہ بھی پڑھوایا ہے۔ اور اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جیسے ہی پیغمبرؐ نے کہا کہ میں توحید کا علمبردار ہوں بُت پرستی

کے خلاف پیغام لے کر آیا ہوں۔ ایک بچہ کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا گھبرائیے گا نہیں میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ ایسے موقع پر تو بوڑھوں کو کہنا چاہئے تھا کہ پہلے اپنے باپ کو جاکے ٹھیک کرو۔ ساری دنیا کو موحد بعد میں بنانا ابھی تمہارے باپ تو زندہ ہیں۔ پہلے ان کو جاکے مسلمان بناؤ۔ مگر کوئی ایک بولنے والا نہیں پیدا ہوا۔

اب آپ کو اندازہ ہوا کہ اس معاشرہ سے نبی نے آواز کیوں اٹھائی ہے۔ تاکہ کردارِ پیغمبرؐ بھی معلوم ہو جائے اور عبداللہ کا موحد ہونا بھی معلوم ہو جائے۔ اور علیؑ کو شریکِ تبلیغ اس لئے کیا کہ ابو طالب کا ایمان بھی واضح ہو جائے۔ صلوات

تین صدیوں کے بعد محدث پیدا ہوئے اور ہزار سال کے بعد محقق پیدا ہوئے، جو طے کر رہے ہیں کہ ابو طالب مسلمان تھے یا نہیں تھے۔ ارے چھوڑئیے۔ تھے تو اجر و ثواب مل جائے گا۔ نہیں تھے تو خدا کے یہاں پہنچ چکے ہیں۔ وہی جو آپ ہم کو سمجھاتے ہیں وہی ہم آپ کو سمجھا رہے ہیں۔ ہم نے جہاں کسی ایک شخصیت کے بارے میں زبان کھولنے کا ارادہ کیا۔ کہنے لگے اپنی عاقبت کیوں خراب کر رہے ہو۔ وہ بُرے تھے تو خدا کے یہاں پہنچ چکے ہیں۔ سزا مل ہی چکی ہو گی۔ اچھے تھے تو انہیں ثواب ملے گا تم بلا وجہ پریشان ہو رہے ہو۔

تو یہی تو ہم بھی آپ کو سمجھا رہے ہیں کہ اگر ابو طالب مومن تھے تو جنت میں بیٹھے ہوں گے۔ اور اگر مومن نہیں تھے تو اپنی سزا کو برداشت کر رہے ہوں گے آپ کیوں اپنی عاقبت کو خراب کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ ورنہ اگر یہ راستہ کہیں کھل گیا تو پھر سبھی کو تحقیق کرنے کا شوق پیدا ہو جائے گا اور بلا وجہ ایک پریشانی پیدا ہو جائے گی۔ چھوڑئیے۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب تو پرانی تاریخ پڑھ کے صرف اتنا اندازہ کر لیجئے کہ ان کے ایمان کے بارے میں کل بولنے والا کوئی نہیں تھا۔ ان کے اسلام کے بارے میں کل نکتہ اٹھانے والا کوئی نہیں تھا اور جس کے دور کا انسان اس کو کافر نہ کہہ سکے، بعد والے کو کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

یہ پیغمبر اسلامؐ کی پہلی حکمت عملی تھی کہ سرکار دو عالمؐ نے کام اپنی بستی سے شروع

کیا اور اپنے علاقے سے کام شروع کیا تاکہ دنیا والوں کو اندازہ ہوجائے کہ میرے کردار میں صداقت کتنی ہے۔ میرے کردار میں پاکیزگی کتنی ہے اور کہیں سے کسی کو شبہ کرنے کا امکان نہ پیدا ہوسکے۔

اس کے بعد اگر آپ حیاتِ پیغمبرؐ کا جائزہ یونہی لیتے جائیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ آپؐ کا ہر کام مطابق حکمت و مصلحت تھا۔

اس کے بعد مولائے کائناتؑ کا دور آیا۔ مولائے کائناتؑ کی پوری زندگی بھی چاہے وہ خانہ نشینی کی ہو یا مسند نشینی کی ہو، پوری زندگی کے ہر عمل میں وہ دقیق مصلحتیں پائی جاتی ہیں کہ جن کو سمجھنے کے لئے اور بیان کرنے کے لئے ایک بڑا وقت درکار ہے۔ بس ایک چھوٹی سی بات گذارش کروں گا تاکہ سلسلۂ بیان مرتب رہے۔

صفین کا معرکہ چل رہا ہے اور آخری مرحلہ تک معرکہ پہنچ چکا ہے کہ درمیان میں قرآن آگیا۔ پہلے مولاؑ نے لوگوں کو سمجھایا کہ دیکھو یہ قرآن جو لے کے آئے ہیں، یہ خالی قرآن کا نام لے رہے ہیں، یہ قرآن پر عمل کرنے والے نہیں ہیں، یہ مکاری کرنیوالے ہیں۔ اگر ان کو قرآن سے کوئی دلچسپی ہوتی تو پیغمبرؐ نے مجھے قرآن کے ساتھ رکھا تھا۔ عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْآنِ۔ خدا نے مجھ کو بولتا ہوا قرآن بنایا ہے۔ اگر یہ قرآن کے ماننے والے ہوتے تو مجھے مان لیتے۔ مگر جب قوم سمجھنے کے لئے تیار نہ ہوئی تو آپ نے حکم دے دیا کہ جنگ کو روک دیا جائے۔

سرکار جب آپ جانتے ہیں کہ یہ خالی مکاری اور ریاکاری ہے اس میں کوئی واقعیت و صداقت نہیں ہے تو جنگ کو کیوں روک دیا؟

فرمایا، میری حکمت کو تم نہیں جانتے ہو، میری مصلحت کو تم نہیں پہچانتے ہو۔ وقت آئے گا تو اس مصلحت کی صداقت کا بھی اندازہ ہوجائے گا۔ دیکھو یہ روز اول سے یہ نعرہ لگا رہے ہیں، قرآن۔ قرآن۔ میرے مقابلہ میں امت کے پاس ایک ہی نعرہ ہے، قرآن۔ ہمیں قرآن چاہئے۔ قرآن چاہئے۔ اگر میں نے جنگ کو مقدم کردیا تو جنگ تو جیت لوں گا، لیکن یہ لوگ یہی کہیں گے کہ علیؑ نے اقتدار حاصل کیا ہے قرآن

کو ٹھکرانے کے بعد۔ لہٰذا یہ ممکن ہے کہ میں جیتی ہوئی جنگ کو چھوڑ دوں، مگر یہ الزام نہیں لے سکتا کہ میں نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے۔ اس کے بعد جب فیصلہ کرنے والے بیٹھیں گے اور کہیں سے ذکر قرآن نہ آئے گا تب پہچانا کہ میں نے قرآن کو کتنا مانا ہے اور انھوں نے قرآن کو کس طرح چھوڑ دیا ہے۔ صلوات

اس کے بعد آیئے ذرا امام حسنؑ کی زندگی میں امام حسنؑ کی حکمت عملی کا جائزہ لے لیں کہ اُس وقت بھی کچھ لوگ پریشان تھے اور آج بھی پریشان ہیں کہ امام حسنؑ نے بلاوجہ حکومت کیوں چھوڑ دی۔ اور اگر حکومت چھوڑ دی تو کسی اچھے شریف، سمجھدار، متدین، پڑھے لکھے انسان کے حق میں چھوڑ دیا ہوتا۔ ایسے لوگوں کے حوالہ کیوں کر دیا جو انتہائی ذلیل تھے اور جس کی بنا پر بہت سے مومنین بھی ذلیل ہو گئے۔ آج بھی کتنے لوگ ہیں جو روزانہ اسی پر بحث کیا کرتے ہیں کہ امام حسنؑ کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔

یہ تو کربلا میں واضح ہوگا کہ امام حسنؑ کو کیا کرنا چاہیے تھا۔ میں حکمت امام حسنؑ کے بارے میں فقط ایک جملہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس نے بھی پیغمبر اسلامؐ کے دور سے بنی امیہ کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے وہ یہ جانتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے مقابلہ میں ابوسفیان کا طریقہ کار کیا تھا اور مولائے کائناتؑ کے مقابلہ میں ابوسفیان کا اور اس کے بیٹے کا طریقہ کار کیا تھا۔ اس کے بعد اس یزید کا کردار کیا ہوگا جو انتہائی بیحیائی سے اس امر کا اعلان کر رہا تھا کہ نہ کوئی وحی ہے نہ کوئی خبر ہے۔ یہ سب بنی ہاشم کا کھیل تماشہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بنی امیہ پورے اسلام کو بنی ہاشم کا کھیل تماشہ تصور کرتے ہیں اور اسے بنی ہاشم کی ایجاد طبع سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اقتدار کے واسطے ایک ڈھونگ رچایا ہے۔ اپنی حکومت قائم کرنے کے واسطے ایک نظام بنالیا ہے۔ اس کا نہ واقعیت سے کوئی تعلق ہے اور نہ خدا سے۔ لہٰذا تمام تر فکر ہر مرحلہ پر یہ ہے کہ اس نظام کو دبا دیا جائے جس نظام کی بنا پر پیغمبرؐ کا نام بلند ہو گیا ہے اور بنی ہاشم ہمارے مقابلہ میں اونچے ہو گئے ہیں کہ ان کا نام جب بھی آتا ہے تو بلندیوں سے لیا جاتا ہے۔

یہ رسالت ہے جس نے ان کو اتنا بلند کر دیا ہے کہ ان کا نام گلدستۂ اذان سے

لیا جاتا ہے لہٰذا رسالت ہی کا مذاق اڑایا جائے اسی کو کھیل تماشہ قرار دیدیا جائے۔ اُسی کو ڈھونگ بنادیا جائے۔ اُسی کو پامال کر دیا جائے۔ اگر رسالت بے وقار ہو جائے گی تو رسول کا کلمہ بلند نہیں ہو سکے گا۔

یہ ایک فکر تھی جو بنی امیہ میں پائی جاتی تھی اور جس کی برابر کوششیں ہو رہی تھیں۔

امام حسنؑ نے دیکھا کہ نانا نے مقابلہ کیا اس کا انجام سامنے ہے۔ بابا نے میدان جنگ کا رُخ کیا اس کا انجام بھی دیکھ لیا۔ اُس وقت کی ضرورت وہی تھی وہ بات اتمام پا چکی۔ اب ایک تیسری حکمت عملی کی ضرورت ہے۔

عزیزو! میری زندگی کا تعلق دیہات سے ہے لہٰذا میں دیہات کے مزاجوں کو زیادہ جانتا ہوں۔ شائد شہری لوگ بھی اس بات سے اتفاق کریں گے۔ ایک صاحب گاؤں کے رہنے والے تھے، اُن کے پاس کچھ پیسے تھے۔ شہر والوں کے پیسے تو اس لئے محفوظ رہتے ہیں کہ وہ بینکوں کے حوالہ کر دیتے ہیں۔ لیکن بیچارے دیہات میں رہنے والے لوگ وہ تو اپنے پیسے کے خود ہی محافظ ہوتے ہیں۔ ایک صاحب کے پاس اتفاق سے کچھ پیسے زیادہ آگئے۔ اب جو پیسے رکھے ہوئے ہیں تو دن رات پیسے ہی کی فکر ہے۔ پیسے ہی کی حفاظت میں سونا جاگنا سب ایک ہو گیا ہے، کوئی پیسہ نہ لے جائے۔ چور نہ آجائیں۔ ڈاکو نہ آجائیں۔ بیچارے کو ایک دن کوئی ضرورت پیش آگئی اور انھیں جانا پڑ گیا کہیں سفر میں۔ اب پریشان ہیں کہ سارا پیسہ اٹھا کے لے جائیں یا سارے سکے لاد کے لے جائیں، تو یہ اور زیادہ خطرناک مسئلہ ہے۔ گھر میں تو کچھ محفوظ بھی ہے، باہر تو جس کا جی چاہے گا لوٹ لے گا۔ اب بیچارے پریشان ہیں۔ نہ جائیں یہ بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ چھوڑ کے چلے جائیں کسی کے رحم و کرم پر یہ اور مصیبت ہے۔ آخر میں کسی دوست نے دیکھا کہ آجکل کچھ زیادہ ہی پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ کہا بھائی خیریت تو ہے۔ کہا ایک ضرورت پیش آگئی ہے اور مجھے سفر میں جانا ہے اور آپ کو تو معلوم ہے کہ اللہ کا دیا ہوا میرے پاس کچھ ہے۔ ابتک میں یہاں تھا تو میں خود حفاظت

کر رہا تھا۔ اب میں چلا جاؤں گا تو اگر لُٹ گیا تو کیا ہوگا۔؟

کہا کیوں لُٹ جائے گا؟ گاؤں میں تو سب شریف پائے جاتے ہیں، سب اللہ والے مقدس پائے جاتے ہیں۔

کہا اچھا تو فلاں کو آپ نہیں جانتے ہیں۔ وہ ایک آدمی ہے جس کا پیشہ ہی ہے چوری کرنا۔ وہ راتوں کو گھروں میں نقب لگاتا ہے اور سامان لوٹ لے جاتا ہے۔

کہا جب آپ پہچانتے ہیں تو کیا پریشانی ہے؟

کہا کیا چور کے جان لینے سے مال محفوظ ہو جاتا ہے۔؟

کہا جب چور کو پہچان لیا جاتا ہے تو دو ہی راستے ہوتے ہیں۔ یا اُسے بھی اپنے ساتھ لے لیا جائے یا بہترین بات یہ ہے کہ پیسہ اُسی کے پاس رکھوا دیا جائے۔ جس دن چور کو یہ احساس پیدا ہو جائے گا کہ آپ اسے امانت دار سمجھتے ہیں؟ وہی محافظ بن جائے گا۔ اسلام میں ہمیشہ یہی دونوں حکمت عملی استعمال ہوئی ہیں۔ صلوات

جس سے خطرہ ہو اُسی کے پاس رکھوا دیجئے خود ہی محفوظ ہو جائے گا۔

یہی وہ بات ہے جو مولائے کائنات نے دوسرے مقام پر ارشاد فرمائی تھی جب دو عورتوں کے درمیان بچہ کا فیصلہ ہو رہا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ جو چاہتا ہے کہ بچہ محفوظ رہے وہ یہی چاہتا ہے کہ کسی کے پاس رہے مگر محفوظ رہے۔

امام حسنؑ پہچانتے تھے کہ خطرہ کس سے ہے، بس اُسی کے ہاتھ میں رکھ دیا جائے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے گا۔ نہ جنگ کی نوبت آئے گی نہ جھگڑے کا معاملہ ہوگا، وہ اپنا مال سمجھ کے بچاتا رہے گا اور میں اپنا سمجھ کے محفوظ دیکھ کے خوش ہوتا رہوں گا۔ صلوات

بس عزیزانِ محترم، میں نے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے یہ دو تین مثالیں گذارش کر دیں، اب ایک آخری مرحلہ امام حسینؑ کی حکمت عملی کے بارے میں گذارش کرنا ہے کہ امام حسینؑ کی حکمت مدینہ چھوڑنے میں کیا تھی؟ امام حسینؑ کی حکمت مکہ ترک کرنے میں کیا تھی؟ امام حسینؑ کی حکمت ارض کربلا کو اختیار کرنے میں کیا تھی؟ مگر چونکہ کربلا شناسی

کے موضوع کے تحت بہت سی باتیں گذارش کر چکا ہوں لہٰذا اس کے دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے کیسٹ الحمدللہ موجود ہیں۔ آپ خود سماعت فرما سکتے ہیں۔

بس ایک آخری بات کہ امام حسینؑ جب ارضِ کربلا پر آگئے تو امام حسین علیہ السلام کی حکمت عملی پہچانئے۔

یہ کسی اور کو معلوم ہو یا نہ معلوم ہو۔ امام حسینؑ مدینے سے جب نکلے تھے، اُس دن سے برابر یہ اعلان کر رہے تھے کہ میں شہید ہونے کے لئے جا رہا ہوں۔ جناب اُمّ سلمہ سے کہا۔ ابن عباس نے پوچھا تو ابن عباس سے کہا۔ محمد حنفیہ کو وصیت نامہ لکھ کے دیا اور اس سے پہلے دورِ قدیم سے پیغمبر اسلامؐ بتا رہے تھے کہ میرا لال سرزمین کربلا پر شہید کیا جائے گا۔ مولائے کائناتؑ برابر واضح کر چکے تھے۔ امام حسینؑ کے اعلانات کو سب سُن رہے تھے اور امام حسینؑ اس سرزمینِ کربلا پر ۲ محرم کو وارد ہوئے جہاں صرف آٹھ دن رہنا ہے اور اس کے بعد پھر یہیں شہید ہو جانا ہے۔ یہیں دفن ہو جانا ہے۔ اور آٹھ دن کے اندر زندگی کا فیصلہ ہو جانا ہے جتنے میرے ساتھی ہیں سب یہیں دفن ہو جائیں گے اور جو بچ جائیں گے وہ یہاں نہیں رہیں گے، وہ آگے چلے جائیں گے تو جس انسان کو یہ معلوم ہے کہ فقط آٹھ دن یہاں رہنا ہے اور ہمارے ساتھ والے کچھ شہید ہو جائیں گے، دفن ہو جائیں گے اور جو زندہ رہ جائیں گے وہ چلے جائیں گے۔ تو وہ اتنی بڑی زمین کو ساٹھ ہزار درہم دے کر کیوں خرید رہا ہے۔ کون سا محل یہاں بننے والا ہے۔ کون سا قصر بننے والا ہے۔ ایک زمین ہے۔ عام زمین ہے۔ کوئی بھی انسان انتقال کر جائے گا وہ اسی زمین میں دفن ہو جائے گا۔ اس کے دفن ہونے میں کوئی شرعی اشکال بھی نہیں ہے۔ لیکن امام حسینؑ نے آنے کے بعد پہلے اس پورے علاقہ کو خریدا۔ اگرچہ خریدنے کے بعد انھیں لوگوں کے انتظام میں دے دیا اور انھیں لوگوں کے حوالہ کر دیا جن سے لیا تھا۔

لیکن اس ایک حکمتِ حسینؑ پر غور کیجیے کہ یہاں کوئی مکان نہیں بنانا ہے، یہاں کوئی منزل نہیں بنانا ہے، مگر امام حسینؑ نے اس علاقہ کو خریدا۔ حکمتِ فرزندِ رسولؐ پہچانیے مسئلہ نہ زندہ رہنے کا ہے، نہ مکان بنانے کا ہے، نہ آباد ہونے کا ہے، نہ چار قبروں کی جگہ کا ہے۔ اتنا بڑا علاقہ امام حسینؑ نے خریدا اور پہلے علاقہ کو اپنا بنایا اس کے بعد قیام فرمایا۔ اس لئے کہ امام حسینؑ جانتے ہیں کہ رہتی دنیا تک جب جنگوں کے بارے میں فیصلے ہوں گے تو دنیا کی ہر لڑائی میں ہر فریق کی ایک ہی فکر ہوگی کہ اپنے کو مظلوم ثابت کرے اور دوسرے کو ظالم بتائے اور ظالم و مظلوم کے فیصلہ کا ایک ہی طریقہ دنیا والوں کا ہوگا کہ دیکھو حملہ آور کون ہے۔ جو حملہ آور ہوگا وہی ظالم ہوگا اور جس پر حملہ کیا جائے گا وہی مظلوم ہوگا اور جارح طے کرنے کے لئے یہ طے کیا جائے گا کہ جنگ کس کی زمین پر ہوئی ہے، کس کے علاقہ میں ہوئی ہے۔ جس کے علاقہ میں جنگ ہوگی وہی مظلوم ہوگا کہ یہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا اور حملہ کرنے والے نے حملہ کر دیا۔ امام حسینؑ نے چاہا کہ قیامت تک کے لئے ایک فیصلہ کر دیا جائے کہ اب جب تک یزیدیت حسینؑ کو جارح قرار دیتی رہے گی، زمینِ کربلا آواز دیتی رہے گی کہ یہ حسینؑ کا خریدا ہوا علاقہ ہے جو یہاں آئے ہیں وہ جارح تھے حسینؑ جارح نہیں تھے۔ صلوات

امام حسینؑ نے تو اپنی زمین پر قیام کیا تھا۔ اب اس کے بعد جو کوفہ کی فوجیں آئی تھیں، جو شام کے لشکر آئے تھے، یہ سب زمینِ حسینؑ پر حملہ آور ہو رہے تھے یہی وہ ہیں جو ظالم تھے۔ تو اگر سیاسی نقطۂ نظر سے بھی واقعۂ کربلا کا فیصلہ کیا جائے تو مظلومیت حسینؑ کا حصہ ہے۔ اور ظالم وہ ہیں جنھوں نے فرزندِ رسول الثقلین پر حملہ کیا تھا اور اس کے بعد بھی امام حسینؑ نے آخری سانس تک چاہا کہ جو قدم اُٹھے وہ قدم حکیمانہ ہو تا کہ میرے عمل کے بارے میں دنیا کا کوئی انسان کوئی نکتہ، اشکال نہ اٹھا سکے اور دنیا میں جو بھی پاکیزہ زندگی گذارنا چاہے وہ میری ہی سیرت کو نمونۂ عمل بنائے۔ اسی لئے آپ دیکھتے ہیں کہ جب فرزندِ رسول الثقلین مدینہ سے باہر آئے تو ایک طرف تو یہ دیکھا گیا کہ امام حسینؑ اس کمسن بچے کو بھی لے کے چلے ہیں جو پانچ مہینے گذرنے کے بعد چھ مہینے کا ہوگا اور چھوٹی بچیوں

کو بھی لے کر چلے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی دیکھا کہ خاندان کے بزرگ، بڑے افراد کو امام حسینؑ نے چھوڑ دیا ہے کہ یہ حکمتِ حسینؑ ابن علیؑ ہے کہ کچھ یہاں رہیں اور کچھ جائیں۔ جن کے لئے مقدر ہے کہ جائیں انھیں لے کے جائیں اور جن کے لئے مصلحت ہے کہ رہیں انھیں چھوڑ کے جائیں۔

وہ افراد جن کو امام چھوڑ کے چلے ہیں، انھیں افراد میں سے ایک جناب عبداللہ ابن جعفر بھی تھے۔ نہ جناب عبداللہ ابن جعفر کے اخلاص میں کوئی کمی تھی اور نہ ایمان میں کوئی کمی تھی۔ نہ شجاعت میں کوئی کمی تھی اور نہ تقویٰ میں کوئی کمی تھی۔ مگر مصلحتِ حسینؑ یہی تھی کہ یہ رہیں اور اس مصلحت کا ایک رخ تو پہلے ہی سامنے آگیا کہ جناب عبداللہ ابن جعفر نے حاکم مدینہ پر حجت تمام کرنے کا انتظام کیا اور جب فرزند رسولؐ چلنے لگے تو حاکم مدینہ کو جاکر سمجھایا کہ تجھے شرم نہیں آتی ہے۔ یہ نبی زادے کا وطن ہے، یہ پیغمبرؐ کا مدینہ ہے اور پیغمبرؐ کے وطن میں نواسہ کی جگہ نہیں ہے، یہ کس قدر شرم ناک بات ہے کس قدر افسوس ناک بات ہے۔ کچھ تو سوچنا چاہئے کہ پیغمبرؐ کے لال کو، پیغمبرؐ کے وطن میں امان نہ ملے۔ کیا فرق ہوگا تم جیسے اہل مدینہ میں اور کفار مکہ میں کہ انھوں نے نبیؐ کو وہاں نہ رہنے دیا اور تم نے نبیؐ کے نواسے کو یہاں نہ رہنے دیا۔

ایسی تقریر کی جناب عبداللہ ابن جعفر نے کہ حاکم مدینہ اپنے اقدام کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ کہا اچھا اگر حسینؑ رہنا چاہیں تو ہم انھیں امان دے سکتے ہیں۔

جناب عبداللہ ابن جعفر ان مصلحتوں کو نہیں جانتے ہیں جو امام حسینؑ جانتے ہیں۔ خوش ہو گئے۔ آئے فرزندِ رسولؐ کی خدمت میں۔ کہا میں نے حاکم سے بات کر لی ہے۔ حاکم اس بات پر تیار ہو گیا ہے کہ اگر آپ مدینۂ رسولؐ میں رہنا چاہیں تو رہ سکتے ہیں، آپ کو امان مل جائے گی۔

فرمایا، آپ اُن باتوں کو نہیں سمجھتے ہیں جن باتوں کو میں سمجھتا ہوں اور جن کو نانا نے مجھ سے بتایا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ میں وطن کو چھوڑ کے چلا جاؤں۔ یہ امان نامہ، یہ امان کا پیغام قابلِ اعتبار نہیں ہے لہٰذا میں جا رہا ہوں۔

کیا نبیؐ کے نواسے! یہ طے ہوگیا ہے کہ آپ جائیں گے؟

فرمایا ہاں، یہ طے ہوچکا ہے کہ میں وطن کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔

عرض کی، اچھا اگر آپ جا رہے ہیں تو مجھے بھی لے چلئے۔

فرمایا، مصلحت پروردگار یہ ہے کہ آپ یہیں رہیں۔

فرمایا اے حسینؑ! آپ مصیبتوں کی خبر سنا کے اکیلے جانا چاہتے ہیں۔ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتے ہیں تو اگر آپ مبتلائے مصیبت ہوگئے تو میں کیا کروں گا۔ مجھے کب معلوم ہوگا میں آپ کے کیسے کام آسکوں گا!۔ کم سے کم یہی کر لیں کہ یہ میرے دو بچّے ہیں، انھیں کو اپنے ساتھ لیتے جائیں تاکہ خدا نہ کردہ اگر کوئی مصیبت آجائے اور میں آپ کے کام نہ آسکوں تو کم سے کم یہ میرے بچّے ہی آپ پر قربان ہوجائیں۔

اَجَرُکُمْ عَلَی اللّٰہِ۔ خدا آپ کو کسی غم میں نہ رُلائے، سوائے غمِ آلِ محمدؐ کے۔

بس اربابِ عزا، میں بیان کو آخری منزل تک لے آیا۔

ایک طرف جناب عبداللہ ابن جعفر نے یہ اہتمام کیا اور دوسری طرف ثانیٔ زہراؑ آئیں اور عبداللہ کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ چہرہ اُداس ہے خاموش بیٹھی ہیں۔

جناب عبداللہ نے کہا بنتِ فاطمہؑ! آج آپ کو اُداس دیکھ رہا ہوں، خاموش دیکھ رہا ہوں، کچھ بولتی بھی نہیں ہیں، کچھ فرماتی بھی نہیں ہیں، خیریت تو ہے؟

کہا عبداللہ، آپ کو تو معلوم ہے کہ میرا بھائی وطن چھوڑ کر جا رہا ہے۔

کہا ہاں، مجھے معلوم ہے۔ مولا نے فرمایا ہے کہ حکم ہے پیغمبر کا میں جا رہا ہوں۔

کہا اے عبداللہ! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ زینبؑ نے کبھی اپنے بھائی کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔

کہا دخترِ زہراؑ! پھر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟

کہا میں بھائی کے پاس گئی۔ بھیّا نے کہا کہ میں تم کو ضرور لے جاؤں گا۔ مگر تم پر عبداللہ کا بھی حق ہے۔ جاؤ ان سے اجازت لے کر آؤ۔ والی! آپ فرمائیے کہ کیا

فرماتے ہیں۔؟

کہا مولا اگر لے جانے کے لئے تیار ہیں تو میں کون روکنے والا؟

ثانی زہرا اٹھیں اور مطمئن نفس کے ساتھ بھائی کی خدمت میں آئیں۔ کہا بھیا! میں عبداللہ سے رخصت ہوکر آگئی۔ اب میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔

قافلہ مدینہ سے چلا، مکہ آیا۔ ۸ر ذی الحجہ کو مکہ سے قافلہ چلا۔ ۲ر محرم کو سرزمین کربلا پر وارد ہوگیا۔ عاشور کی رات آئی ـــ اور آخری گفتگو تمام ہوگئی تو بہن نے بھائی سے پوچھا۔

بھیا! آخری گفتگو کا نتیجہ کیا ہوا؟

کہا، بہن یہ آخری رات ہے۔ کل بہن بھائی میں جدائی ہوجائے گی ـــ کل آلِ محمدؐ کی قربانی کا دن ہے۔

ساری خواتین نے سنا کہ کل قربانیوں کا دن ہے۔

اب جو عاشور کی رات گذر رہی ہے تو مورخین کی رسائی تو خیام حسینی تک نہیں ہے مگر جذبات کی رسائی ہر جگہ ہے۔ لہٰذا مورخین نے، محدثین نے، مقتل لکھنے والوں نے ان جذبات کی تصویر کشی کی ہے کہ یہ رات خیام حسینی میں کیسے گذری۔

بیبیوں کا جذبۂ قربانی انھیں آمادہ کر رہا ہے کہ ہر خاتون اپنے بچے کو سمجھا رہی ہے، بیٹا! دیکھو کل قربانی کا دن ہے۔ بنی ہاشم میں کوئی نہ جانے پائے۔ پہلے تم قربان ہوجانا پہلے تم مولا کے قدموں پر قربان ہوجانا تاکہ میں سیدانیوں کے سامنے جانے کے قابل رہ جاؤں۔ ہر طرف ایک ہی چرچا ہے۔

اور ثانی زہراؑ اپنے سامنے گود کے پالوں کو بٹھلائے ہوئے فرما رہی ہیں۔ بیٹا! کل قربانی کا دن ہے۔ میرے لال! ماموں پر قربان ہونا ہے۔ اور بیٹا دیکھو دادِ شجاعت دے کے قربان ہونا ہے۔ اللہ نے تمھیں دُہرا درجہ دیا ہے ـــ دادا جعفر طیار۔ نانا حیدر کرار۔ میدان میں یوں جہاد کرنا کہ کوئی جعفر طیار کی شان کو پہچانے اور کوئی حیدر کرار کے انداز کو پہچانے؛

تم کیوں کہو کہ لال خدا کے ولی کے ہیں
فوجیں پکار اُٹھیں کہ نواسے علیؑ کے ہیں

اَجْرُکُمْ عَلَی اللّٰہِ

رات گذری۔ یہاں تک کہ قربانیوں کا وقت آگیا۔ جب چاہنے والے کام آچکے اور بنی ہاشم میں اولاد عقیل بھی قربان ہو چکی، تو ایک مرتبہ پھر اُداس چہرہ کے ساتھ بہن بھائی کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

زینبؑ! کچھ کہنا چاہتی ہو؟

کہا ہاں بھیا کچھ تو کہنا ہے۔

کہا بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو؟

کہا دیکھ تو رہے ہیں آپ ایک کے بعد ایک جا کے قربان ہو رہا ہے۔

اے بھیا ایک بات مجھے آپ سے کہنا ہے اور اس اعتماد سے کہنا ہے کہ زینبؑ کی بات آپ ٹال نہیں سکتے ہیں۔

کہا زینبؑ بتاؤ کہنا کیا چاہتی ہو؟

کہا آقا۔ مولا۔ میرے ماں جائے! میری گود کے پالوں کو اجازت دیدیجئے؛ فرزند رسولؐ نے سر جھکا لیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ زینبؑ تم نے عجیب سوال کر لیا۔ مگر کیا کروں آج قربانی کا دن ہے۔ آج سب کو راہِ خدا میں قربان ہونا ہے۔ جاؤ میں نے اجازت دے دی۔

ماں نے بیٹوں کو سجایا، سجا کے میدان کی طرف بھیجا۔ دونوں لال چلے میمنہ کی طرف عون چلے، میسرہ کی طرف محمدؐ چلے۔ اور دونوں زینبؑ کے لال مصروف جہاد ہیں۔ بڑھتے بڑھتے جب ایک بھائی نہر کی طرف چلا تو دوسرے نے پکار کے کہا بھیا قدم آگے نہ بڑھانا۔ بھیا دریا کا رُخ نہ کرنا۔ علی اصغرؑ پیاسے ہیں۔ سکینہؑ پیاسی ہے۔ داد شجاعت دیتے رہے یہاں تک کہ زخموں سے چور ہو کے گھوڑے سے گرے۔ آواز دی مولا! غلاموں کی خبر لیجئے مولا!

حسینؑ مقتل کی طرف چلے۔ عباسؑ کو ساتھ لے کر چلے۔ بچوں کے سرھانے آئے۔ ایک لاشہ کو عباسؑ نے اٹھایا۔ ایک لاشہ کو حسینؑ نے اٹھایا۔ لا کے خیمہ میں رکھا۔ فضہ دوڑ کے آئیں۔ شہزادی چلئے آپ کے لال آئے ہیں۔

بس رونے والو مجلس تمام ہو گئی۔ کہا میں کیا کروں۔ میں نے کوئی واپس آنے کے لئے بھیجا تھا؟ یہ کیوں پلٹ کے آئے؟

کہا شہزادی! چل کے دیکھئے کہ کیسے آئے ہیں؟

اب جو مڑ کے دیکھا تو صحن خیمہ میں دو لاشے۔ زینبؑ نے سر سجدہ میں رکھ دیا۔ پروردگار! تیرا شکر ہے کہ میرے بچوں نے مجھے بھیّا کے سامنے سرخرو کر دیا شاباش میرے بچو! تم نے ماں کے دودھ کی لاج رکھ لی اور بہن کو بھائی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونے دیا۔ جاؤ خدا حافظ۔ اب زینبؑ ہے اور مصائب۔ ماں ہے اور کوفہ و شام کی منزلیں۔ افسوس میرے بھیّا کے محافظ مارے گئے اور اب پنجتن کا خاتمہ قریب آ گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ساتویں مجلس

انقلاب امام حسین علیہ السّلام

"حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اللہ اس سے محبت کرے جو میرے حسینؑ سے محبت کرے۔"

سرکار دو عالمؐ کے ارشاد گرامی کی روشنی میں جو سلسلۂ کلام "عرفان امام حسینؑ" سے متعلق آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا، اس کے ساتویں مرحلے پر کچھ باتیں انقلاب امام حسینؑ سے متعلق گذارش کرنا ہیں۔

انقلاب ایک ایسا لفظ ہے جس سے دنیا کا ہر انسان آشنا ہے۔ اور شائد ہی کوئی کان ایسا ہو جس نے دنیا میں انقلاب کی آواز نہ سُنی ہو۔

فرق صرف یہ ہے کہ دنیا کے انقلاب کا انداز اور ہوتا ہے اور مذہب کے انقلاب کا انداز اور ہوتا ہے۔

میں آج مختصر انداز سے سہی مگر امام حسینؑ کے انقلاب کے خصوصیات اور اثرات کے بارے میں کچھ باتیں قدرے تفصیل سے گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ کوشش یہ کروں گا کہ تمہید میں زیادہ وقت صرف نہ ہونے پائے اور جو خصوصیات سرکار سیدالشہداءؑ میری نگاہ کے سامنے ہیں ان میں سے کچھ دس پانچ تو بیان ہو جائیں۔

دنیا میں جو انقلابات آتے ہیں عام طور سے ان کے دو ذرائع ہوتے ہیں اور دو مقاصد ہوتے ہیں۔ یا تو انقلاب لانے والے لوگ اپنے اندر کوئی صلاحیت پاتے

ہیں اور ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت کو مانا نہیں گیا ہے لہذا کسی کے تخت اقتدار کو اُلٹ کر اپنی شخصیت کو منوایا جائے۔ یا انقلاب کرنے والے لوگ وہ ہوتے ہیں جو جانتے ہیں کہ انقلاب کے بغیر ہماری کوئی شخصیت نہیں ہے۔ اگر ہمارے ہاتھوں انقلاب آگیا تو ہماری کوئی شخصیت ہو جائے گی۔

ان دونوں باتوں کا فرق آپ پر واضح ہے۔ انقلاب لانے والے یا اپنی شخصیت کا اظہار چاہتے ہیں یا اپنی کمتری کے احساس کی بنا پر انقلاب کے ذریعہ اپنی شخصیت بنانا چاہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہر آدمی کی نگاہ انقلاب کے نتیجے میں یا مال و منال، راحت و آرام اور کرسی اقتدار پر ہوتی ہے یا وہ اپنی شخصیت بنا کر اس کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے۔

پھر ان دو مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے دو راستے اختیار کئے جاتے ہیں۔

ایک راستہ کا نام ہے ظلم اور دوسرے راستہ کا نام ہے فساد۔

ظاہر ہے کہ فساد بھی ایک ظلم ہی کی قسم کا نام ہے اور ظلم بھی فساد ہی کی ایک قسم ہے۔ لیکن دونوں میں تھوڑا سا فرق ضرور پایا جاتا ہے، جس سے آپ ظلم کے معنی بھی محسوس کر لیں گے اور فساد کے معنی بھی سمجھ لیں گے۔

یہ ساری باتیں جو میں گذارش کر رہا ہوں ان سب کے پیچھے قرآن مجید کی بیان کی ہوئی تاریخ بھی ہے۔ مگر ان تفصیلات میں جانے کے بعد شائد اصل مدعا کا وقت نہ رہ جائے۔ اس لئے جو باتیں میں گذارش کر رہا ہوں آپ قرآن سے ان کا مطالعہ کر لیں گے تو ساری باتیں آپ کو نظر آجائیں گی۔

مثلاً قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ جب جناب صالحؑ نے قوم ثمود کے سامنے پیغام الٰہی پیش کیا تو لوگوں نے نبی خدا کی مخالفت کرنے کے لئے اور نبی خدا کی آواز کو دبانے کے لئے نبی کے کردار میں وہی شبہ پیدا کرنا چاہا جو دنیا کے ہر انقلاب میں ہوتا ہے۔

کہا بھائیو خبردار! ان کے کہنے میں نہ آجانا۔ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں ان کو کہنے دو۔ ان کے کمالات، ان کے کرامات، ان کے معجزات ان کے ساتھ ہیں۔ ورنہ یہ کوئی بات

سمجھ میں آنے والی ہے کہ ہم ہی میں کا ایک انسان، ہمارا ہی جیسا ایک بشر — اور وہ نمائندۂ پروردگار بن جائے اور ہم سب اس کے غلام بن کر اس کی اطاعت کرنے لگیں، یہ نہیں ہو سکتا ہے۔

کیا اس کا امکان ہے کہ پروردگار ہم سب کو چھوڑ کر اپنا پیغام ایک انسان پر نازل کر دے۔ آخر اس انسان میں کون سی بات پائی جاتی ہے، جیسے ہم بشر ویسے یہ بشر۔ جیسے ہم انسان ویسے ہی یہ بھی انسان۔ اعضاء و جوارح ایک جیسے۔ حرکات و سکنات ایک جیسے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس پر ذکر نازل کر دیا جائے ہم سب کو چھوڑ کر۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ خدا پر الزام رکھنے والا، جھوٹ بولنے والا انسان ہے، اور لالچی ہے۔ چاہتا ہے کہ اس طریقہ سے قوم کے سروں پر حکومت کرے اور لوگ اسے نبیٔ خدا مان لیں۔

گویا یہ پہلا الزام تھا جو قوم نے نبیٔ خدا پر لگایا کہ ان میں ہوس اقتدار ہے۔ یہ کرسی پر بیٹھنا چاہتے ہیں۔ یہ بیت المال پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ قومی سرمایہ کو اپنی مٹھی میں لینا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد پروردگار عالم نے اپنے نیک بندوں کو جو صاحبانِ ایمان کہے جاتے تھے، جو کلمہ پڑھ کے مسلمان ہو گئے تھے انھیں یہ سمجھایا کہ دیکھو خبردار! تمہارا کردار ویسا نہ ہو جائے جیسا کفار و مشرکین کا کردار تھا۔ کفر کی دنیا الگ ہے، اسلام و ایمان کی دنیا الگ ہے۔ دیکھو پیغمبر کا اتباع کرو۔ اگر کلمہ پڑھا ہے تو اسی خطِ مستقیم پر چلتے رہو۔ اسی صراطِ مستقیم کا اتباع کرو۔ خبردار آپس میں جھگڑا نہ کرنا۔ اگر آپس میں جھگڑا کرو گے تو کمزور پڑ جاؤ گے۔ اتحاد میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ افتراق میں وہ طاقت نہیں ہوتی ہے۔

یہ سب سمجھانے کے بعد پھر پروردگار نے ایک اور نصیحت کی۔

دیکھو ان کفار و مشرکین جیسے نہ ہو جانا جو اپنے گھروں سے نکلے اپنے غرور کی بنیاد پر اپنی شخصیتوں کا رعب جمانے کے لئے۔ تم مسلمان ہو تم میں یہ خرابی، یہ عیب نہیں ہونا

چاہئے۔ یعنی اگر تمہاری شخصیت ہے بھی تو خبردار اس کے مظاہرہ کی فکر نہ کرنا۔

یہ دو باتیں آپ نے محسوس کیں۔

پہلا الزام تھا کہ یہ شخصیت بنانا چاہتے ہیں۔

دوسری بات خدا نے سمجھائی کہ اگر شخصیت ہے۔ مسلمان ہو گئے ہو۔ مومن ہو گئے ہو۔ اتحاد اسلامی پیدا ہو گیا ہے تو اس کے اظہار کی کوشش نہ کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ غرورِ اتحاد پیدا ہو جائے، غرورِ اسلام پیدا ہو جائے۔ تو اسلام نہ حرص کو برداشت کرتا ہے اور نہ غرور کو برداشت کرتا ہے۔

اب آئیے دو باتیں اور جو میں نے گذارش کی ہیں کہ اہلِ دنیا جب اقتدار چاہتے ہیں یا مظاہرۂ اقتدار چاہتے ہیں تو اس کے دو راستے ہوتے ہیں، یا ظلم یا فساد۔

آج دنیا میں آپ دیکھ لیجئے کہ جب انقلابات شروع ہوتے ہیں تو یہی دو راستے اپنائے جاتے ہیں۔ جن میں ذرا کچھ طاقت زیادہ ہوتی ہے وہ ظلم کو سہارا بناتے ہیں۔ جو ذرا کمزور ہوتے ہیں ان میں اتنا دم تو نہیں ہوتا ہے کہ آدمیوں کو مار سکیں، اتنی طاقت تو نہیں ہوتی ہے کہ انسانوں کو فنا کر سکیں۔ ان کے لئے انقلاب کا ایک ہی راستہ ہوتا ہے کہ یہاں بس میں آگ لگا دی، وہاں ٹرین میں آگ لگا دی، یہاں فلاں عمارت جلا دی، وہاں فلاں بلڈنگ کو آگ لگا دی۔ تاکہ اس کے ذریعہ سے تختِ اقتدار تک پہنچ جائیں۔ آپ ان بیچاروں سے پوچھئے کہ کرسی پر تم بیٹھو گے یا وہ بیٹھے ہیں۔ بسوں نے کیا قصور کیا ہے۔ ریل نے کیا خطا کی ہے۔ جہاز نے کیا برائی کی ہے۔ سڑکوں نے کیا عیب کیا ہے۔ پلوں میں کیا خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ نہریں جاری ہو کے کیا فساد برپا کر رہی ہیں۔ انھیں برباد کرنے سے کیا فائدہ ہے؟ — ان سے تو رفاہ عام کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ ان سے تو مفاد ملک کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ مگر جو تخت تک جانا چاہتا ہے اسے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی ہے۔

فساد کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ ظالم نہ دیکھا جائے، مظلوم نہ دیکھا جائے۔ انسان نہ دیکھے جائیں اور ملک کی معیشت کو برباد کر دیا جائے۔

جب جناب سلیمان کا خط بلقیس کے پاس پہونچا تو اس نے درباروالوں کو بلایا اور کہا کہ میرے پاس ایک خط آیا ہے۔ ایک آدمی ہے جو اپنے کو بڑا آدمی کہتا ہے اور ہم سے اطاعت کا مطالبہ کر رہا ہے۔ کہتا ہے شرافت سے سلمان ہو کے آجاؤ۔ بتاؤ تم لوگوں کی رائے کیا ہے، ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

لوگوں نے کہا ہوشیار رہیے گا۔

بادشاہت کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ جس قریہ میں داخل ہو جائے اسی میں فساد برپا کر دے۔ اسی کو تباہ و برباد کر دے۔ ذرا ان مشیروں کی عقل دیکھیے۔ یہ بیٹھے ہیں بلقیس کے دربار میں۔ وہ مشورہ کر رہی ہے یہ مشورہ دے رہے ہیں۔ بلقیس کیا الکشن لڑ کے سربراہ ہوئی ہے؟ اُسے کیا لوگوں نے مل کے منتخب کر کے حکومت کا حاکم بنا دیا ہے؟

ہُدہُد نے اگر یہی تو کہا تھا جناب سلیمان سے، کہ میں نے دیکھا ہے کہ ایک ملکہ ہے۔ ایک بادشاہ ہے۔ خاتون۔ عورت۔ جو لوگوں کو اپنی ملکیت بنائے ہوئے ہے اور بہت بڑا تخت اس کے پاس ہے۔ یہ تو خود ہی ملکہ ہے۔ یہ تو خود ہی بادشاہ ہے۔ یہ خود ہی ملوکیت کی ماری ہوئی ہے۔ اور مشیروں کی عقل دیکھیے وہ اسے سمجھا رہے ہیں کہ ملوک جب کہیں داخل ہوتے ہیں تو فساد برپا کر دیتے ہیں۔ کوئی اتنا بھی نہیں سوچتا کہ پلٹ کے اگر اس نے اتنا پوچھ لیا کہ احمق آدمی تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔ یہ ملوکیت کا مزاج کہاں ہوتا ہے ——— مگر وہ سمجھانا یہ چاہتے ہیں کہ آپ چونکہ یہیں کی ہیں، لہٰذا آپ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ باہر والا اگر آجائے گا تو اپنے مزاج کو یہیں استعمال کرے گا۔ یعنی اگر وہ آپ کے تخت پر قبضہ کرنا چاہے گا تو اس کا طریقہ یہی ہوگا کہ فساد برپا کرے گا۔

یعنی یہ ہیں وسائل انقلاب یا فساد یا ظلم۔ ساری دنیا کی تاریخ ان چار لفظوں میں سمٹی ہوئی ہے۔

اب اگر اس نکتہ کو آپ نے پہچان لیا ہے تو اب پڑھیے امام حسینؑ کا وصیت نامہ۔ جب مدینے سے نکلنے لگے تو محمد حنفیہ کے نام ایک وصیت نامہ لکھا تا کہ لوگ میرے انقلاب کو پہچان لیں۔ نہ میں لالچ میں نکلا ہوں، نہ غرور کی بنیاد پر نکلا ہوں، نہ فساد کرنا چاہتا ہوں

اور نہ ظلم کرنا چاہتا ہوں۔ میں امت پیغمبرؐ میں اصلاح چاہتا ہوں۔ اب پہچانا وہ چاروں راستے جو دنیا کے انقلاب کے تھے، انہیں حسینؑ نے بند کر دیا۔ اور فرمایا کہ مذہبی انقلاب اصلاح کے لئے آتا ہے، تخت و تاج کے لئے نہیں آتا ہے۔ صلوات

تو جب دنیا کا انقلاب الگ ہے اور مذہب کا انقلاب الگ ہے۔ تو فرزند رسولؐ! اگر آپ ان میں سے کچھ نہ کریں گے تو کیسے آپ اقتدار قائم کریں گے، کیسے انقلاب کرینگے؟

کہا اس کا طریقہ بھی میں جانتا ہوں۔ میں اپنے جد کی امت کی اصلاح چاہتا ہوں۔ یعنی اگر کوئی پوچھے کہ جب کوئی نہیں اٹھ رہا ہے تو آپ ہی کو کیا ضرورت ہے۔ تو امام حسینؑ نے کہا ان سب میں اور مجھ میں فرق ہے۔ ان میں کوئی صاحب مذہب کا وارث نہیں ہے۔ اسلام نہ کسی کے باپ کا ہے نہ کسی کے دادا کا ہے۔ اسلام میرے نانا کا ہے۔ لہٰذا جو اُمّت کی ذمہ داری نبیؐ کے نواسے پر ہے وہ کلمہ گو افراد پر نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ اٹھیں یا نہ اٹھیں میں اپنی وراثت کا تحفظ بہر حال کروں گا۔ صلوات

تو عزیزانِ محترم! امام حسینؑ نے فرمایا کہ میرا مقصد تخت و تاج نہیں ہے۔ نہ بیت المال پر قبضہ کرنا ہے۔ نہ اپنے اقتدار کی نمائش کرنا ہے۔ نہ اپنا اقتدار قائم کرنا ہے۔ میں اپنے جد کے امت کی اصلاح چاہتا ہوں۔ تو مولا ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ جو تخت تک جانا چاہتے ہیں وہ ظلم کو ذریعہ بناتے ہیں۔ فساد کو ذریعہ بناتے ہیں۔ لیکن آپ اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو آپ کا ذریعہ کیا ہو گا۔؟

فرمایا۔ میں نیکیوں کا حکم دینا چاہتا ہوں اور برائیوں سے روکنا چاہتا ہوں۔ جب نیکیوں پر عمل ہو جائے گا لوگ برائیوں سے رُک جائیں گے تو خود ہی اصلاح ہو جائے گی۔ نہ خنجر درکار ہے نہ تلوار اور نہ طاقت۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیسے آپ نیکیوں کا حکم دیں گے؟ اتنے حکم دینے والے ہیں۔ مگر کسی کی بات کا کوئی اثر نہیں ہے۔ کیا آپ کے پاس کوئی مخصوص طریقہ ہے امر و نہی کا، کہ امر و نہی کے ذریعہ سے آپ اُمّت کی اصلاح کر لیں گے؟

فرمایا۔ ہاں ہاں میرے پاس نیا طریقہ ہے۔ میں امر و نہی کی راہ میں دو سیرتیں

اختیار کروں گا۔ ایک میرے جد کی سیرت ہے۔ ایک میرے باپ کی سیرت ہے۔

اصلاح امت میں دو ہی سیرتیں کام آتی ہیں۔ یا سیرتِ پیغمبرؐ یا سیرتِ علیؑ جب کوئی تیسری سیرت شامل ہوگی تو فساد برپا ہوگا۔ امت کی اصلاح نہیں ہوسکتی ہے۔ صلوات

امام حسینؑ نے اپنے دَور میں یہ بات نہایت ہی واضح طور سے ارشاد فرمادی۔ اور یہ بھی زبانی نہیں فرمائی اور نہ کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا، بلکہ لکھ کے دیا محمد حنفیہ کو وصیت نامہ، تاکہ ہمیشہ کے واسطے یہ ایک دستاویز بن جائے انقلاب حسینی کی۔

اور شائد امام حسینؑ نے لکھ کے اس لئے بھی دیا ہو کہ جانتے ہیں کہ جب کوئی بات نہیں لکھی جاتی ہے تو اس سے امت میں فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ اور دوسروں سے نہیں کہنا ہے کہ کوئی قلم دے تو لکھیں۔ میں خود لکھ کے جاؤں گا تاکہ میری وصیت کسی کی شرمندۂ احسان نہ ہونے پائے۔ صلوات

تو امام حسینؑ کا یہ کہنا کہ اصلاح کروں گا۔ نیکیوں کا حکم دوں گا۔ برائیوں سے روکوں گا۔ یہ خود اس بات کی علامت ہے کہ سماج سے نیکیاں اُڑ گئی ہیں، برائیاں آگئی ہیں۔ ورنہ اگر نیکیاں ہیں تو نیکیوں کا حکم دینے کے معنی کیا ہیں اور اگر برائیاں نہیں ہیں تو برائیوں سے روکنے کے معنی کیا ہیں۔؟

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ اس بات کی علامت ہے کہ نیکیاں نہیں ہیں انھیں پیدا کرنا ہے۔ برائیاں پیدا ہو گئی ہیں ان سے روکنا ہے۔

یہ نقشہ ہے سماج کا جو امام حسینؑ نے بیان کیا ہے۔ لیکن انقلاب امام حسینؑ کو پہچاننے کے لئے میں ایک لفظ کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ کون سا دنیا میں دور ایسا آیا ہے جب نیکیاں غائب نہ ہوئی ہوں۔ برائیاں موجود نہ رہی ہوں۔ انبیاء کا دَور دیکھئے مرسلین کا زمانہ دیکھئے۔ خود سرکار دو عالمؐ کا زمانہ دیکھئے۔ کیا سرکار دو عالمؐ کے دَور میں سارے کفار مر گئے تھے؟ کفر کہیں چلا گیا تھا؟ شرک کہیں فنا ہو گیا تھا؟ بت پرستی کہیں مٹ گئی تھی؟ شراب کے سارے کارخانے بند ہو گئے تھے؟ جوئے کے سارے بازار بند ہو گئے تھے؟ سود کاری کیا بند ہو گئی تھی؟۔ برائیاں تو موجود تھیں۔ برائیاں

ہر دَور میں موجود رہی ہیں، کوئی دَور زمانہ کا ایسا نہیں آیا ہے جب سماج میں بُرائیاں نہ ہوں اور کیا آج بُرائیاں نہیں ہیں۔ کیا لوگ جھوٹ نہیں بولتے ہیں؟ بے ایمانی نہیں کرتے ہیں؟ غداری نہیں کرتے ہیں؟ شراب نہیں پیتے ہیں؟ کون سا کام دنیا میں ہے جو نہیں ہو رہا ہے۔

جناب آدمؑ کے دور میں ہو رہا تھا جب کل چار نفر کی آبادی تھی، جس کی کوئی اوقات نہیں، کوئی شمار نہیں۔ وہاں بھی اتنا بڑا جُرم ہو گیا کہ بھائی بھائی کا قاتل بن گیا۔ تو جب جناب آدمؑ کے دَور میں یہی حال رہا۔ جناب نوحؑ کے زمانے میں یہی حال رہا۔ جناب ابراہیمؑ، جناب موسیٰؑ، جناب عیسیٰؑ، سرکار دو عالمؐ، ہر دَور میں معروف کا فقدان رہا ہے۔ ہر دَور میں منکرات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ تو آخر امام حسینؑ نے امر و نہی کے لئے اتنی بڑی قربانی کا ارادہ کیوں کر لیا؟

اگر یہ کام اس قدر ضروری ہوتا تو سارے انبیاء و مرسلین اپنے اپنے گھر والوں کو لے کر نکل پڑتے اور سب اپنے سر کی بازی لگا دیتے۔ اپنے گھر کو لٹا دیتے۔ لیکن اگر اس کے پہلے ایسا نہیں ہوا ہے تو تنہا ایک امر و نہی کی خاطر امام حسینؑ اپنے اتنے بڑے گھرانے کو لے کر کیوں اُٹھے اور سب کو راہِ حق میں کیوں قربان کر دیا۔ یہ امر و نہی کی کون سی قسم ہے یا کون سا دَور آ گیا ہے کہ امام حسینؑ کو نیکیوں کا فقدان برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ کوئی ایسی بات تو ہونی چاہئے کہ جو اس کے پہلے نہیں تھی، اب پیدا ہو گئی ہے کہ اب تک خاصانِ خدا برداشت کرتے رہے ہیں مگر اب حسینؑ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

میں پھر لفظوں کو دُہراؤں گا۔ بُرائیاں ہر دَور میں رہی ہیں، نیکیوں کا فقدان ہر زمانے میں رہا ہے۔ مگر ایک نئی بات جو پیدا ہو گئی تھی دورِ امام حسینؑ میں، وہ بات فقط اتنی ہے کہ امام حسینؑ کے دور میں ایک ایسا وقفہ آیا تھا جو اپنی پچھلی تاریخ سے بھی الگ تھا، اور اپنے بعد کی تاریخ سے بھی الگ ہے۔ لہٰذا جو ذمہ داری امام حسینؑ پر تھی وہ نہ اس کے پہلے کے خاصانِ خدا پر تھی اور نہ اس کے بعد کے

خاصانِ خدا پر عائد ہوئی۔

اس دَور کی خصوصیت کو آپ پہچانیں کہ اچھائیاں ہمیشہ غائب رہیں اور بُرائیاں ہمیشہ رہیں۔ مگر فرق یہ رہا کہ ہر دَور میں اچھائیوں کا فقدان اور بُرائیوں کا وجود اسلام سے الگ رہا۔ ایمان سے الگ رہا۔ مذہب سے الگ رہا۔ دینِ خدا سے الگ رہا۔

دینِ خدا الگ، شراب الگ۔ دینِ خدا الگ، زنا الگ۔

اچھے بندے بھی پائے جاتے تھے۔ شرابی اور سود خوار بھی پائے جاتے تھے۔ مگر دونوں الگ الگ تھے۔ جو اچھا تھا وہ شرابی نہیں تھا۔ جو شرابی تھا وہ اچھا نہیں تھا۔ دورِ آدمؑ سے لے کر دورِ خاتمؐ تک کی تاریخ پڑھ لیجئے آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ یہ اللہ والے ہیں، وہ بے ایمان ہیں۔ یہ اللہ والے ہیں، وہ نالائق ہیں۔ مگر کوئی ایک اللہ والا ڈھونڈھ کے نکالے جو نالائق بھی رہا ہو جو ولی بھی رہے اور بے ایمان بھی رہے۔ وصی بھی رہے اور نالائق بھی رہے۔ معاذ اللہ۔ نبی بھی رہے اور خطاکار بھی ہو۔

مگر دورِ حسینؑ میں یہ عیب پیدا ہو گیا تھا کہ خلیفۃ المسلمین بھی تھا شرابی بھی تھا۔ اسلام کا ذمہ دار بھی تھا، بدکار بھی تھا۔

یعنی مذہب کو بُرائیوں سے جوڑ دیا گیا تھا اور بُرائیاں داخلِ مذہب ہو گئی تھیں۔ شراب پی کے یزیدؑ خلیفہ ہے۔ زنا کر کے خلیفہ ہے۔ بُرائیاں کر کے خلیفہ ہے۔ ظلم کر کے خلیفہ ہے۔ خلافت اسلامی کو بُرائیوں سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اب امام حسینؑ نہ یزید کو مارنے کی فکر میں ہیں اور نہ ساری بُرائیوں کو ختم کر سکتے ہیں۔ وہ جن دونوں کو جوڑ دیا گیا ہے انھیں الگ کرنا چاہتے ہیں۔ چاہے میرے سَر و تن میں بھی جُدائی ہو جائے۔ مگر جس کو جوڑ دیا گیا ہے یہ جُڑنے نہ پائے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی متدین الگ ہوتے ہیں اور بے دین الگ ہوتے ہیں۔ مومن الگ ہوتے ہیں اور شرابی بدکار الگ ہوتے ہیں۔ نہ پہلے دونوں ایک ہو سکے نہ اس کے

بعد دونوں ایک ہو سکے۔ یہ انقلاب حسینی کا پہلا اثر تھا کہ امام حسینؑ نے جان دے کر منکرات کو الگ کر دیا اور مذہب کو الگ کر دیا۔ تو اگر آج اسلام میں شراب نہیں ہے۔ اگر آج اسلام میں سود نہیں ہے۔ اگر آج اسلام میں زنا نہیں ہے۔ اگر آج اسلام میں بدکاری نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک یہ احساس زندہ رہے گا کہ اسلام الگ ہے اور شراب الگ۔ ہر دور آواز دیتا رہے گا کہ حسینؑ زندہ باد! تم نے میدان جیت لیا۔ اب کسی کے پاس اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ بدکاری کے نام پر حاکم ہو جائے۔

یہ حسینؑ کی کامیابی کا پہلا اثر تھا۔

سرکار دو عالمؐ نے جب اپنا انقلاب شروع کیا تو حضور کے سامنے جو بُرائیاں تھیں ان ساری بُرائیوں کو حضور نے دنیا کے سامنے واضح کر دیا اور اتنا واضح کر دیا کہ سرکار دو عالمؐ کا پورا دَور آپ دیکھیں اور اس کے بعد دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اب نہیں ہو سکتا ہے کہ انسان موحد بھی ہو اور بُت پرست بھی ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ توحید کا کلمہ بھی پڑھے اور بُتوں کی پرستش بھی کرے۔ نبیؐ دونوں کو الگ کرنا چاہتے تھے۔ حضور کامیاب ہو گئے کہ انھیں الگ کر دیا۔ نواسہ خلافت اسلامی کو منکرات سے الگ کرنا چاہتا تھا۔ یہ حسینؑ کی پہلی کامیابی ہے کہ منکرات کی دنیا الگ ہو گئی اور مذہب کی دنیا الگ ہو گئی۔ صلوات

بس عزیزان محترم۔ میں بات کو سمیٹ رہا ہوں تاکہ میں انقلاب حسینی کے کچھ اور اثرات آپ کے سامنے گزارش کر سکوں۔

تو پہلا اثر ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اس کے بعد بھی اگر کسی نے کوشش کی کہ منکرات کو، بُرائیوں کو، بدکاریوں کو مذہب سے ملا دیا جائے تو اس کوشش کا آخری انجام یہ ہوا کہ بُرائیاں رہ گئیں ملانے والے مٹ گئے، بلکہ وہ منصب ہی چلا گیا۔ وہ نام ہی چلا گیا۔ یزید نے بُرائیوں کو مذہب سے جوڑا تھا خلافت کے نام پر۔ حسینؑ دونوں کو الگ کرنا چاہتے تھے امامت کے نام پر۔ یہ فتح حسینؑ ہے کہ ملانے والا سلسلہ ختم ہو گیا اور الگ کرنے والے سلسلہ کا آخری وارث آج بھی قائم ہے۔ صلوات

اور مالک نے اسے اسی لئے باقی رکھا ہے کہ سرکار دو عالمؐ نے یہ خبر دی ہے کہ وہ آنے والا دنیا کو عدل و انصاف سے ویسے ہی بھر دے گا جیسے دنیا ظلم و جور سے بھری ہوئی ہوگی۔

یہ انقلاب حسینی کا پہلا اثر تھا۔ اس کے بعد سلسلہ وار آپ اثرات دیکھتے جائیں آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔

یزیدیت نے امام حسینؑ کے خلاف پہلا حربہ استعمال کیا انقلاب حسینؑ کو ناکام بنانے کے لئے حُر کے رسالہ کو بھیج کر۔ اور حُر کے لشکر نے آ کر امام حسینؑ کے راستہ کو روکا تو دونوں کی گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ ایک ایسا راستہ اختیار کیا جائے جو نہ اُدھر جاتا ہو نہ اِدھر جاتا ہو۔ یعنی نہ امام حسینؑ مدینے جائیں اور نہ حُر امام حسینؑ کو زبردستی کوفہ لے جائے۔ جب تک کہ ابن زیادؑ کے پاس سے حُر کے خط کا کوئی جواب نہ آجائے۔

حُر نے ابن زیادؑ کو خط بھیج دیا کہ حسینؑ سے ملاقات تو ہو گئی ہے اور فی الحال حسینؑ ہمارے قبضے میں ہیں اور ہم ان کو مدینہ واپس نہ جانے دیں گے۔ لیکن اب آپ فرمائیے کہ آپ کا کیا حکم ہے؟ اگر آپ کہتے ہیں کہ انھیں گھیر کے لایا جائے کوفہ تو ہم کوفہ لے آئیں اور اگر آپ کہیں کہ انھیں چھوڑ دیا جائے تو ہم چھوڑ دیں یہ اپنے وطن واپس چلے جائیں۔ آپ کے حکم کا انتظار ہے۔

ابن زیاد کا جواب آیا۔ جس کے بعد حُر نے یہ طے کر دیا کہ اب یہ قافلہ آگے نہیں بڑھے گا۔ اور بالآخر ایک منزل پر آ کے امام حسینؑ نے اپنے قافلہ کو روک دیا۔

اس جواب میں سب سے پہلی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ جیسے ہی میرا خط ملے، ویسے ہی حسینؑ کے راستہ کو روک دو، اور جب یہ اپنے قافلہ کو ٹھہرانا چاہیں، اپنے خیمے لگانا چاہیں تو ایسی جگہ پر ان کے قافلہ کو ٹھہرانا جہاں پانی نہ ملے۔

یعنی انقلاب امام حسینؑ کو ناکام بنانے کے لئے پہلا حربہ تھا بندشِ آب۔ اور یہی وجہ ہے کہ امام حسینؑ کے اصحاب کی طاقت تھی کہ خیمے نصب ہو گئے، مگر اس کے بعد جب ابن سعدؑ آیا تو مصلحت امامت سے خیمے ہٹا لئے گئے۔ اور آخر میں وہ وقت بھی آیا کہ پانی بند ہو گیا اور وہ وقت بھی آیا کہ قحطِ آب ہو گیا۔ یزید نے اپنی دانست

میں اور ابن زیاد نے اپنے خیال میں پانی بند کر کے میدان جیت لیا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جیتا کون' ہارا کون ؟۔

جب امام حسینؑ کے ساتھ اتنے فوجی، سپاہی، چاہنے والے، اصحاب، انصار، جوانانِ بنی ہاشم موجود تھے تب تو یہ حوصلہ تھا کہ پانی بند کر دیا جائے۔ اور جب سب مارے گئے، سوائے بیبیوں اور بچوں اور بیمار کے کوئی نہ رہ گیا۔ تو اس کے بعد کربلا سے لے کے شام تک اور شام کے قید خانہ میں۔ شام کے بعد مدینہ میں کہیں کوئی پیغام نہ سُنا کہ کوفہ میں پانی بند کر دیا جائے۔ شام میں پانی بند کر دیا جائے۔ قید خانے میں بچوں کو پانی نہ ملنے پائے۔ مدینہ میں پانی بند کر دیا جائے۔ پھر دوبارہ پانی بند کرنے کا نام نہیں آیا۔ یہ صحیح ہے کہ وہاں پانی کی سبیلیں نہیں لگائی گئیں۔ لیکن پھر بھی کوئی دوسرا فرمان تاریخ میں آپ کو نہیں ملے گا کہ پانی بند کر دیا جائے تاکہ حسینؑ کے اہل حرم قید خانہ میں پیاسے ہی مر جائیں اور کوئی مزید ظلم نہ کرنا پڑے۔ پھر دوبارہ یہ لفظ زبان پر نہیں آیا۔ یعنی جب تک امام حسینؑ نے قربانی نہیں دی تھی ظالم میں پانی بند کرنے کا حوصلہ تھا۔ لیکن جیسے ہی امام حسینؑ نے اپنے کو قربان کر دیا پھر دوبارہ پانی بند کرنے کا نام نہیں آیا۔ اب بتاؤ کہ جیتا کون اور ہارا کون ؟۔ صلوات

آپ میری بات کی طرف متوجہ رہیں، میں بڑی دقیق منزل سے گذر رہا ہوں۔ یہ خیال نہ پیدا ہو جائے کہ یزید نے اور یزید کے لشکر والوں نے اہل حرم کے لئے پانی کی سبیلیں لگا دی تھیں۔ نہیں ایسا نہیں ہوا۔ لیکن پھر بھی ظالم نے اس حربہ کو بطور حربہ استعمال نہیں کیا اور یہ نام نہیں آیا۔ نہ یزید کی زبان پر اور نہ۔ یزید کے بعد والوں کی زبان پر۔ یہ امام کے ایثار اور امام حسینؑ کی قربانی کا دوسرا اثر تھا۔

پہلا اثر یہ تھا کہ مذہب کے نام پر بدکاری رُکی۔

دوسرا اثر یہ تھا کہ بندشِ آب کا نام ختم ہو گیا۔

اس کے بعد یہ بھی ملاحظہ کیجئے کہ جب تک امام حسینؑ کے ساتھ اتنے سپاہی موجود تھے بیعت کا تقاضا چل رہا تھا۔ لیکن جب اہل حرم۔ یزید کے سامنے آ کر کھڑے

ہوئے تو جہاں نہ کوئی سپاہی ہے نہ کوئی فوجی۔ نہ کوئی علمدار ہے، نہ کوئی تلوار چلانے والا۔ صرف ایک بیمار ہے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پیروں میں بیڑیاں، گلے میں طوق۔ مگر۔ یزید میں یہ کہنے کی ہمت نہیں ہے کہ دیکھو تمہارے باپ نے بیعت نہیں کی تو ان کا انجام کیا ہوا۔ اب موقع غنیمت ہے تم میرے ہاتھ پر بیعت کر لو، ورنہ تمہارا ابھی وہی انجام ہوگا۔

اب تو نہایت ہی آسان تھا، بیبیوں سے کہہ دیا ہوتا۔ بچوں سے کہہ دیا ہوتا۔ ایسے کسی ایک سے مطالبہ کر دیا ہوتا۔ لیکن دوبارہ مطالبۂ بیعت کا نام۔ یزید کی زبان پر نہ آسکا۔

یہ قربانیٔ حسینؑ کا تیسرا اثر تھا کہ ظلم کے حوصلے اتنے پست ہوگئے کہ نہ بندشِ آب کا حربہ استعمال کیا اور نہ بیعت کا مطالبہ کر سکا۔

چوتھا اثر سنئے۔

دربار کس کا ہے اہل حرم جہاں لا کر کھڑے کئے گئے ہیں؟ دربار تو یزید کا ہے۔ قیدی کون ہے؟ امام حسینؑ کے گھر والے ہیں۔ مگر تاریخ اسلام گواہ ہے کہ جب یزید نے دربار میں لاکے اہلِ حرم کو کھڑا کیا ہے تو اہلِ حرم نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ وہ تو ہر منزلِ مصیبت سے گذرنے کا عہد کر چکے تھے۔ البتہ احتجاج کا سلسلہ شروع ہوگیا اور پہلا احتجاج۔ یزید کی بیٹی نے کیا۔ دوسرا احتجاج یزید کی بیوی نے کیا۔

۔یزید کی بیٹی باپ کے خلاف بول رہی ہے باپ کے دربار میں۔ یزید کی زوجہ چادر پھینک کے آگئی ہے شوہر کے دربار میں۔ یہ جذبہ کس نے پیدا کر دیا کہ جہاں نہ بیٹی کو باپ کی پرواہ ہے اور نہ زوجہ کو شوہر کی پرواہ ہے۔ سب کو حمایتِ اہلبیتؑ کا خیال ہے۔ درباریوں پر تلواروں سے، نیزوں سے حکومت کر لینا بہت آسان ہے۔ مگر ظالم کے گھر والوں پر، ان کے دلوں پر قابو حاصل کر لینا آسان نہیں ہے۔

اگر۔ یزید کامیاب ہوگیا ہوتا تو کم سے کم اپنا گھر تو قابو میں رہ گیا ہوتا۔ یہ حسینؑ ابن علیؑ کی قربانی کا چوتھا اثر تھا کہ یزید کے قبضے میں نہ زوجہ رہ گئی اور نہ بیٹی۔ سب سرِ دربار

احتجاج کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ صلوات

بھولے گا نہیں ایک ایک نکتے کو یاد رکھے گا۔ یہ حسینؑ کی کامیابی کا چوتھا اثر تھا۔ اب پانچواں اثر ملاحظہ کیجئے:

یزید دربار میں بیٹھا ہوا ہے اور اعلان کر رہا ہے۔ سب بنی ہاشم کا کھیل تھا۔ کیسی وحی، کیسی خبر، کہاں کی رسالت، کیسی نبوت، کیسا قرآن۔ یہ سب کھیل تماشہ ہے۔ بنی ہاشم نے اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے سب ڈھونگ رچایا ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مگر میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ قربانی حسینؑ نے کیا اثر دکھلایا۔

یزید کو اس اعلان کے بعد بھی تسکین نہ ہوئی تو خطیب سے کہا کہ منبر پر جا کر آلِ محمدؐ کو گالیاں دے۔

خطیب نے منبر پر جا کے گالیاں بھی سنا دیں۔ اب تو دل کو تسکین ہو گئی؟ لیکن اس کے بعد بیمار نے کہا کہ اتنی اجازت تو دیدے کہ میں بھی کچھ کہہ دوں۔ ظالم نے مجبوراً اجازت دے دی۔ بیمار منبر پر آئے اور آنے کے بعد کچھ نہیں کہا۔ حمد و ثنائے الٰہی کے بعد جب وہ منزل آئی کہ جہاں باپ کی قربانی کا ذکر کیا جائے، تو فرمایا کہ میں اس کا بیٹا ہوں جس کو پسِ گردن سے ذبح کیا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کا عمامہ، جس کی ردا لوٹ لی گئی۔

جیسے ہی قربانی حسینؑ کا ذکر شروع ہوا۔ یزید نے دیکھا کہ دربار کا نقشہ بدل رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ بیمار کے خطبہ کو روکا کیسے جائے۔ بیمار کی تقریر کو روکا کیسے جائے۔ یزید کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ نہ خنجر، نہ تلوار، نہ نیزہ، نہ تیر۔ کیسے روکا جائے۔ موذن سے کہا اذان شروع کر دے۔ جیسے ہی اذان شروع ہوئی بیمار خاموش ہو گئے۔ موذن نے کہا اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ امام نے سنا اور دہرایا۔ موذن نے کہا اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ امام نے سنا اور دہرایا۔ موذن نے کہا اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ ابھی تک امام سن رہے تھے اور دہرا رہے تھے۔ لیکن اب یزید کی طرف متوجہ ہو گئے تاکہ دربار والے بھی ہوشیار ہو جائیں کہ کون جیتا اور

کون ہارا۔ موذنِ یزید نے کہا اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ یعنی جہاں رسالت کو ڈھونگ کہا جارہا تھا وہاں رسالت کا کلمہ پڑھا جارہا ہے۔

اب تو اندازہ ہوا کہ جس انقلاب کو دنیا ناکام بنانا چاہتی تھی وہ اتنا کامیاب ہوا کہ اس کے اثرات دربار حاکم میں دیکھے جارہے ہیں۔

اور پھر۔ یزید کے خاتمہ کے بعد جیسے ہی بیٹے کے ہاتھ میں تخت حکومت آیا، بیٹے نے منبر پر جاکر چند لمحہ کی تقریر کی اور اُتر آیا کہ یہ تخت اس قابل نہیں ہے کہ کوئی شریف آدمی اس پر قدم رکھے۔ یہ غاصبوں کا تخت ہے۔ یہ ظالموں کا تخت ہے۔ میں اس پر قدم رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

یہ ہے قربانی حسینؑ کا چھٹا اثر کہ یزید کا بیٹا بنا بنایا اقتدار نہیں لینا چاہتا ہے۔ اب بتاؤ جیتا کون ہے، ہارا کون ہے۔؟ صلوات

اور آگے بڑھیے۔ خود یزید کی زندگی میں دیکھیے۔ ابھی تو بیٹے کا ذکر تھا۔ بیبی کا تذکرہ تھا۔ زوجہ کا تذکرہ تھا۔ دربار کے موذن کا ذکر تھا۔ اب آئیے خود یزید کو دیکھیں کہ قربانی امام حسینؑ نے یزید کو کہاں تک پہنچا دیا۔

ایک طرف اہل حرم ہیں جو قید خانے میں ہیں — مشقتوں کا عالم ہے — مصیبتوں کا ماحول ہے۔ دوسری طرف تخت حکومت ہے۔ راحت ہے۔ آرام ہے۔ محل ہے قصر ہے۔ بیت المال ہے۔ شراب ہے۔ دنیا کا سارا ہنگامہ ہے مگر ایک مرتبہ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ بستر چھوڑ کے یزید ایک گوشے میں بیٹھا ہوا ہے اور کہہ رہا ہے۔ حسینؑ نے میرا کیا بگاڑا تھا؟ میں نے حسینؑ کو کیوں قتل کرا دیا؟ میں نے حسینؑ کو کیوں ذبح کرا دیا؟

یہ کون کہہ رہا ہے؟ یزید ہی تو کہہ رہا ہے جس کے بعد اہل حرم کو رہا کیا ہے۔

اب دونوں منظر دیکھ لیجیے۔ ایک کوئی جھوٹی تاریخ بھی ابھی تک نہیں بنی ہے۔ ایک روایت بھی چودہ صدیوں میں نہیں تیار ہوئی ہے کہ قید خانہ کی پریشانیوں کو دیکھ کے مصائب سے عاجز آکر کسی بچے نے یہ کہہ دیا ہو کہ آخر بابا کو کیا ہو گیا تھا اگر بیعتِ یزید کر لی ہوتی تو ہم لوگ سال بھر تک قید میں کیوں پڑے رہتے۔

حسینؑ نے وہ حوصلہ دے دیا تھا کہ بچوں میں بھی کوئی شرمندہ نہیں ہے۔ لیکن یزید کا حوصلہ اتنا پست ہوگیا ہے کہ یزید اپنی شرمندگی کا اقرار کر رہا ہے۔

یہ حسینؑ کی ساتویں فتح ہے جس نے یزید پر کامیابی حاصل کی ہے۔ صلوات

اب آٹھواں مرحلہ۔ زوجہ نے جب یہ دیکھا کہ یزید بستر نہیں ہے اور ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا رو رہا ہے۔ تو اس نے دو ہاتھ مارے۔ کہا یہاں کیوں بیٹھا ہوا ہے؟ کہا کیا کروں نیند نہیں آتی ہے۔ عجب منظر دیکھتا ہوں، عجب خواب دیکھتا ہوں۔

زوجہ نے ٹوکا، اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ تو نے یہ غلط کیا ہے اور تو نے غلط حکم دیا ہے اور ان لوگوں کو بے سبب ظالمانہ انداز سے تہ تیغ کرا دیا ہے تو کم سے کم ان کے گھر والوں کو ہی چھوڑ دے، انھیں کیوں قیدی بنا کر رکھا ہے؟

کہا تو نے سچ کہا ہے۔ میں کل انھیں آزاد کر دوں گا۔ بالآخر دربار میں آیا۔ عابد بیمار کو بلایا۔ اہل حرم امام حسینؑ کو قید خانہ سے نکالا اور وطن بھیجنے کا حکم دے دیا اور اجازت دے دی کہ وہ اپنے گھر چلے جائیں۔ اور اس کا راز یہ تھا کہ یزید ماحول سے اتنا پریشان ہوگیا تھا کہ انھیں آزاد کرنے کے لیے تیار ہوگیا، ورنہ اس سے کسی شرافت کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔

یہ حسینؑ کے انقلاب کی آٹھویں کامیابی تھی۔ صلوات

بس دو جملے اور سن لیں ورنہ باتیں تو بہت ہیں جو میں گزارش کرتا۔ یزید تیار ہوگیا انھیں رہا کرنے پر۔ مگر اہلِ حرم کے حوصلے اتنے بلند ہیں اور قربانی حسینؑ نے ان کی ہمتوں کو اتنا بلند کر دیا ہے کہ اتنے پر بھی راضی نہیں ہیں کہ ہمیں آزاد کر دیا جائے اور ہم گھر چلے جائیں بلکہ جیسے ہی رہائی کا نام سنا۔ ثانی زہراؑ نے فرمایا بیٹا! یزید سے کہو کوئی گھر خالی کرائے، یہاں ماتم ہوگا۔ یہاں مجلس ہوگی۔ یہاں بھائی کا ذکر ہوگا۔ ہم اس کے بغیر نہ جائیں گے۔ تاکہ یہ بھی تو ایک نظیر قائم ہو جائے کہ جہاں نام حسینؑ لینا جرم تھا وہاں بھی مجلس حسینؑ قائم ہوئی ہے۔

ثانی زہراؑ نے قید سے رہائی کا مطالبہ نہیں کیا ہے مگر مجلس کا تقاضہ کیا ہے۔ فرش عزا

کا مطالبہ کیا ہے۔ گویا کہ رہائی کا مطالبہ نہ کرنا ایک کامیابی تھا اور فرشِ عزا کا قائم کر دینا یہ دوسری کامیابی ہے۔ صلوات

یہ انقلاب امام حسینؑ کی نویں کامیابی تھی۔ اور ایک آخری جملہ اور سُن لیں جہاں سے میں نے بات شروع کی تھی کہ امام حسینؑ اُٹھے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے کہ نیکیوں کا حکم دیا جائے گا اور برائیوں سے روکا جائے گا۔ جو بنیادِ انقلاب امام حسینؑ ہے۔ یہ بنیاد بھی اتنی کامیاب ہوئی کہ جب تک یزید کا اقتدار قائم رہا مجال تھی کسی کی جو سانس لے سکے۔ شراب کی تعریفیں ہو رہی تھیں۔ بدکاریوں کی مدح سرائی ہو رہی تھی۔ ظلم کی تعریف کی جا رہی تھی۔ کس میں ہمت تھی جو کہہ دے کہ یہ حرام ہے۔ کس میں ہمت تھی جو ٹوک دے کہ یہ کام غلط ہے۔ کوئی نہیں تھا دربار میں سوائے امام حسینؑ کے گھر والوں کے۔ سارے معروف مٹ گئے کوئی نہ بولا۔ سارے منکر رائج ہو گئے کوئی نہ بولا ــــ تو جب تک یزید کا اقتدار چلتا رہا معروف کا نام لینے والا کوئی نہیں تھا۔ منکر سے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ مگر جب قربانی حسینؑ نے اپنا اثر دکھلا دیا تو امر بالمعروف اتنا اونچا ہو گیا کہ اسلامی حکومتوں میں پوری پوری وزارتیں قائم ہونے لگیں۔ صلوات

یہ قربانی امام حسینؑ کا دُوررس اثر تھا۔ حسینی انقلاب اصولوں پر قائم تھا۔ لہٰذا جب تک اصول اسلام زندہ رہیں گے اُس انقلاب کی کامیابی اور فتح کا اعلان ہوتا رہے گا۔

یہ چند باتیں تھیں جو میں نے آپ کے سامنے گذارش کر دیں ورنہ ظاہر ہے کہ اگر موقع ہوتا یا پھر کبھی اگر موقع ہو گا تو مزید گذارش کروں گا کہ انقلاب حسینؑ کی یہ کامیابی تو فقط اس دَور میں تھی اس کے بعد ہر دَور میں اس انقلاب کی کامیابی کے اثرات کیسے کیسے سامنے آتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ دورِ حاضر میں بھی وہی ایک انقلاب ہے امام حسینؑ کا جس کی دھمک ساری دنیا میں پائی جاتی ہے۔ جس کے اثرات ساری دنیا میں پائے جاتے ہیں کہ آج بھی اگر کوئی انقلاب کا نام لینا چاہتا ہے تو بغیر حسینؑ کے نام کے نہیں لے سکتا اور قربانی حسینؑ کا اتنا بڑا اثر صرف عالمِ اسلام پر نہیں ہے بلکہ پورے

عالم انسانیت پر ہے کہ شاید بلکہ یقیناً دنیا کے کسی انقلاب کا اتنا اثر ذہن انسانی پر نہیں ہے جتنا بڑا اثر انقلاب امام حسینؑ کا ہے اور کیوں نہ ہوتا کتنی بڑی قربانی ہے۔

میدان میں جا کے تلوار چلا کے جنگ کر کے مرجانا، قتل ہو جانا بہت آسان ہے۔ دنیا میں یہ سارے کام ہوتے ہی رہتے ہیں مگر امام حسینؑ نے اپنے انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے کتنی بڑی قربانی دی ہے اور کتنی بڑی بڑی قربانیاں پیش کی ہیں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا ہے۔

ارباب عزا! انسانی زندگی میں کچھ ایسے حسّاس موضوعات اور مواقع ہوتے ہیں جو انسان کے لئے نا قابل برداشت ہو جاتے ہیں۔ کمسن بچہ مرحوم بھائی کی نشانی۔ جان برادر کا قربان کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اپنی گود کے پالوں کا قربان کر دینا بہت آسان ہے مگر جان برادر کو، بھائی کی نشانی کو مرنے کی رضا دینا بہت مشکل ہے۔ اور حسنؑ مجتبیٰ کی نگاہ کے سامنے یہ مرحلہ تھا کہ حسینؑ کو اس منزل سے گذرنا پڑے۔ لہٰذا حسنؑ نے اس مرحلہ کو ذرا آسان بنا دیا۔ دنیا سے جاتے جاتے بیٹے کے بازو پر ایک تعویذ باندھ دیا اور یہ فرما دیا کہ میرے لال جب کوئی سخت مصیبت کا وقت آجائے تو اس تعویذ کو دیکھ لینا اور جو کچھ اس کاغذ میں لکھا ہے اس کے مطابق عمل کرنا۔

عاشور کی رات آئی۔ فرزند رسول الثقلینؑ چاہنے والوں کے درمیان، کل کی صبح کا ذکر کر رہے ہیں۔ کل قربانیوں کا دن ہے۔ کل راہِ خدا میں فداکاریوں کا دن آنے والا ہے۔ کل سب قربان ہو جائیں گے۔ ایک ایک کا ذکر حسینؑ ابن علیؑ کرتے رہے۔ کل حبیب نہ رہیں گے۔ مسلم نہ رہیں گے۔ زہیر نہ رہیں گے۔ چاہنے والے قربان ہو جائیں گے۔ بنی ہاشم کے جوان قربان ہو جائیں گے۔ سارا تذکرہ کرنے کے بعد جیسے ہی مولاؑ خاموش ہوئے۔ بچے نے دیکھا کہ میرا نام کہیں نہیں آیا۔ ایک گوشہ میں بیٹھ کے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ ہاں اولاد والو آپ بھی اپنے دل کے جذبات کا جائزہ لیں۔ اور میں اپنے بچوں سے بھی کہوں گا کہ تم بھی اپنے جذبات کا جائزہ لو۔ اگر کہیں موت کا ذکر آرہا ہو۔ دس، بیس، پچاس کے مرنے کا ذکر آرہا ہو اور کسی کے زندہ بچنے

کا ذکر آجائے تو جس کو زندگی کا پیغام سُنا دیا جائے وہی خوش ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں مرنے کا ذکر نہیں آیا تو بچہ بیقرار ہو کے رو رہا ہے۔ باپ نے کہا تھا جب کوئی بڑی مصیبت سامنے آئے تو میرے اس خط کو اس تعویذ کو پڑھ لینا۔ بچے کی نگاہ میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ سب قربان ہو جائیں گے، مجھے قربان ہونے کا موقع نہ ملے گا۔ جیسے ہی یہ خیال آیا بازو سے تعویذ کو کھولا۔ دیکھا اور لے کے سیدھے مولا کی خدمت میں آ گیا۔ چچا کی بارگاہ میں خط کو پیش کر دیا۔ امام حسینؑ نے خط کو دیکھا، آنکھوں سے لگایا اور قاسمؑ کو سر سے پیر تک دیکھا۔ بیٹا یہ کیا ہے؟ کہا بابا جان نے میرے بازو پر ایک تعویذ باندھا تھا اور فرمایا تھا کہ جب کوئی بڑی مصیبت کا وقت آ جائے تو اسے پڑھ لینا۔ اب میں نے دیکھا کہ یہ تو آپ ہی کے نام ہے۔ ذرا آپ ملاحظہ فرمالیں بیٹے کو جو وصیت فرمائی:

بیٹا دیکھو چچا پر کوئی وقت پڑ جائے تو چچا کے کام آنا۔

حسینؑ نے بھتیجے کو سر سے پیر تک دیکھا اور کہا میرے لال یہ تعویذ لے کے آئے ہو کہ اپنی موت کا پیغام لے کے آئے ہو۔

اتنا حوصلہ ہے جان دینے کا۔ اتنا حوصلہ ہے قربان ہونے کا تو سنو۔ کل وہ دن آنے والا ہے کہ تم بھی قربان ہو جاؤ گے اور تمہارا چھوٹا بھیا علی اصغرؑ بھی دنیا میں نہ رہے گا۔ سنو سنو غیرت دارو! اور میری بیٹیاں بھی سُن رہی ہیں وہ بھی متوجہ رہیں۔ جیسے ہی حسینؑ نے یہ سُنایا کہ تم بھی قربان ہو جاؤ گے اور تمہارا چھوٹا بھیا علی اصغرؑ بھی قربان ہو جائے گا۔ ایک مرتبہ بچہ نے سر اٹھایا۔ چچا یہ آپ نے کیا فرمایا۔ علی اصغرؑ قربان ہو جائیں گے۔؟ کیا اشقیا خیمے میں آ جائیں گے؟

حسینؑ نے بچے کے دل کو سنبھال لیا۔ نہیں قاسمؑ میں اصغرؑ کو لے کے میدان میں جاؤں گا۔ شاید بنی ہاشم کا لال یہ نہ سُن سکے گا کہ اشقیا در انہ خیموں میں آ جائیں گے۔ اجرکم علی اللہ، خدا آپ کو کسی غم میں نہ رُلائے سوائے غمِ آلِ محمدؐ کے۔

بس پانچ منٹ۔ ظاہر ہے تاریخیں آخری آگئی ہیں۔ ساتویں محرم کی رات آگئی ہے۔ دو تین دن عاشور محرم میں اور باقی رہ گئے ہیں۔ ایک پانچ منٹ آپ

متوجہ رہیں انشاء اللہ بہت روئیں گے۔ چچا نے جیسے ہی یہ پیغام سُنایا کہ بیٹا تم بھی قربان ہو جاؤ گے قاسم مطمئن ہو گئے۔ بالآخر وہ وقت آیا جب ظہر کے بعد سارے چاہنے والے کام آچکے اور بنی ہاشم کی قربانی کا وقت آگیا۔ اولادِ عقیل راہِ خدا میں قربان ہو چکی اور اولادِ حسنؑ بھتیجی کی باری آئی تو ایک مرتبہ قاسمؑ چچا کے سامنے آ کے کھڑے ہو گئے اور ہاتھ جوڑ کے گذارش کی۔ چچا اب تو سارے چاہنے والے بھی کام آ گئے، اولادِ عقیل بھی قربان ہو گئی، مسلم کے یتیم بھی کام آ گئے۔ چچا آخر میری باری کب آئے گی؟ چچا مجھے میدان میں جانے کا موقع کب ملے گا؟ چچا اب تو اجازت دید یجئے۔ اب تو میدان میں جانے دیجئے۔ امام حسینؑ بھتیجے کو دیکھ رہے ہیں، کچھ جواب نہیں دے رہے ہیں۔ میں نے روایت میں عجب فقرہ دیکھا ہے۔ آج ہی مقتل پڑھ رہا تھا دیکھا کہ جب امام حسینؑ نے کوئی جواب نہیں دیا اور قاسمؑ نے دیکھا کہ چچا شائد اجازت نہیں دیں گے تو بچہ یکبارگی خاک پر بیٹھ گیا اور سر حسینؑ کے قدموں پر رکھ دیا۔ امام حسینؑ نے کہا ارے بیٹا یہ کیا؟ کہا چچا جب تک مرنے کی اجازت نہ دو گے یہ سر نہ اُٹھے گا۔ جب تک آپ اپنی زبان سے نہ کہہ دیں گے جاؤ میدان میں جاؤ۔ یہ سر نہ اُٹھے گا۔ حسینؑ نے بچہ کو کلیجہ سے لگا لیا۔ ارے میرے لال مرنے پر اتنا اصرار کر رہے ہو۔ اچھا جاؤ میں نے تمہیں اجازت دے دی۔ یہ کہہ کے حسینؑ نے بھتیجہ کو سجایا۔ مگر سجانے کا نیا انداز دیکھا۔ پہلے قاسم کے سر پر عمامہ باندھا۔ اور روایت کہتی ہے کہ ایسا عمامہ باندھا کہ اس کے دونوں سرے سینے پر لٹکا دئیے۔ دیکھا ہو گا آپ نے اور یقیناً دیکھا ہو گا جب کسی مرنے والے کو کفن دیا جاتا ہے تو کفن کے مستحبات میں ایک عمامہ بھی شامل ہے اور عمامہ کو باندھنے کی ترکیب یہ ہوتی ہے کہ اس کے دونوں سرے سینے پر لٹکا دئیے جاتے ہیں۔ بشائد حسینؑ اشارہ کر رہے تھے کہ میرے لال! میں تجھے کفن تو نہ دے سکوں گا بیٹا۔ سجایا، تیار کیا اور اس کے بعد چاہتے ہیں کہ گھوڑے پر بٹھا کے بھتیجے کو میدان میں بھیج دیں۔ مگر نہ جانے کیا خیال آگیا کہ اک مرتبہ کہا بیٹا آؤ تم کو گلے سے لگا لوں۔ روایت کا فقرہ ہے کہ حسینؑ نے ایک مرتبہ قاسم کو کلیجہ سے لگایا اور چچا بھتیجے اتنا روئے کہ غش کھا کر گر پڑے

ثانیٔ زہراؑ نے دیکھا اِدھر بھائی اُدھر بھتیجہ۔ دونوں غش کے عالم میں ہیں۔ مگر پانی کا کوئی قطرہ ہوتا تو چھڑک کر ہوش میں لے آتیں۔ بالآخر زینبؑ نے آنسوؤں کا چھڑکاؤ کیا۔ دونوں کو غش سے چونکایا۔ بھیّا دل سنبھالو۔ اب بیٹے کو جانے دو۔ حسینؑ نے کہا اچھا چلو تمھیں سوار کرادوں۔ گھوڑے پر سوار کراتے کراتے ایک مرتبہ حسینؑ نے قاسمؑ کا گریبان چاک کردیا۔ ارے چچا یہ کیا؟ فرمایا بیٹا یہ یتیموں کی نشانی ہے۔ تم جارہے ہو مجھے میرا بھائی یاد آرہا ہے۔ گھوڑے پر بٹھایا۔ قاسم میدان میں آئے۔ جہاد کی منزلیں تمام ہوئیں۔ جب زخموں سے چور ہو کے گھوڑے سے گرنے لگے۔ آواز دی۔ یا عمّاہ! چچا چچا آیئے۔ بھتیجے کی خبر لیجئے۔ بس آخری جملہ حسینؑ کے کانوں میں آواز آئی۔ تیار ہوئے میدان میں جانے کے لئے۔ روایت کا فقرہ ہے کہ اس تیزی سے حسینؑ آگے بڑھے کہ میدان میں ابتک اتنی تیزی سے نہیں گئے تھے۔ کیوں؟ اس لئے کہ حسینؑ نے دیکھ لیا کہ قاتل سرھانے بیٹھا ہوا ہے اور بیٹے کا گلا کاٹنا چاہتا ہے اور قاسم چچا کا انتظار کررہے ہیں۔

حسینؑ دوڑے خبردار! اب میں آگیا۔ مگر جب تک میں حسینؑ پہونچیں، فوجِ دشمن آگے بڑھی۔ درمیان میں قاسم ہیں۔ چچا کے پہونچتے پہونچتے ایک ہی آواز کان میں آرہی ہے۔ چچا چچا چچا۔ جلدی آؤ چچا۔ حسینؑ پہونچے تو بھتیجہ کو عجب عالم میں دیکھا۔ اے میرے لال اب چچا آیا جب تمھارے کام نہ آسکا۔ بیٹا اب حسینؑ مقتل میں آیا جب تمھاری مدد نہ کرسکا۔ اے میرے لال حسینؑ تم سے شرمندہ ہے کہ تم نے پکارا مگر میں تمھیں ظالموں سے نہ بچاسکا۔ جاؤ جانِ برادر جاؤ خدا حافظ!۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

آٹھویں مجلس

دعائے امام حسین علیہ السّلام

"حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اللہ اس سے محبت کرے جو میرے حسینؑ سے محبت کرے۔"

سرکار دو عالمؐ کے اس ارشاد گرامی کی روشنی میں جو سلسلۂ کلام عرفان حسینؑ کے عنوان سے آپ کے سامنے پیش کیا جارہا تھا اس کے آٹھویں مرحلے پر ایک انتہائی اہم اور سنجیدہ موضوع سے متعلق کچھ باتیں گذارش کرنا ہیں۔ اور وہ ہے مسئلۂ دعائے امام حسین علیہ السلام۔

یوں تو انسانی زندگی کا کوئی لمحہ بھی دعاؤں سے نہ خالی ہوسکتا ہے اور نہ خالی ہونا چاہئے۔ لیکن چونکہ آنے والی شب، شبِ جمعہ ہے اور شبِ جمعہ بالخصوص شبِ دعا کہی جاتی ہے، اس لئے میں نے اس موضوع کو آج آپ کے سامنے پیش کرنا مناسب سمجھا ہے تاکہ آپ ذہنی طور پر کل کے لئے تیار ہوجائیں۔

اس ذیل میں بے شمار مسائل اور مطالب ہیں جن کی طرف انسان کو متوجہ رہنا چاہئے۔ مگر ساری باتیں نہ گذارش کی جاسکتی ہیں اور نہ ان کی گنجائش ہے۔ میں نے اپنی کتاب "نقوشِ عصمت" میں اس موضوع پر بہت کچھ تفصیل سے لکھ دیا ہے۔ جن حضرات نے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں اور جنھوں نے مطالعہ نہیں کیا ہے وہ مطالعہ کرسکتے ہیں۔ لیکن اس وقت تمہیدی طور پر چند جملے گذارش کرنا ہیں اور اس کے بعد

اصل موضوع "دعائے امام حسین علیہ السلام" سے متعلق کچھ باتیں عرض کرنا ہیں۔

تمہید کے طور پر پہلے آپ یہ سمجھ لیں کہ دعا کا واقعی تصور اسلام میں وہ نہیں ہے جو ہمارے معاشرہ میں پایا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں دعا کا ایک ہی تصور ہے کہ غرض مند آدمی بے نیاز سے کچھ مانگنا چاہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب غرض کا احساس پیدا ہوتا ہے تو دعا کا خیال آتا ہے۔ اور جب انسان کو اپنی طاقت اور بے نیازی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے تو دعاؤں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ہمارے یہاں روایات میں یہ فقرہ ملتا ہے کہ اگر کوئی انسان نماز تمام کرنے کے بعد "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُهٗ" کہہ کر مصلیٰ سمیٹ کے اُٹھ جائے تو پروردگار عالم اس نمازی سے خوش نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے مجھے قابلِ سجدہ تو سمجھا ہے لیکن اُسے اپنی حیثیت، اور میری عظمت کا احساس نہیں ہے۔ اُسے چاہئے تھا کہ نماز تمام کرنے کے بعد بھی کچھ مجھ سے مانگتا، میری بارگاہ میں دعا کرتا، تاکہ اسے یاد رہتا کہ دنیا کے سارے کریموں میں اور مجھ میں ایک بنیادی فرق ہے کہ ہر کریم مانگنے والوں سے گھبراتا ہے، ہاتھ پھیلانے والوں سے ناراض ہوتا ہے۔ لیکن میں ان سے ناراض ہوتا ہوں جو ہاتھ نہیں پھیلاتے ہیں اس لئے کہ مانگنے والوں سے وہ گھبراتے ہیں جنھیں اپنے خزانوں میں کمی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن جو اپنی ذات ہی کو "کنزِ مخفی" کہہ کے پیش کرتا ہے اسکے خزانے میں کبھی کمی نہیں آسکتی ہے۔ نہ اس کی ذات محدود کی جا سکتی ہے اور نہ اس کا خزانہ محدود بنایا جاسکتا ہے۔ صلوات

اس کا ایک بہترین اشارہ اگر آپ چاہیں تو قرآن مجید میں بھی تلاش کر سکتے ہیں۔ بندہ نے نماز میں خود ہی پروردگار سے کہا تھا اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پروردگار! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں تو عبادت کرتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہو گیا لیکن اس کے بعد جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے گا تو بندے کا اعلان مکمل ہو گا۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ۔ تک اِیَّاکَ نَعْبُدُ کا مظاہرہ ہو رہا تھا اب جو ہاتھ اٹھے گا تو اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ سامنے آئے گا۔

اور یہیں سے آپ اس حقیقت کو پہچانیں گے کہ دعا کی حقیقت واقعاً اسلام کی نگاہ میں کیا ہے۔

پروردگار عالم نے ہر بندہ کے لئے ایک ہی دعا واجب قرار دی ہے۔ ہر دعا میں ہم آزاد ہیں مانگیں یا نہ مانگیں۔ مانگیں گے وہ دیدے گا۔ نہ مانگیں گے نہ دے گا۔ لیکن ایک دعا ایسی ہے جو ہر بندۂ مسلمان پر واجب ہے۔ اس میں کسی آدمی کو آزاد نہیں چھوڑا گیا ہے۔ حد یہ ہے کہ رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ میں بھی آپ آزاد ہیں۔ ہو سکتا ہے دعائے مغفرت کریں، ہو سکتا ہے نہ کریں۔ لیکن ایک دعا ایسی ہے جس میں کسی بندۂ مسلمان کو آزاد نہیں رکھا گیا ہے۔ ہر مسلمان پر واجب ہے اس ایک دعا کا پروردگار عالم کی بارگاہ میں پیش کرنا۔

وہ کون سی دعا ہے؟ اس مسئلہ کو سلسلہ وار پہچانئے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ کون سی دعا ہے جو پروردگار عالم نے ہر مسلمان پر واجب قرار دی ہے۔ اسلام کے فرائض اور واجبات میں سب سے اہم واجب کا نام ہے نماز۔ عقائد کے بعد جب اعمال کی دنیا آتی ہے تو سارے اعمال میں سب سے اہم عمل کا نام ہے نماز۔

فروعِ دین دس ہیں۔ اوّل نماز۔ تو سب سے اہم واجب کا نام ہے نماز۔ اور قرآن مجید کے ایک سو چودہ سوروں میں ایک سو تیرہ سورے چھوڑ دیئے جائیں تو نماز ہو جائے گی۔ لیکن ایک سورہ ایسا ہے کہ اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو نماز نہیں ہو سکتی ہے۔ واجب نمازوں کا قانون یہ ہے کہ سورۂ حمد کے علاوہ بھی ایک سورہ پڑھا جائے۔ نماز سُنّتی آپ پڑھ رہے ہیں تو خالی ایک سورۂ حمد پڑھنے کے بعد بھی رکوع میں جا سکتے ہیں، نماز صحیح ہو جائے گی۔ چاہے دن کی نماز ہو یا نماز شب ہو۔ کوئی نماز کتنی ہی باعظمت ہو، کتنی ہی عظیم اور کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو، اگر آپ چاہیں تو پہلی دو رکعت میں صرف سورۂ حمد پڑھ کر رکوع میں جا سکتے ہیں، آپ کی نماز مکمل ہو جائے گی۔ لیکن اگر آپ چاہیں کہ سورۂ حمد نہ پڑھیں اور نماز ہو جائے، تو نہ کوئی واجب نماز ہو سکتی ہے اور نہ کوئی سُنّتی نماز ہو سکتی ہے۔

تو مسلمان کے لیے نماز واجب اور نماز کے لیے سورہ حمد واجب۔ اب جو بندہ نے سورہ حمد شروع کیا تو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ذکرِ خدا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ذکرِ خدا ہے۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ توصیفِ خدا ہے۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ عظمتِ خدا ہے۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اس میں دو باتیں جمع ہو گئی ہیں۔ خدا کی عظمت کا اعلان بھی ہے کہ تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور اپنی کمزوری کا احساس بھی ہے کہ تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ جب یہ سارے مرحلے ختم ہو گئے تو اب شروع ہوتی ہے دعا۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ پروردگار ہمیں صراطِ مستقیم چاہیے، سیدھا راستہ چاہیے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک مسلمان، مسلمان رہے گا اس دعا سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ مسلمان ہے تو نماز نہیں چھوڑ سکتا ہے اور نماز پڑھے گا تو سورہ حمد نہیں چھوڑ سکتا ہے۔ اور سورہ حمد پڑھے گا تو یہ آیت نہیں چھوڑ سکتا ہے۔ لہٰذا ہر دعا سے مسلمان بے نیاز ہو سکتا ہے مگر صراطِ مستقیم سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے۔

اب بات آگئی ہے تو ایک جملہ اور یاد رکھیے گا۔ صراطِ مستقیم کی دعا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ مسلمان ہونے کے بعد بھی صراطِ مستقیم سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے۔ تو صراطِ مستقیم ان کا راستہ ہے جن پر نعمتیں نازل ہوئی ہیں۔ یعنی جس طرح مسلمان سیدھے راستے سے بے نیاز نہیں ہے اسی طرح اُن بندوں سے بھی بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے جن پر نعمتیں نازل ہوئی ہیں اور اُن بندوں کی نفرت سے بھی بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے جو بہک گئے ہیں یا غضبِ خدا کے حقدار ہو گئے ہیں۔ صلوات

تو عزیزانِ محترم! مسلمان کی زندگی میں ایک دعا واجب ہے۔ اس کا جو بھی ترجمہ ہو صراطِ مستقیم دکھا دے یا ثابت قدم رکھ۔ بہرحال صراطِ مستقیم کی دعا واجب ہے اور اس کے بغیر مسلمان، مسلمان واقعی نہیں ہو سکتا ہے۔ تو جس دعا کو پروردگار نے واجب قرار دیا ہے اس سے پہلے دعا کے آداب بھی بتا دیئے ہیں اور دعا کی حقیقت بھی سمجھا دی ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے پہلے بندے نے دو جملے استعمال کیے ہیں۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ پروردگار ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں۔ یعنی سجدے

کے قابل تنہا تو ہے، عبادت کے لائق تنہا تو ہے۔ وایاک نستعین اور تجھ سے بھیک مانگنا ہمارا کام ہے۔ ہاتھ پھیلانا ہمارا کام ہے۔ مدد مانگنا ہمارا کام ہے۔ اور جب یہ دو باتیں کہہ دیں تب دعا کی، تاکہ حقیقت دُعا معلوم ہو جائے کہ دعا کی جاتی ہے دو حقیقتوں کے اظہار کے لئے۔ مالک کی عظمت کا اقرار ہو جائے اور اپنی ذلّت کا احساس ہو جائے۔

مالک کی عظمت کا اقرار اور اپنی ذلت و کمزوری کا احساس انھیں دونوں کے مجموعہ کا نام ہے دُعا۔ اس کے بغیر کوئی دُعا نہیں ہے۔ جو خدا کی عظمتوں کا قائل نہ ہو اسکی دُعا مہمل ہے، دُعا نہیں ہے اور جو اپنی ذلّت کا قائل نہ ہو اُس کی دعا خالی ایک لقلقۂ لسان ہے اور کچھ نہیں ہے۔ دُعا کی حقیقت ہے مالک کی عظمت کا اقرار اور بندے کی اپنی کمزوری کا احساس۔ یہی وجہ ہے کہ جو خاصانِ خدا اس نکتہ کو جانتے تھے وہ اس کی عظمت کو بھی مانتے تھے اور اپنی کمزوری کو بھی جانتے تھے۔ ان کو کوئی ضرورت ہو یا نہ ہو مگر دُعا کے لئے ہمیشہ ہاتھ اٹھائے رہتے تھے۔ کوئی پوچھے کہ آپ کیا مانگ رہے ہیں سارے خزانے تو آپ کے قبضہ میں ہیں۔ آپ کے قبضہ میں عرش اعظم ہے، جہاں تک آپ مع نعلین کے چلے جاتے ہیں۔ آپ جنّت کے بانٹنے والے ہیں۔ آپ جہنم سے بچانے والے ہیں۔ آپ کو خدا نے کائنات کا علم دیا ہے۔ اس نے آپ کو باکمال بنا کر بھیجا ہے تو پھر آپ کیا مانگ رہے ہیں۔ کہا کوئی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم یہ محسوس کرو کہ ایسے ہونے کے بعد بھی ہمیں اس کی عظمت کا بھی احساس ہے اور اپنی کمزوری کا بھی احساس ہے۔ رَبِّ زِدْنِی عِلْماً۔ صلوات

بس عزیزانِ محترم! ان دو لفظوں کو یاد رکھئے گا کہ دعا درحقیقت نام ہے احساس عظمتِ پروردگار اور احساس ذلّت بندگان خدا کا۔ ہر انسان کو احساس رہے کہ ہم کمزور ہیں اور ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہ زبان جس سے ہم بولتے ہیں چاہے دُعا کریں یا نہ کریں بہرحال یہ زبان بھی اُسی کی دی ہوئی ہے۔ یہ طاقتیں جن کے غرور نے دعاؤں سے بے نیاز بنا دیا ہے یہ طاقتیں بھی اُسی کی دی ہوئی ہیں، اپنا کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ احساس ہر انسان میں ہونا چاہئے کہ ہم ذاتی طور پر کمزور ہیں۔ صاحب کمال،

صاحب طاقت، صاحب کبریائی، صاحب عظمت صرف پروردگار ہے۔ وہ تنہا حی ہے وہ تنہا قیوم ہے۔ باقی سب اسی کے کرم سے قائم ہیں۔ سب اسی کی مہربانیوں سے زندہ ہیں۔ کسی کی حیات اپنی نہیں ہے۔ کسی کا قیام اپنا نہیں ہے۔

یہ مختصر سی تمہید حقیقتِ دعا کے بارے میں اب اس کے بعد ایک جملہ اور گذارش کرنا ہے۔

فقہ کی ہر کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ نمازی اگر حالتِ نماز میں کسی سے بات کرے تو اس کی نماز کلام کرنے سے باطل ہو جاتی ہے۔ سب جانتے ہیں اور اتنا مسئلہ تو ماشاء اللہ بچوں کو بھی معلوم ہے کہ ایک لفظ بھی اگر آپ نے کسی بندے سے بات کر لی تو آپ کی نماز گئی۔ یہ اجازت آپ کو نہیں دی گئی کہ حالتِ نماز میں کوئی ایک لفظ استعمال کریں جس کے کوئی معنی ہوں۔ لیکن اگر بندہ بندوں کے بارے میں بات کرے تو کوئی حرج نہیں ہے اس لئے کہ بات خدا سے ہو رہی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی نماز کا کمال یونہی ظاہر ہوتا ہے کہ کہے بندے کے بارے میں مگر خدا سے کہے۔

یہ صلوات کیا ہے۔ کیا بندے سے خدا کے بارے میں کچھ کہا گیا ہے۔ نہیں۔ خدا سے کہتے ہیں بندوں کے بارے میں۔ خدایا! محمدؐ و آلِ محمدؐ پر رحمت نازل فرما۔ تو بات بندوں کے بارے میں ہو رہی ہے مگر چونکہ خدا سے ہو رہی ہے لہٰذا یہی صلوات معراجِ نماز بن جاتی ہے۔

بعض بیچارے مسئلہ نہیں جانتے ہیں تو کہتے ہیں کہ نماز میں ہر جگہ لکھا ہوا ہے سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ وَبِحَمْدِہٖ۔ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی وَبِحَمْدِہٖ۔ صلوات کہیں نہیں لکھی ہے دینیات کی کتاب میں۔ یعنی اگر آپ نے دینیات پڑھ لی ہے تو گویا آپ قابل ہو گئے ہیں اور صلوات پڑھ لی تو آپ کی نماز چلی گئی۔ نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ صلوات دُعا ہے اور جب تک بندہ خدا سے باتیں کرتا رہے گا کوئی حرج نہیں ہے۔ مثال کے طور پر میں نماز پڑھ رہا ہوں، مجھے آپ سے کوئی کام ہے اور آپ کہیں جانا چاہتے ہیں۔ تو میں اگر حالتِ نماز میں آدھا لفظ بھی کہہ دوں کہ ذرا ٹھہر جائیے۔ یا لفظ "ذرا" بھی کم کر دیا

صرف ٹھہر جائیے۔ یا لفظ "جائیے" بھی نکال دیا جس سے وہ سمجھے کہ ہمیں روکنا چاہتے ہیں تو نماز گئی کہ اگر پونے چار رکعت پڑھنے کے بعد بھی تشہد میں یہ حادثہ پیش آگیا تو بھی اتنی دیر کی ساری محنت برباد ہو گئی اور نماز باطل ہو گئی۔ لیکن اگر بندہ نے دُعا کے لئے ہاتھ اٹھا دئے اور کہا خدایا! اس بندے کے دل میں ڈال دے کہ اتنی دیر تک ٹھہرا رہے جب تک میری نماز ختم ہو جائے۔ تو اتنی لمبی عبارت ہو گئی لیکن نماز کہیں نہیں گئی۔ اس لئے کہ نماز خدا کی بارگاہ میں حاضری ہے۔ خدا کے سامنے کھڑے ہو کر جب تک خدا سے باتیں کرتا رہے گا نماز اُدھر جاتی رہے گی اور جب مڑ کے بندوں سے باتیں شروع کر دے گا تو نماز غارت ہو کر رہ جائے گی۔ صلوات

تو کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حقائق کے اظہار کے لئے زبان دعا استعمال کیجاتی ہے کہ مجھے آپ کو روکنا ہے لیکن میں آپ سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں خدا سے کہہ رہا ہوں۔ آپ نے سُن لیا کام ہو گیا۔ آپ نے میری دُعا کو سُن لیا آپ ٹھہر گئے۔ میں سمجھا کہ الحمد للہ میری دعا قبول ہو گئی کہ آپ ٹھہر گئے۔ تو لہجہ ہے دعا کا لیکن مقصد ہے کچھ اور بلند تر۔

آلِ محمدؐ کی دعائیں ہماری جیسی دعائیں نہیں ہیں کہ جب کوئی غرض ہوئی خدا کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔ اُن کی دعاؤں کی بے شمار مصلحتیں ہیں۔ وہ بندوں کو عقائد وحقائق سے باخبر کرنا چاہتے ہیں مگر حالات کا تقاضہ نہیں ہے کہ براہ راست کہہ سکیں۔ تو لہجے کو بدل دیتے ہیں تاکہ کوئی بُرا نہ مانے اور ہر ایک سُن لے۔ کبھی تو ہوش آئے گا تو ان دعاؤں سے فائدہ اٹھائے گا۔

اگر آپ نے اس نکتہ کو پہچان لیا ہے تو اب ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں جو انشاءاللہ یاد رہ جائے گا۔

ہماری تاریخ میں ایک دَور میں دو علیؑ دیکھنے میں آئے۔

ایک دادا، ایک پوتا۔

اور جب دونوں کی تاریخ پڑھی تو دادا کو پہچانا گیا ان کے خطبوں سے اور پوتے

کو پہچانا گیا ان کی دعاؤں سے۔

نہج البلاغہ پڑھئے تو مولائے کائنات کے خطبے ہیں اور صحیفۂ سجادیہ پڑھئے تو امام سجادؑ کی دعائیں ہیں۔ اُن کی عظمتوں کو خطبوں سے پہچانا۔ اِن کی جلالتوں کو دعاؤں سے پہچانا۔

آخر ایسا کیوں ہوا؟

شاید راز یہ ہے کہ خطبہ اور دعاؤں میں ایک بنیادی فرق ہوتا ہے کہ خطبہ بندوں کے سامنے ہوتا ہے اور دعا خدا کے سامنے ہوتی ہے۔ تو جب تک حالات سازگار رہتے ہیں اور سُننے والے مل جاتے ہیں حقیقتوں کو سمجھانے کے لئے خطبہ کا سہارا لیا جاتا ہے اور جب دنیا الگ ہو جاتی ہے تو حقیقت کو پہچنوانے کے لئے دعاؤں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ صلوات

یوں تو ہماری تاریخ امامت میں چار علیؑ ہیں، مگر میں نے دو ہی کا حوالہ دیا ہے جہاں درمیان میں صرف ایک پُشت کا فاصلہ ہے کہ وہ دادا ہیں اور یہ پوتے، اور دونوں کی تاریخ حیات اس انداز سے ہمارے سامنے آئی ہے کہ حقائق وہی ہیں۔ مولائے کائناتؑ کے خطبے پڑھیں اور معرفت پروردگار کے مضامین دیکھیں اور امام سجادؑ کی دعائیں پڑھیں اور وہی معرفت کے مضامین دیکھیں۔ مولائے کائناتؑ کے خطبوں میں وہی نصیحتیں ہیں اور امام سجادؑ کی دعاؤں میں بھی وہی نصیحتیں ہیں۔

'مکارم الاخلاق' کوئی خطبہ تو نہیں ہے۔ میں اشارہ کر رہا ہوں تاکہ آپ جاکے پڑھیں۔ الحمد للہ اب تو 'مفاتیح الجنان' اردو میں بھی موجود ہے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مکارم الاخلاق امام سجادؑ کی دعا ہے لیکن ہے کیا؟۔ مکارم الاخلاق' اول سے آخر تک خالی اخلاقیات کی تعلیم ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ بات اگر خطبہ میں کہی جاتی تو یہ کہا جاتا کہ یہ کام کرو اور وہ کام نہ کرو۔ اِس سے بچو اور اُس سے مت بچو۔ اسے چھوڑو اور اُسے مت چھوڑو۔ لیکن جب یہ بات دعا کی شکل میں آئی کہ خدایا! اِس سے بچانا۔ اُس سے بچانا۔ اس سے محفوظ رکھنا۔ یہ کام نہ ہونے پائے۔ وہ کام

نہ ہونے پائے تو مقصد یہ ہے کہ بندے اچھائیاں اور بُرائیاں پہچان لیں۔ اب اگر حالات سازگار نہیں ہیں اور لوگ بعنوان ناصح مجھ سے نہیں سننا چاہتے ہیں تو میں اپنے خدا سے کہوں گا تاکہ بات بندوں کے لئے محفوظ رہ جائے۔ صلوات

جلدی جلدی ایک جملہ اور سُن لیں تاکہ میں اس منزل تمہید سے گذر جاؤں اور جو باتیں گذارش کرنا ہیں امام حسین علیہ السلام کی دعاؤں سے متعلق، انھیں کچھ گذارش کرسکوں اور آپ اُن دعاؤں کی عظمتوں کا احساس کرسکیں۔

ایک منزل درمیان ہیں جو روزانہ صبح وشام ہماری زندگی میں آتی رہتی ہے کہ بندوں کو ایک یہی شکایت رہ جاتی ہے کہ ہم دعا کرتے ہیں اور خدا قبول نہیں کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر میں دعاؤں کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہم مانگیں اور وہ دیدے۔ اب اگر ہم مانگیں اور وہ دیدے تو گویا سارا کام مکمل ہوگیا۔ حالانکہ دعا کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ انسان کو عظمتِ خدا کا احساس پیدا ہو۔ اور دوسری بنیاد یہ ہے کہ اسے اپنی کمزوری کا احساس پیدا ہو۔ اور سب سے بڑا شرف دعا کا یہ ہے کہ دعا اس منزل کا نام ہے، جہاں بندہ خدا سے بات کر رہا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہم کو تو بڑے آدمی سے بات کرنا بھی نصیب نہیں ہوتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ فلاں سفیر سے ایک منٹ بات کرنے کا موقع مل جائے مگر زندگی ختم ہوجاتی ہے اور موقع نہیں ملتا ہے۔ فلاں سیٹھ صاحب سے ایک لمحہ بات کرنے کا موقع مل جائے۔ وہ ٹائم نہیں دیتے ہیں۔ ہم حسرتیں لے کے چلے جاتے ہیں یعنی بڑے آدمی یا بڑی شخصیت یا بڑی ہستی سے بات کرنے کا موقع مل جانا، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اگر آدمی اُسے بڑا سمجھتا ہے اور ہر کمزور میں ہر چھوٹے میں یہ تمنا رہتی ہے کہ اپنے بڑے سے دو منٹ بات کرنے کا موقع مل جائے اور بڑوں کی مجبوریاں ہوتی ہیں کہ وہ ایک لمحہ کا وقت بھی نہیں دے سکتے ہیں۔ میں نے کہیں یہ بات گذارش کی تھی اس کو دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن بات کی وضاحت کے لئے عرض کر رہا ہوں کہ ہر جگہ عوام کو یہ شکایت رہتی ہے کہ سربراہ سے، وزراء سے، سفراء سے ملاقات کا موقع نہیں ملتا ہے۔ حالانکہ یہ بیچارے

یہ نہیں سوچتے ہیں کہ جس ملک میں مثلاً ایک کروڑ کی آبادی ہے۔ اگر سربراہ مملکت اپنے عوام میں سب سے ایک ایک منٹ بات کرنا چاہے اور ہر ایک کو ایک منٹ کا موقع دے تو کل کتنے منٹ چاہئیں۔ ایک کروڑ منٹ۔ اب گھر جا کے جوڑیے گا اور حساب لگا کے بتائیے گا کہ ایک کروڑ منٹ میں کتنے گھنٹے ہوں گے، کتنے ہفتے ہوں گے، کتنے مہینے ہوں گے اور پھر بھی سب نکلیں گے شکایت کرتے ہوئے کہ ہم ابھی کہنے بھی نہیں پائے تھے کہ نکال دئے گئے۔ یہ تو ایک ایک منٹ کا حال ہے پھر اگر پانچ پانچ منٹ کا وقت دے دیا جائے تو قیامت ہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر بڑے انسان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ لوگوں کو بات کرنے کا ٹائم نہیں دے سکتا ہے کہ عمر محدود ہے۔ امکانات محدود ہیں۔ وہ لاکھ کوشش کرے مگر نہیں کر سکتا ہے۔ اور چھوٹوں میں یہ حسرت بہر حال رہ جائے گی کہ کسی بڑے سے ایک منٹ بات کرنے کا موقع مل جاتا۔

تو عزیزو! اگر سب میں یہ حسرت ہے اور ہر بڑے کی یہ مجبوری ہے کہ ٹائم نہیں دے سکتا ہے تو اسلام متوجہ کر رہا ہے کہ تم نے کس کو بڑا سمجھ لیا؟ سرمایہ دار کو بڑا سمجھ لیا؟ رئیس کو بڑا سمجھ لیا؟ — پھر اللہ اکبر کیوں کہا تھا؟ اگر یہی سب بڑے تھے تو نعرۂ اللہ اکبر کی کیا ضرورت تھی؟ — اب اگر اللہ اکبر کہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سب سے بڑا وہ ہے، اور ایسا بڑا ہے جو کسی کو حسرت سے مرنے نہیں دے گا۔ ارے منٹوں اور گھنٹوں کا کیا ذکر ہے۔ تم دن بھر کھڑے رہو۔ رات بھر آواز دیتے رہو وہ کبھی نہ منع کرے گا کہ بس اب تھک گئے اب نہ سنیں گے۔

دعا اس شرف کا نام ہے جہاں بندوں کو مالک سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے اور اس سے بڑا شرف انسان کی زندگی میں کوئی نہیں ہے، اگر انسان واقعاً خدا کی بڑائی اور اس کی عظمت کو پہچانتا ہے۔

اب یہاں تک آنے کے بعد ایک جملہ اور گذارش کر دوں۔ آج کے دور میں بچوں کا سمجھانا بہت آسان ہو گیا ہے۔ اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ سائنس کی ترقی نے لوگوں کو لامذہب بنا دیا ہے، حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ان ترقیات نے کتنے حقائق

کو پہنچوانے کے لئے بہترین وسیلہ فراہم کر دیا ہے کہ ہمارے بچّے اگر نہیں سمجھتے ہیں تو سمجھ سکے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمیں کسی بڑے سے بات کرنا ہے تو کیسے بات کریں۔ وہ یہاں رہتے نہیں اور ہم ان کے یہاں جا نہیں سکتے ہیں۔ تو کہا کوئی بات نہیں ہے، ہزار بارہ سو درہم خرچ کر کے چھوٹا سا آلہ خرید لیجیے، وہ بھی متحرک چلتا پھرتا۔ یہ بھی نہیں کہ کہیں میز پر رکھا ہوا ہے، یا کسی کرسی پر رکھا ہوا ہے۔ بلکہ آپ کی جیب میں ہے، آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ امریکہ میں کسی آدمی سے بات کریں۔ انڈیا میں پاکستان میں۔ چین میں۔ جاپان میں۔ کہیں بھی کسی سے بات کرنا چاہتے ہیں یہ آلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بس جیسے ہی آپ نے نمبر ڈائل کیا وہاں گھنٹی بجی اور باتیں شروع ہوگئیں۔ کہاں بولنے والا۔ کہاں سُننے والا؟ مگر باتیں ہو رہی ہیں۔ وہ کہہ رہا ہے، یہ سُن رہے ہیں۔ یہ کہہ رہے ہیں وہ سُن رہا ہے۔ دیکھئے سائنس نے ہم کو کہاں پہونچا دیا کہ یہاں والے کا رابطہ وہاں والے سے ہوگیا۔ اِس نے اپنی بات سُنا دی، اُس نے اپنا جواب سُنا دیا۔ یہ سارا کاروبار چل رہا ہے یا نہیں؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں والے کا رابطہ وہاں والے سے ہو سکتا ہے۔ درمیان میں کوئی آلہ چاہیے، درمیان میں کوئی وسیلہ چاہئے۔ دنیاداری میں اُس وسیلہ کا نام ہے موبائل۔ مذہب میں اس وسیلہ کا نام ہے دُعا۔ جیسے ہی تم نے ہاتھ پھیلایا مالک سے باتیں شروع ہوگئیں۔ مگر شرط یہی ہے کہ جس سے بات کرنا ہے اُسی کا نمبر ڈائل کیجیے گا۔ ورنہ بات کرنا چاہتے ہیں کسی اور سے، نمبر کسی اور کا ڈائل کر دیا ہے تو باتیں برباد ہو جائیں گی۔ اور اگر کسی اور نے ٹیلی فون اٹھالیا تو دو چار باتیں بھی سُننے میں آجائیں گی کہ دماغ خراب ہوگیا ہے۔ بارہ بجے رات کو تم نے کیوں ٹیلی فون کیا، ابھی پولیس کو اطلاع کرتے ہیں۔

اتنا بڑا ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ نمبر غلط ڈائل ہوگیا ہے۔ بات کرنا ہے کسی اور سے، نمبر ڈائل کر دیا کسی اور کا۔

اسلام بھی یہی سمجھاتا ہے کہ اگر خدا سے مانگنا ہے تو پھر خدا ہی سے کہنا ہے، یہ نہیں کہ نگاہ کسی اور کی جیب پر ہے، کسی اور کی سفارش پر ہے اور کہہ رہے ہیں

خدا سے۔ یہ سب وہ رانگ نمبر والے ہیں کہ جن کی دعا کبھی قبول ہونے والی نہیں ہے اور پروردگار پلٹ کے پوچھ سکتا ہے کہ ہم سے مانگا کس دن تھا۔ ہمارا خیال آیا کس دن تھا۔ تم تو کسی اور سے مانگنا چاہتے تھے، ہم کو صرف ذریعہ بنایا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ یہ کائنات ہمارے لئے ذریعہ بنے۔ تم نے کائنات کے لئے ہم کو ذریعہ بنا دیا۔ اتنی بڑی ذلّت تو ہم برداشت بھی نہیں کر سکتے ہیں، لہٰذا پہلے بات صحیح کرو پھر دیکھو ہم سنتے ہیں یا نہیں، ہم قبول کرتے ہیں یا نہیں۔

اور جس طرح سے ہمیں اپنی آواز پہونچانے کے لئے کوئی ذریعہ چاہیے، بڑی سے بڑی شخصیت بھی اگر عوام تک اپنی آواز پہونچانا چاہے تو ریڈیو کا ذریعہ چاہیے، ٹی۔وی کا ذریعہ چاہیے۔ کوئی شخص بھی اگر اپنی آواز دوسروں تک پہونچانا چاہتا ہے تو ٹیلی فون چاہیے، موبائل چاہیے۔ بغیر وسیلہ کے کسی کی بات کسی تک نہیں پہونچ سکتی ہے۔ آپ کھڑے ہو گئے ریڈیو اسٹیشن پر تقریر کرنے کے واسطے تاکہ عوام آپ کا پیغام سنیں۔ اس غریب کے گھر میں ریڈیو ہے ہی نہیں تو فائدہ کیا ہوگا۔ آپ نے موبائل خرید لیا ہے اور جس سے بات کرنا چاہتے ہیں اس کے گھر میں ٹیلی فون ہے ہی نہیں، تو آپ کی محنت برباد ہو جائے گی۔ یعنی جس کے ذریعہ سے بات کرنا چاہتے ہیں اس کا ایک کنکشن اگر اِدھر ہو تو ایک کنکشن اُدھر بھی ہونا چاہیے، ورنہ بات وہاں تک نہ پہونچ سکے گی۔

اب اگر خدا سے بات کرنا چاہتے ہو تو وہاں بھی ایسے وسائل تلاش کرو جن کا تعلق اِدھر بھی ہو، اُدھر بھی ہو تاکہ کم سے کم بات پہونچ تو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم نے انھیں وسیلہ بنایا ہے جو اُدھر والے تھے اور اِدھر اسی لئے بھیجے گئے تھے کہ اِدھر کی باتوں کو اُدھر پہونچا دیں، جیسے اُدھر کا پیغام یہاں لائے تھے۔ صلوات

بس عزیزانِ محترم! اس سے زیادہ وقت نہیں صرف کر سکتا، ورنہ بات نامکمل رہ جائے گی۔ دعاؤں کی دنیا میں دو دعائیں ہیں۔ انتہائی مفصل اور انتہائی عظیم

ظاہر ہے کہ میں کسی دعا کے بارے میں کیا عرض کر سکتا ہوں میں کیا اور میری تعریف کیا؟ وہ بھی کلام معصوم کے بارے میں میرے آپ کے بیان کی کیا حقیقت ہے۔ کلام معصوم کو خالی سمجھ لیں یہی ہماری عظمت کے لئے بہت کافی ہے ہم اس پر کیا تبصرہ کریں گے اور کیا اس کی تعریف کریں گے۔ لیکن بہرحال علماء کے بیانات کی روشنی میں اور مطالعات کی روشنی میں دو دعائیں ہیں، جو دعاؤں کی دنیا میں عظیم ترین دعائیں ہیں، اور مفصل دعائیں ہیں جن میں دنیا کے سارے مضامین جو انسانی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں وہ سب سمو دئے گئے ہیں جمع کر دئے گئے ہیں۔ ایک دعا ہے باپ کی اور ایک دعا ہے بیٹے کی۔ آپ "نقوشِ عصمت" پڑھ لیجئے الحمد للہ کہ اس میں دونوں دعاؤں کا ترجمہ موجود ہے۔ ترجمہ سے کچھ تو مضمون دعا کا اندازہ آپ کو ہو جائے گا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ترجمہ کسی حقیقت کو سمجھا نہیں سکتا ہے۔ ترجمہ میری اوقات کے مطابق ہے اور دعا معصوم کی حیثیت کے مطابق ہے۔ لیکن بہرحال کچھ نہ کچھ تو اندازہ ہو ہی جاتا ہے۔

ایک دعا ہے باپ کی اور ایک دعا ہے بیٹے کی۔ ایک دعا ہے ٹھیک دوپہر میں، ایک دعا ہے آدھی رات میں۔ یہ زوالِ آفتاب کے بعد، وہ نصف شب کے بعد۔ جو دُعا باپ نے کی ہے وہ میدانِ عرفات میں دعائے عرفہ ہے اور جو دُعا بیٹے نے آدھی رات کے بعد کی ہے وہ دعائے ابو حمزہ ہے سحر کے ہنگام میں۔ اور جب دونوں دعاؤں کو آپ پڑھیں گے اور دونوں کے لہجے کو آپ دیکھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ معصوم کے لہجے میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا ہے، چاہے وہ آدھی رات میں ہو چاہے دوپہر کا وقت ہو۔ وہ ہمارے لہجے ہیں جو وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے بیانات ہیں جو وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں، مگر معصومین کے بیانات اور ان کے ارشادات میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا ہے۔ وہ سحر کے ہنگام بھی اپنے خدا سے ویسے ہی باتیں کر رہے ہیں جیسے کہ دوپہر کے وقت اپنے پروردگار کی بارگاہ میں گذارشات پیش کرتے ہیں۔

امام حسینؑ کی دعائے عرفہ اور امام سجادؑ کی دعائے سحر جس کو دعائے ابو حمزہ

کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل ابوحمزہ کی دعا نہیں ہے، یہ تو ابوحمزہ کا شرف ہے کہ امامؑ نے ان کو یہ دعا بتا دی اور فقط بتا نہیں دی بلکہ دے دی اور یہ شرف بھی صرف دو بندوں کو حاصل ہوا ہے۔ ایک جناب کمیل کو اور ایک جناب ابوحمزہ کو کہ مولاؑ نے کمیل کو جو پڑھا دیا وہ دعائے کمیل ہے اور امام سجادؑ نے جو ابوحمزہ کو سکھا دیا وہ دعائے ابوحمزہ ہے۔ نہ اِس کا کمیل سے کوئی تعلق ہے اور نہ اُس کا ابوحمزہ سے کوئی تعلق ہے۔

یہ تو آلِ محمد کا کرم ہے جو دولتِ دنیا تک محدود نہیں ہے۔ جو لینا چاہو دولتِ دنیا لے جاؤ، دولتِ عقبیٰ لے جاؤ۔

اب آیئے اسی دعائے عرفہ کے چند فقرے سُن لیجئے۔ تین طرح کی باتیں ہیں، تین حصے ہیں جو اس دعائے عرفہ کے اندر پائے جاتے ہیں۔

ایک حصے کا تعلق معرفت پروردگار سے ہے۔ ہم نے خدا کو کیسے پہچانا۔ ہر کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ زمین کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کا کوئی خالق ہے۔ آسمان کو دیکھا تو معلوم ہوا اس کا کوئی مالک ہے۔ یہی مخلوقات ہیں جن کے ذریعہ خالق کو پہچانا جاتا ہے۔ کہ جب یہ کائنات ہے تو کوئی بنانے والا ضرور ہوگا۔ جب یہ دنیا ہے تو کوئی پیدا کرنے والا ضرور ہوگا۔ لیکن امام حسینؑ بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے ہیں کہ پروردگار اگرچہ بندوں کے واسطے اور ان کی اوقات کے لئے یہی ایک ذریعہ ہے کہ مخلوقات کے ذریعہ خالق کو پہچانیں مگر مشکل یہ ہے کہ بندہ جتنا مخلوقات میں غور کرتا چلا جاتا ہے، اتنا ہی تجھ سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ آپ محسوس کر سکیں تو عجیب بات فرمائی ہے، اس کو ایک چھوٹی سی مثال سے واضح کر دوں تو بات جلدی واضح ہو جائے گی۔

سڑک پر کھڑے ہوئے تھے، ہائی وے پڑا اور دیکھا کہ ایک گاڑی گذر گئی سامنے سے دو سو میل کی اسپیڈ سے۔ جیسے ہی ہم نے تیز رفتار گاڑی کو دیکھا۔ پوچھا یہ کہ کس کی بنی ہوئی ہے۔ یعنی پہلا خیال آیا بنانے والے کا، اور جب اس کے بعد

گاڑی رُک گئی اور گئے اسے دیکھنے کے واسطے کہ یہ کیسی گاڑی بنائی گئی ہے جو دو سو میل کی اسپیڈ سے چلتی ہے۔ تو کبھی گیئر دیکھ رہے ہیں، کبھی اسٹیرنگ دیکھ رہے ہیں، کبھی پہیے دیکھ رہے ہیں، کبھی ٹائر دیکھ رہے ہیں، کبھی باڈی دیکھ رہے ہیں۔ یہ سب دیکھتے چلے جا رہے ہیں اور جو بنانے والا ہے وہ ذہن سے نکلتا جا رہا ہے۔

خدایا! تو نے کہا ان کے ذریعہ ہم کو پہچانو۔ ہم تو اگر انھیں میں گم ہو گئے تو تجھ سے غافل ہو جائیں گے۔ لہٰذا اگر اِدھر بھیجا ہے تو اتنا کرم اور کر دے کہ ہم کائنات کو دیکھیں مگر تو کھینچ کے اپنی بارگاہ تک پہونچا دے۔ صلوات

ورنہ ہم سب اگر اِدھر چلے آئے تو اِدھر ہی کے ہو کے رہ جائیں گے اور تجھ سے غافل ہو جائیں گے۔ لہٰذا مالک تو ہی ہم کو پھر اپنی بارگاہ میں بلا لینا کہ اس کائنات کو فقط ذریعہ سمجھیں۔ یہ مقصد نہ بننے پائے کہ یہیں گم ہو کے رہ جائیں۔ کتنی سچی بات کہی ہے کہنے والے نے اور سمجھدار آدمی نے کہی ہے، یہی مومن اور کافر میں ہوتا ہے:

کافر کی نظر وہ ہے جو آفاق میں گم ہو
مومن کی نظر وہ ہے کہ گم جس میں ہوں آفاق

مومن یہیں کھو کر نہیں رہ جاتا ہے۔ مومن پردہ کے پیچھے اس کائنات کے مالک کو بھی دیکھتا ہے اور جو یہیں گم ہو کے رہ جاتا ہے وہ کفر کی نگاہ رکھتا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ پہچنوانے والے کی شان یہ ہے کہ وہ اس سے زیادہ واضح ہو جس کے پہچاننے کا ذریعہ بنایا گیا ہے ورنہ تعارف کا کام نامکمل رہ جائے گا۔ مثال کے طور پر ہمارے تعلقات ایک صاحب سے ہیں۔ ہم ان کے باپ کو نہیں جانتے ہیں اگرچہ باپ بزرگ ہیں مگر جیسے ہی سامنے آئے کسی نے کہا یہ فلاں کے والد ہیں۔ تو کیا یہ بڑے ہیں اور وہ چھوٹے ہیں؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ پھر یہ کیوں کہا کہ یہ انکے والد ہیں۔ اس لئے کہ ہم بچے کو جانتے ہیں باپ کو نہیں پہچانتے ہیں۔ تو جو زیادہ نمایاں تھا اس کے ذریعہ اس کو پہچانا جاتا ہے جو نمایاں نہیں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایک آدمی

کو ہم جانتے ہیں اور ان کے بیٹے کو ہم نہیں جانتے ہیں۔ تو جب صاحبزادے کا تعارف ہوا تو کہا گیا یہ فلاں کے بیٹے ہیں۔ اس لئے کہ ہم پر وہ نمایاں ہیں یہ نمایاں نہیں ہیں۔ تو گویا پہچاننے کا مزاج یہ ہے کہ جو زیادہ نمایاں ہوتا ہے اُسے ذریعہ بنایا جاتا ہے اس کو پہچاننے کے لئے جو واضح نہ ہو۔

خدایا! کیا تجھ سے زیادہ بھی کوئی واضح ہے؟ کیا تجھ سے زیادہ کسی کا وجود نمایاں ہے کہ اس کو تیرے واسطے ذریعہ بنایا جائے؟ ہر شے میں تو تیرا ہی جلوہ ہے۔ تیرے علاوہ کون ہے جو پہچنوائے گا؟ صلوات

یہ حقیقتیں وہ ہیں جن کو معصوم کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے۔ لہٰذا امام حسینؑ نے فیصلہ سُنایا کہ جو آنکھ تجھے اپنا نگراں نہ دیکھے وہ آنکھ اندھی ہے اور جس کو مخلوقات دکھائی دے اور تو نہ دکھائی دے وہ آنکھ اندھی ہے اور اس انسان کو زندگی میں سوائے گھاٹے کے کچھ نہیں ملا ہے جس کو تو نے اپنی محبت کا کوئی حصہ نہیں دیا ہے۔ دولت لے کے کیا کرے گا۔ کرسی لے کے کیا کرے گا۔ اقتدار لے کے کیا کرے گا اگر دولتِ محبتِ پروردگار نہ ملے۔

یہ ایک حصہ ہے جو حصۂ معرفت ہے اب اس کا ایک آخری فقرہ سُن لیجئے اور شائد بات یہیں تمام بھی ہو جائے۔

خدایا! میں تو ایک بات جانتا ہوں کہ جس نے تجھے کھو دیا اس نے پایا کیا، اور جس نے تجھے پالیا اس نے کھویا کیا؟

شاعری کی دنیا میں ایک لفظ کہا جاتا ہے کہ شعر کا کمال یہ ہے کہ ایک مصرع پڑھا جائے تو دوسرا مصرع خود سمجھ میں آجائے۔ لیکن یہ حقائق کی دنیا ہے جملہ خود بول رہا ہے پروردگار! جس نے تجھے کھو دیا اس نے پایا کیا۔ اور جس نے تجھے پالیا اُس نے کھویا کیا۔ صلوات

یہ درسِ معرفت ہے جو امام حسینؑ نے دیا ہے مگر یہ بشکل درس نہیں ہے اور نہ کوئی خطبہ ہے۔ یہ دعا ہے جو خدا کی بارگاہ میں ہو رہی ہے، درسِ معرفت بھی ہے

اور بندگی کا اظہار بھی ہے۔

اب اس کے بعد پروردگارِ عالم سے مانگنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ ایک طریقہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب خدا سے مانگو تو پہلے خدا کے کرم کا حوالہ دو، کہ کسی سے کچھ لینے کے واسطے ان احسانات کا حوالہ دو جو اس سے پہلے وہ کر چکا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کو کسی کارِ خیر کے لئے چندہ لینا ہے، تو آپ کہیں گے کہ دیکھئے آپ کے پاس اس لئے آئے ہیں کہ ہم نے سنا ہے کہ فلاں مسجد میں آپ نے ایک ہزار دیا تھا۔ فلاں مدرسہ میں آپ نے دو ہزار روپیہ دیا تھا۔ فلاں امام بارگاہ میں چار ہزار روپیہ دیا تھا۔ تو ہم بھی غریب ایک مسجد بنانا چاہتے ہیں۔ پانچ سو ہی دید یجئے۔ نتیجہ کیا ہوگا وہ سمجھے گا کہ انھیں ہمارے کرم پر بھروسہ ہے۔ اگر نہیں بھی دینے کا ارادہ ہے تو اتنے حوالوں کے بعد کچھ نہ کچھ ضرور دیدے گا۔

آیئے اب امام حسینؑ کی دعا سنئے:

"اے وہ پروردگار، جس نے قافلہ کو یوسفؑ کے لئے روک دیا۔ یوسفؑ کنویں میں پڑے ہوئے تھے، قافلہ کا گذر ہوگیا۔ قافلہ گذر گیا ہوتا تو یوسفؑ کنویں میں پڑے رہ جاتے۔ لیکن قافلہ کو پانی کا خیال آیا اور وہ ٹھہر گیا۔ آدمیوں نے ڈول کو ڈالا تو پانی کے ساتھ دیکھا کہ ایک بچہ بھی باہر آگیا۔"

یہ کرم پروردگار ہی تو تھا کہ قافلہ والوں کے دل میں پانی کا احساس پیدا کر دیا۔

"اے وہ پروردگار، جس نے قافلہ کو صحرا میں روک دیا تاکہ تیرا یوسفؑ کنویں سے باہر نکل آئے۔ اور اتنا ہی نہیں کیا بلکہ اس کے بعد جب یوسف بازار میں بک گئے تو پھر ایک نیا وسیلہ پیدا کیا۔ کہ یا تو غلاموں کی طرح بک رہے تھے یا عزیزِ مصر ہو گئے۔ تیرے کرم کو کیا کہا جائے جو موت کے کنویں سے نکال کر تختِ اقتدار تک پہونچا دیتا ہے۔"

اس کے بعد دوسرا فقرہ:

"اے یوسفؑ کو یعقوبؑ تک پلٹانے والے! ۔ تو تو وہ ہے جو مایوسوں کے لئے رحمتوں کا انتظام کرتا ہے۔ تیری تاریخ کرم کتنی قدیم تاریخ ہے۔ کون ایسا ہے جو تیرا

ممنونِ کرم نہیں ہے۔

اے وہ پروردگار کہ جس نے ابراہیمؑ کا امتحان لیا۔ لیکن جیسے ہی گلے پر چھری رکھی تو نے ہی ہاتھ پکڑ لیا کہ بیٹے کو ذبح نہ کرنے پائیں۔ خود ہی امتحان بھی لیا، خود ہی روک بھی لیا۔ یہ تیرا کرم ہی تو ہے ورنہ اگر چھری چل گئی ہوتی تو اسماعیل کی زندگی کا کوئی امکان نہیں تھا۔"

ان تمام نعمتوں کا حوالہ دینے کے بعد اب امام حسینؑ عرض مدعا کرتے ہیں۔ یعنی دعا کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ عظمتِ خدا کو پہچانو، اس کا اقرار کرو۔ اور پھر دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اس کے پرانے کرم کا حوالہ دو، اس کے بعد اس کی بارگاہ میں دُعا کرو تاکہ تمہاری دعائیں دعا کیے جانے کے قابل ہو جائیں اور پھر قبول کیے جانے کے لائق ہو جائیں ورنہ خالی غرض پڑی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ اس کا نام نہ دعا ہے اور نہ طلب ہے۔ یہ صرف زبان کی ایک حرکت ہے جس کی کوئی قدر و قیمت نہ دین میں ہے اور نہ دنیا میں ہے۔

یہ ایک مختصر سا خلاصہ تھا جو میں نے دعائے امام حسین علیہ السلام کے بارے میں عرض کر دیا ہے اور باقی کچھ باتیں ہیں جو انشاء اللہ کل کے موضوع کے ذیل میں گذارش کروں گا، کہ جو ادبِ دعا جانتے ہیں وہی دُعا بھی کرنا جانتے ہیں اور انھیں کی دُعا اس قابل ہوتی ہے کہ پروردگار اس دعا کو قبول کرلے۔

یہ امام حسینؑ کی دُعا کا صرف ایک خاکہ تھا جو میں نے آپ کے سامنے عرض کر دیا ہے اور اس گذارش کے ساتھ کہ جائیے پوری دعا پڑھیے تاکہ وہ سلیقہ ہمارے آپ کے ہاتھ میں آجائے جو دعاؤں کا ہوا کرتا ہے۔ اور اب میں بیان کو آخری منزل تک لے جا رہا ہوں یہ کہہ کر کہ جو بندہ ایسا مستجاب الدعوات ہو، اور ایسا سلیقۂ دعا جانتا ہو جس کی دعا خدا کبھی رد نہ کرتا ہو۔ وہ اگر دعا کر دیتا کہ فرات کا پانی بے شیر کے جھولے کے پاس آجائے تو کیا پانی نہ آجاتا؟۔ یقیناً آجاتا۔ تو پھر جن کے پاس دعاؤں کا ایسا حربہ اور ایسا وسیلہ موجود

زحمتیں، برداشت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اتنی مشقتیں، برداشت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ مگر نہیں امام حسینؑ نے فرمایا کہ میں سلیقۂ دعا جانتا ہوں۔ لہٰذا یہ جانتا ہوں کہ کونسی جگہ منزلِ دعا ہے اور کونسا موقع منزلِ امتحان ہے۔ ہم جب منزلِ امتحان میں آتے ہیں تو قربانیاں دیتے ہیں، جانیں دیتے ہیں، اولاد قربان کرتے ہیں، مصیبتیں برداشت کرتے ہیں اور درمیان میں دعا کو نہیں لاتے ہیں اور اگر دعا کرتے ہیں تو ایک ہی دعا کرتے ہیں کہ خدایا! ہمارے قدموں میں لغزش نہ ہونے پائے۔ پروردگار صبر کے ساتھ یہ منزلِ امتحان بھی طے ہو جائے اور واقعاً اللہ کے وہ بندے کہ جن کی ہر دعا قابلِ قبول تھی انھوں نے یونہی اس منزلِ امتحان کو سر کیا ہے اور اگر کوئی دعا کی ہے تو فقط ایک ہی دعا کی ہے کہ خدایا! صبر و ثبات عطا فرما۔ ہم یہ نہیں چاہتے ہیں کہ تلواریں کند ہو جائیں، یہ نہیں چاہتے ہیں کہ نیزوں کا رُخ مڑ جائے، یہ چاہتے ہیں کہ سب کا رُخ ہماری طرف رہے لیکن تیری نگاہِ مہربانی بھی رہے اور اتنی قوتِ صبر دیدے کہ ہر مصیبت کا تنہا مقابلہ کر سکیں۔ اتنی قوتِ برداشت دیدے کہ ساری مصیبتوں کو برداشت کر لیں اور لغزش نہ پیدا ہونے پائے۔

بس یہی ایک تمنا، یہی ایک آرزو اور یہی ایک دعا ہے جو صبح سے عصر تک کربلا کے ہر مجاہد کی زبان پر رہی ہے یا اس کے دل میں رہی ہے۔ جس کے بےشمار ثبوت ہیں مگر اب کچھ بھی عرض کرنے کا موقع نہیں رہ گیا ہے۔

آج تذکرہ علمدار کربلا کا ہے جس کے پاس بازوؤں کی طاقت بھی ہے اور دعاؤں کی طاقت بھی ہے۔ مگر اللہ رے مجبوریِ مشیت کہ نہ بازوؤں کی طاقت کو استعمال کر سکتا ہے اور نہ بلاؤں کے ٹلنے کی دعا کر سکتا ہے۔ اس کا دل ایک ہی آواز دے رہا ہے، پروردگار! ہر منزلِ امتحان میں ثابت قدم رکھنا۔

کتنی مصیبتیں، برداشت کی ہیں کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔ جس کو حسینؑ نے سقّا بنایا ہو وہ تین دن سے، برابر یہ سُن رہا ہو اور یہ دیکھ رہا ہو کہ بچے پیاس سے جاں بلب ہیں اور جب سامنے سے علمدار کا گذر ہوتا ہے تو جو بچہ بھی دیکھ لیتا ہے

العطش۔العطش۔الماء۔الماء ہائے پانی۔ ہائے پانی۔ کیا گذر رہی ہے علمدار کے دل پر۔ کوئی اندازہ کر سکتا ہے۔ یہ اُسی کا دل جانتا ہے جس کے دل پر یہ مصیبت گذر رہی ہے۔ زخم کوئی چیز نہیں ہیں۔ وہ چوٹ جو علمدار کے دل پر لگتی ہے جب بچوں کی زبان سے سنتا ہے ہائے پانی۔ اَجْرُکُمْ عَلَی اللہِ

یہ پہلی منزلِ صبر ہے علمدار کربلا کی۔ اس کے بعد دوسری منزلِ صبر آئی جب وقت آگیا قربانیوں کا۔ تو آپ جانتے ہیں کہ پروردگار عالم نے مولائے کائنات کو جناب اُمّ البنین کے ذریعہ چار اولاد عنائت فرمائی تھی۔ عبداللہ، جعفر، عباس اور عثمان، جن کا نام مولائے کائناتؑ نے جناب عثمان بن مظعون کے نام پر رکھا تھا جو پیغمبرِ اسلامؐ کے جلیل القدر صحابی تھے۔

یہ تین بھائی ہیں عباسؑ علمدار کے۔ جب وقت آگیا قربانی کا اور دیکھا کہ بنی ہاشم کے جوان، بنی ہاشم کے بچے۔ بنی ہاشم کے شیر سب راہِ خدا میں قربان ہوئے جارہے ہیں، تو عباسؑ علمدار نے مولا سے اجازت طلب کی اور چاہا کہ پہلے اپنے بھائیوں کو میدان میں بھیج دیا جائے تاکہ یہ بھی ایک امتحان صبر ہو جائے۔

یہ تذکرہ اس لئے دو لفظوں میں گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ بہت سے ہمارے بچے اور ہمارے عزیز نوجوان ان شخصیتوں سے باخبر نہیں ہیں، اس لئے کہ ہمارے یہاں چند دن کے اندر تذکرہ اتنا محدود ہوتا ہے کہ نہ کوئی اصحاب کو جان سکتا ہے، نہ کوئی بنی ہاشم کے شیروں کے نام جان سکتا ہے، نہ ان کی قربانیوں کو جانتا ہے۔ انھیں باتوں کو نگاہ میں رکھ کے میں نے وہ نقشہ تیار کیا تھا جس میں تمام شہدائے کربلا، ان کے قبائل، ان کی قومیں اور ان سب کے نام جمع کر دیے گئے تھے اور میں نے اس کے پہلے بھی کہا تھا اور پھر کہہ رہا ہوں کہ چند درہم کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اس نقشہ کو لیجائیے، مگر بند کر کے صندوق میں نہ رکھیے گا، نگاہ کے سامنے رکھیے، پڑھتے رہیے تاکہ عشرۂ محرم میں ان شہیدوں کے نام تو سامنے آتے رہیں جنھوں نے راہِ حق میں قربانیاں دی ہیں۔ اور اگر نقشہ خریدنے

میں چند درہم خرچ کیجیے تو پھر اپنے بچوں کو تعلیم دیجیے اور جو بچہ یاد کر لے بہتر شہیدوں کے نام اسے بہتر درہم انعام بھی دیجیے تاکہ آپ کے بچے کم سے کم شہیدوں کے ناموں سے تو آشنا ہو جائیں۔ وہ سب جانیں قربان کر سکتے ہیں آپ اپنے بچوں کے لئے دس بیس درہم بھی نہیں قربان کر سکتے ہیں۔ کون سا بڑا کام ہے کم سے کم اتنی معرفت تو پیدا ہو جائے۔

بہر حال علمدار کے تین بھائی ہیں۔ آپ نے ایک ایک کو بلایا۔ پہلے چھوٹے بھائی کو بلایا اور کہا بھیا جاؤ قربان ہو جاؤ تاکہ میں یہ امتحان صبر بھی دے دوں۔ شیر آیا۔ علیؑ کا شیر ہے۔ میدان میں آیا۔ دادِ شجاعت دی۔ جب قربان ہو گیا تو شائد یہ بھی ایک مصلحت تھی علمدار کی کہ اپنے سامنے بھائیوں کو بھیج دیا جائے تاکہ میں اپنے صبر کا امتحان بھی دے دوں اور اگر لاشہ اٹھانے کا وقت آجائے تو مولا کو زحمت نہ ہونے پائے۔ میں ہی جا کے ایک ایک کے جنازہ کو بھی لے آؤں۔ ایک بھائی کو بھیجا وہ قربان ہو گیا تو اس کا لاشہ اٹھایا اور دوسرے کو بھیج دیا۔ وہ قربان ہو گیا تو اس کا بھی جنازہ اٹھایا۔ پھر تیسرے کو بھیجا وہ بھی راہِ حق میں کام آگیا تو اس کا بھی جنازہ اٹھایا اور جب سب کام آگئے تو کہا مولا اب میں ہی رہ گیا ہوں۔ آقا اب مجھے بھی مرنے کی اجازت دیدیجیے۔ حسینؑ نے عجب جملہ کہا جو مقتل والوں نے نقل کیا ہے۔ کہا عباسؑ تم کو کیسے جانے دوں، تم تو میرے علمدار ہو؟ تم میرے لشکر کے سردار ہو؟۔ میں نے مقتل میں ایک عجیب فقرہ دیکھا ہے کہ مولا نے فرمایا کہ تم تو جانتے ہو کہ سردار مارا جاتا ہے تو لشکر کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔

بس رونے والو آپ متوجہ رہیں، دو چار منٹ سے زیادہ گذارش نہیں کروں گا۔

جیسے ہی مولا نے کہا بھیا سردار مارا جاتا ہے تو لشکر کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ علمدار نے کچھ نہ کہا۔ داہنے دیکھا، بائیں دیکھا۔ آقا جس لشکر کا حوالہ دے رہے ہیں وہ لشکر ہے کہاں؟ سب تو راہِ خدا میں کام آچکے ہیں۔ اب مجھے اجازت دیدیجیے۔ جو روایت میں میں نے فقرہ دیکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شائد جب مولا نے اجازت

دینے میں تاخیر فرمائی تو عباسؑ نے خیمہ کا رُخ کیا۔ شائد مقصد یہ رہا ہو کہ جا کے بہن سے گذارش کریں کہ جیسے شہزادی نے سب کو اجازت دلوائی ہے اس غلام کو بھی دلوا دیں۔ مگر جیسے ہی مڑ کے خیمہ کو دیکھا سامنے بچی آ گئی۔ العطش۔ عباسؑ کا دل تڑپ گیا۔ کہا مولا مرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ سُن رہے ہیں کہ بچی کیا کہہ رہی ہے۔ کہا اچھا بھیا اگر جانا چاہتے ہو تو جاؤ بچوں کے لئے پانی کا انتظام کرو۔ آواز دی بیٹی لاؤ مشکیزہ لے آؤ۔ حسینؑ کی لاڈلی خیمے کے اندر آئی مشکیزہ کو اٹھایا۔ لے کے چلی۔ بچے پیچھے پیچھے چلے۔ بی بی یہ مشکیزہ کہاں لئے جا رہی ہو؟ کہا بابا نے چچا سے فرمایا ہے پانی لانے کے لئے۔ اور میرا چچا اگر دریا پر گیا تو پانی ضرور لے آئے گا۔ بچو! مطمئن ہو جاؤ۔ بس اب تمھاری پیاس کا سلسلہ ختم ہو رہا ہے۔ اب العطش کی آواز بلند نہ ہوگی۔ اب میرا چچا جا رہا ہے۔

مشکیزہ لا کے عباسؑ کے حوالہ کیا۔ آئے مولا کو سلام کیا۔ لے کے چلے۔ چار ہزار کا پہرہ فرات پر۔ اور غازی کے سامنے جنگ کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ کیسے فوجوں کو ہٹایا۔ کیسے فرات تک پہونچے۔ گھوڑا فرات میں ڈالا۔ مشکیزہ کو تر کیا۔ چلو میں پانی لیا۔ ظالمو! پہچانو۔ عباسؑ بے بس نہیں ہے مگر پانی نہیں پی سکتا ہے اس لئے کہ بچی پیاسی ہے۔ سکینہؑ انتظار کر رہی ہے۔ مشکیزہ کو بھرا۔ لے کے چلے۔ عباسؑ کی مصیبت بھی عجب مصیبت ہے۔ میں چاہتا تھا اس مصیبت کا ذکر اسی وقت کرتا مگر شائد اب وقت نہیں ہے، انشاء اللہ کل جمعہ کی مجلس میں گذارش کروں گا۔ دیکھئے کربلا کے شہیدوں کے غم میں اور دنیا کے ہر شہید کے غم میں ایک فرق پایا جاتا ہے۔ دنیا میں جب کسی شہید کا ذکر آتا ہے تو شہید کے مصائب کا ذکر آتا ہے۔ کربلا کے شہید وہ ہیں کہ جن میں تنہا انسان کے ایک وجود کا ذکر نہیں ہے۔ وجود کے ایک ایک جز پر نگاہ ڈالئے تو ایک نئی مصیبت سامنے آتی ہے۔ ہاتھوں کی مصیبت الگ۔ پیروں کی مصیبت الگ۔ سر کی مصیبت الگ۔ آنکھوں کی مصیبت الگ۔ کربلا میں کتنی مصیبتیں اکٹھا ہو گئی تھیں اور ایک عباسؑ جن پر یہ سارے مصائب گذر گئے۔ سُنو سُنو! بس یہیں مجلس

تمام کروں گا۔ عجیب منزل مصیبت ہے۔ عباسؑ چلے۔ داہنا شانہ کٹ گیا۔ کوئی پرواہ نہیں ہے۔ چند قدم آگے بڑھے۔ ایک ظالم نے وار کیا بایاں شانہ کٹ گیا۔ کوئی پرواہ نہیں ہے۔ گھوڑے کو اور آگے بڑھایا تاکہ جلدی خیمے تک پانی پہونچ جائے۔ آگے بڑھتے چلے جارہے ہیں کہ چلتے چلتے ایک تیر آکے عباسؑ کی آنکھوں میں لگا۔ دشمن سکو گے عزیزو اور شائد اس کے آگے میں پڑھ بھی نہ سکوں گا۔ ایک تیر علمدار کی آنکھوں میں لگا۔ اب علمدار کو اک نئی پریشانی پیدا ہوگئی ہے۔ اگر آنکھوں نے ساتھ چھوڑ دیا تو کیسے فوجوں کو ہٹا کے خیمہ گاہ تک پہونچوں گا۔ ابھی اور آگے بڑھنا چاہتے تھے کہ ایک تیر آکے مشک سکینہؑ پر لگا۔ جیسے ہی پانی بہا، عباسؑ کا دل ٹوٹ گیا۔ ابھی تک رُخ خیمہ گاہ کی طرف تھا اب عباسؑ نے گھوڑے کا رُخ موڑ دیا۔ اب خیمہ گاہ میں جاکے کیا کروں گا۔ لیکن ابھی پشتِ فرس پر ہیں۔ اب کیا کریں خیمہ گاہ میں جانا نہیں ہے اس لئے کہ پانی نہیں رہ گیا ہے۔ مشک کا سارا پانی بہ گیا ہے۔ لیکن اب مصیبت یہ بھی ہے کہ یہ شانہ بھی کٹ چکا ہے اور وہ ہاتھ بھی قلم ہو چکا ہے۔ آنکھ میں تیر لگا ہوا ہے۔ تیر کو نکالیں تو کس طرح نکالیں۔ روایت میں ایک فقرہ پایا جاتا ہے کہ علمدار نے یہ چاہا کہ تیر نکل جائے تاکہ ظالموں سے مقابلہ کر سکیں۔ مگر کیسے نکالیں۔

عزیزو! آپ کے جسم میں ایک کانٹا بھی چبھ جائے تو ہاتھ ہی سے تو نکالا جائے گا۔ علمدار کیسے نکالے؟۔ روایت کا عجب فقرہ ہے کہ سر کو جھکایا تیر کو دونوں زانوؤں سے دبایا اور جیسے ہی سر جھکایا ویسے ہی ایک ظالم نے گرز لگا دیا۔ سر زخمی ہوا۔ علمدار خاک کربلا کی طرف چلا۔ آواز دی مولا! غلام کی خبر لیجیے۔ حسینؑ گرتے پڑتے مقتل میں آئے۔ اس وقت پہونچے جب علمدار کا جسم زخمی ہو چکا تھا۔ بیٹھے۔ سر اٹھا کے زانو پر رکھا۔ عباسؑ نے ہٹا لیا۔ حسینؑ نے کہا بھیا کیا میرے دیر سے آنے کا خیال ہے؟ کہا نہیں مولا میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میرا سر تو آپ کے زانو پر ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ کا سر کس کے زانو پر ہوگا؟۔ پھر کہا آقا میرے لاشہ کو خیمہ

یں سے جائے گا۔ لاشہ کو چھوڑا، پرچم کو سنبھالا۔ جیسے ہی پرچم درِ خیمہ کے قریب آیا۔ بچی نے خیمہ کا پردہ اٹھایا۔ بابا آئے چچا نہیں آئے۔ بابا، بابا میرے چچا کو کہاں چھوڑا۔ میں دیکھتی ہوں کہ چچا نے بڑی دیر لگائی۔ حسینؑ نے فرمایا۔ سکینہؑ! کیا چچا کا انتظار کر رہی ہو۔ بیٹی۔؟

کہا۔ بابا میں کیسے انتظار نہ کرتی۔ چچا نے مجھ سے پانی کا وعدہ کیا تھا اور میرا چچا بے وفا نہیں ہے۔

حسینؑ نے بچی کو کلیجہ سے لگالیا۔ سکینہؑ! اب چچا کا انتظار نہ کرنا بیٹی۔ تیرا چچا فرات کے کنارے شانے کٹا کر سو گیا۔

اب وہ آنکھیں چین سے سوئیں گی جو عباسؑ کی ہیبت سے نہ سوتی تھیں اور سیدانیاں جاگیں گی اور انہیں سونا نصیب نہ ہوگا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

نویں مجلس

"حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ خدا اس کو دوست رکھے
جو حسینؑ کو دوست رکھے"۔

سرکار دو عالمؐ کے اس ارشاد گرامی کی روشنی میں جو سلسلۂ کلام شب کی مجالس میں "عرفان حسینؑ" کے عنوان سے آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا۔ اسی سے متعلق چند باتیں اس مختصر سے وقت میں آپ کی خدمت میں اور گذارش کرنا ہیں۔ ان باتوں کا تعلق سرکار دو عالمؐ کے اس ارشاد گرامی کے دوسرے حصے سے ہے۔ "حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں" یہ حضورؐ کے ارشاد کا پہلا حصہ ہے۔ دوسرا حصہ ہے "اَحَبَّ اللّٰہُ مَنْ اَحَبَّ حُسَیْنًا" یہ جملہ عربی قواعد کے اعتبار سے مقام خبر میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس خبر کو مقام دعا میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی اگر اس جملے کے ظاہری معنی دیکھے جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اس سے محبت کرتا ہے جو حسینؑ سے محبت کرتا ہے۔ اور اگر اس کے دوسرے رُخ کو دیکھا جائے تو یہ سرکارؐ کی دعا ہے مالک کی بارگاہ میں کہ خدایا جو حسینؑ سے محبت کرے تو اس سے محبت کرنا اور دونوں باتیں اپنے مقام پر برحق ہیں۔ اس لئے کہ پیغمبرؐ کو خدا نے یہ عظمت عنایت فرمائی ہے کہ پیغمبرؐ دعا بھی کریں تو آپ سمجھیں کہ یہ کام ہو چکا ہے۔ معصوم اور غیر معصوم کی دعا میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ غیر معصوم کی خبر تو معتبر ہو سکتی ہے مگر دُعا کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ دعا کا تعلق اللہ کی مصلحت سے ہوتا ہے۔ ہم تو وہی مانگتے ہیں جس میں اپنی مصلحت دیکھتے ہیں۔ مگر وہ وہی دیتا ہے جس میں ہماری مصلحت دیکھتا ہے۔ اگر دنیا کا بڑا انسان چھوٹے انسان کی خواہش

کا پابند نہیں ہوتا ہے تو مالک بندہ کی آرزو کا کس طرح پابند ہو سکتا ہے۔ بچہ لاکھ مچلتا رہے مگر کوئی ضروری نہیں ہے کہ باپ سے جو مانگ رہا ہے وہ باپ دے ہی دے۔ وہ لاکھ روتا رہے مگر کوئی ضروری نہیں ہے کہ ماں سے جو تقاضا کیا ہے وہ پورا ہی ہو جائے۔ اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ باپ کے دل سے بیٹے کی محبت نکل گئی ہے، یا ماں کے دل سے رحم کا جذبہ ختم ہو گیا ہے۔ نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ بچہ وہ مانگ رہا ہے جس میں وہ اپنی مصلحت دیکھتا ہے، وہ اپنا فائدہ سمجھتا ہے۔ ماں باپ کا علم بچہ سے زیادہ ہے۔ ان کے تجربات بچہ سے زیادہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ بچہ جو کچھ مانگ رہا ہے اس کی خواہش کے مطابق تو ہے مگر مصلحت کے مطابق نہیں ہے۔ اس کی آرزو تو ہے مگر اس میں اس کا فائدہ نہیں ہے بلکہ نقصان ہے۔ ایسے موقع پر اگر ماں باپ اپنی رحمدلی کا مظاہرہ کرنے کے واسطے بچہ کی خواہش کو پورا کر دیں اور بعد میں نقصان ہو جائے تو ہر آدمی یہی کہے گا کہ وہ بچہ تھا آپ تو بچہ نہیں تھے۔ وہ نادان تھا آپ تو نادان نہیں تھے۔ سردی کے زمانے میں اگر ٹھنڈا شربت دیکھ کر بچہ مچل جائے تو وہ یہی سمجھ رہا ہے کہ شربت، شربت ہوتا ہے، چاہے سردی کا زمانہ ہو چاہے گرمی کا زمانہ ہو۔ لیکن ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ سمجھیں کہ شربت کا موسم کون سا ہوتا ہے۔ کب شربت پلا دینا بچہ کے لئے مصلحت ہے اور کب شربت دے دینا بچہ کے لئے زہر ہے۔ اگر ماں باپ بچہ کی آرزو دیکھ کے اسے شدید سردی کے ماحول میں شربت دے دیں اور اسے نزلہ ہو جائے، زکام ہو جائے، سرسام ہو جائے، مر جائے تو بچہ سے کہنے والا کوئی نہ ہوگا۔ ہر شخص ماں باپ سے مطالبہ کرے گا کہ وہ نادان تھا، ناتجربہ کار تھا آپ تو سمجھ دار تھے۔ ہر ماں اور باپ کا یہ حق ہے کہ بچہ کی آرزو کو ٹھکرا دے۔ اس کی تمنا کو پورا نہ کرے کہ وہ نادان ہے۔ یہ نادان نہیں ہیں۔ اور کسی کو حق نہیں ہے کہ باپ کو بے رحم کہے یا ماں کو جلاد قرار دے۔ تو اگر مالک کائنات اپنے بندوں کی دعا قبول نہیں کرتا ہے تو کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ یہ کیسا رحمٰن ہے۔ یہ کیسا رحیم ہے۔ بلکہ تقاضائے رحمت یہی ہے کہ اگر نادان نادانی کر رہا ہے تو جاننے والا اس کی نادانی

کو قبول نہ کرے۔ اگر انسان جاہل ہو کر کوئی مطالبہ کر رہا ہے تو مالک اس کی دُعا کو قبول نہ کرے اور یہی مہربانی ہے اس لئے کہ بندہ کی کمزوری یہ ہے کہ وہ وہ بھی مانگ سکتا ہے جس میں نقصان ہو۔ لیکن مالک میں ایسی کوئی کمزوری نہیں ہے۔ یہیں سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کے نیک بندے اور معصومین کی دُعا خدا کیوں رَد نہیں کرتا ہے، ان کی ہر دُعا کیوں قبول ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ ہم مانگتے ہیں اپنے علم کے مطابق۔ ہم سمجھتے ہیں فائدہ اسی میں ہوگا۔ ہمیں کیا معلوم کل کیا ہونے والا ہے۔ کیا معلوم ایک ہفتہ کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ ہمیں کیا خبر کہ ایک سال بعد کیا ہونے والا ہے یا دس سال بعد کیا ہونے والا ہے۔ لہٰذا وہ مانگا جس کو آج فائدہ مند دیکھا۔ ممکن ہے وہی چیز ایک مہینہ کے بعد نقصان دہ ہو جائے، ایک سال بعد نقصان دہ ہو جائے۔ لیکن اگر خدا نے کسی کو اتنا علم دے دیا ہو کہ اب سے لے کر قیامت تک کے حالات کو دیکھ رہا ہو تو وہ جب تک قیامت تک کے مصالح کو دیکھ نہ لے گا اس وقت تک دعا کے لئے ہاتھ ہی نہ اٹھائے گا، یعنی مسئلہ قبولیت کا نہیں ہے، مسئلہ سلیقہ دعا کا ہے۔ صلوات

اللہ کے مخلص بندے مانگتے ہی وہ ہیں جو قابلِ قبول ہو۔ مانگتے ہی وہ ہیں جس میں مصلحت و منفعت ہو، لہٰذا ان کی دعا کے رَد ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا ہے۔ اور یہ بات وہ ہے جس کو تنہا آپ نے اور ہم نے نہیں پہچانا، بلکہ اس حقیقت کو دشمن بھی جانتے تھے۔ بس یہ پہچان لینے کی دیر تھی کہ یہ بندہ اللہ کا مقرب بندہ ہے اور اللہ اپنے مقرب بندوں کی دعا رَد نہیں کر سکتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو مباہلہ میں مومنین تو نہیں آئے تھے، مخلصین تو نہیں آئے تھے، نہ پیغمبرؐ کے ماننے والے آئے تھے، نہ اہلبیتؑ کے ماننے والے مومنین آئے تھے۔ سیدھے عیسائی، مسیحی، نصاریٰ اللہ کے دشمن، توحید کے دشمن۔ مگر وہ بھی یہی آواز دے رہے تھے کہ اگر یہ خدا سے کہہ دیں تو پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ سکتا ہے۔ یعنی دشمن کو بھی یہ اعتبار تھا کہ غنیمت اسی وقت تک ہے جب تک یہ دُعا نہ کریں۔ ورنہ اگر انھوں نے

منزل دعا میں قدم رکھ دیا تو ان کی دعا کے رد ہونے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اب یہ اندازہ ہوا کہ ہمارے یہاں سچے آدمی کی خبر کا تو اعتبار ہوتا ہے مگر دعا کا اعتبار نہیں ہوتا ہے۔ مگر جو معصومین ہیں ان کی دعا بھی معتبر ہے۔ ان کی خبر بھی معتبر ہے۔ اگر وہ ماضی کے بارے میں خبریں تو آپ سمجھیں یہ واقعہ صحیح ہے اور اگر مستقبل کے بارے میں دُعا کریں تو آپ سمجھیں کہ ایسا ہی ہونے والا ہے۔ اس لئے کہ ان کی دُعا رد نہیں ہوتی ہے۔ تو معصومینؑ کی زندگی میں خبر اور دعا میں فرق نہیں ہے۔ اگر یہاں تک آپ کے ذہن میرے ساتھ چلے ہیں تو ایک جملہ ضمناً گذارش کر کے اپنے موضوع کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ سرکار دو عالمؐ کی عظمت کا بہترین مرقع یہ ہے کہ جو پیغمبرؐ کے مقابلہ میں آئے۔ اگر تلواروں کا مقابلہ ہوا تو پیغمبرؐ نے تلوار نہیں چلائی، جنگ نہیں کی۔ لیکن اگر مقابلہ حرفوں کا ہوا، زبان سے ہوا تو مقابلہ خود پیغمبرؐ نے کیا ہے اس لئے کہ پیغمبرؐ تلوار نہیں چلا سکتا ہے بات تو کر ہی سکتا ہے۔ پیغمبرؐ ہتھیار نہیں اٹھا سکتا ہے گفتگو تو کر ہی سکتا ہے۔ پیغمبرؐ نے جو معرکے الفاظ کے ذریعہ سر کئے ہیں ان کے دو مواقع تھے۔ ایک مقابلہ مکہ میں ہوا کفار و مشرکین سے جہاں پیغمبرؐ وہ سب کچھ کہہ رہے تھے جو کفار کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ کہ ان بیچاروں کی اوقات یہ ہے کہ ٹھوکر میں پتھر آیا خدا ہو گیا۔ سامنے درخت کو دیکھا خدا بنا دیا۔ چاند ستارے کو دیکھا خدا کہہ دیا۔ بہتے ہوئے دریا کو خدا بنا دیا۔ سر بہ فلک پہاڑ کو خدا بنا دیا۔ جو ایسے خداؤں کا تصور رکھتے ہیں وہ اس سے بالاتر خدا کے بارے میں سوچنے کے قابل بھی نہیں ہیں۔ مگر پیغمبرؐ خبر لیکر آئے ہیں اس خدا کے بارے میں جو ان کے تصورات سے بالاتر ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے ہیں کہ کوئی خدا ایسا بھی ہوگا جو ہماری نظروں سے اوجھل ہوگا۔ کوئی خدا ایسا بھی ہوگا جو ہمارے دماغوں میں نہیں آئے گا۔ کوئی خدا ایسا بھی ہوگا جہاں تک ہماری رسائی نہ ہوگی۔ مگر پیغمبرؐ نے جو پہلا پیغام سُنایا وہ اس خدائے وحدہ لاشریک کے بارے میں تھا جو نہ نگاہ میں آیا ہے نہ آنے والا ہے، اور نہ اس کی ذات تک کسی کی فکر کی رسائی ہے۔ یہ بیچارے کفار و مشرکین کیا سمجھیں گے کہ اس کی عظمت کیا ہے۔ یہ پہلا مقابلہ پیغمبرؐ کا الفاظ کا مقابلہ تھا کہ وہ اپنے خدا کو خدا کہہ رہے تھے اور پیغمبرؐ اپنے خدا کو خدا کہہ رہے تھے۔ وہ اپنے نظام

کو نظام کہہ رہے تھے اور پیغمبرؐ اپنے قانون کو قانون کہہ رہے تھے۔ تیرہ سال تک یہ معرکہ جاری رہا مگر تلوار و ہتھیار کا استعمال نہیں ہوا۔ اور کوئی جھوٹا کہنے والا بھی نہیں پیدا ہوا اس کے معنی یہ ہیں کہ پیغمبرؐ مقام خبر میں اتنا اعتبار رکھتا تھا کہ جو دشمن خون کے پیاسے اور جان کے دشمن تھے وہ بھی پیغمبرؐ کو ہر خبر میں صادق اور سچا کہہ رہے تھے اس کے بعد مدینہ میں آ کے نبی نے الفاظ سے دوسرا مقابلہ مباہلہ کے میدان میں کیا۔ مگر یہاں مقابلہ خبروں کا نہیں تھا یہاں مقابلہ دعاؤں کا تھا۔ یہاں مسئلہ بد دعا کرنے کا تھا لیکن یہاں مقابلہ میں جو دشمن آیا وہ بھی یہ کہہ رہا تھا کہ یہ ایسے بندے ہیں اگر بد دعا کر دیں تو ان کی بد دعا رد نہ ہوگی۔ یعنی پیغمبرؐ نے تیرہ سال میں مکہ والوں سے یہ اقرار لے لیا کہ نبی خبر میں جھوٹا نہیں ہے۔ اور مدینہ میں آنے کے بعد اپنے مقابلہ میں آنے والے عیسائیوں سے یہ اقرار لے لیا کہ نبی دعا میں کمزور نہیں ہے۔ وہ کہتے تھے یہ جو کہے گا وہ سچ کہے گا۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ جو دعا کر دے گا وہ سچ ہو جائے گی۔ جب دونوں طرح کے دشمنوں نے خبر اور دعا دونوں کا اعتبار تسلیم کر لیا تو اب پیغمبرؐ نے ایک اعلان کیا جس اعلان میں دعا اور خبر دونوں کو جمع کر دیا "عَلِیٌّ مَعَ الْحَقِّ وَالْحَقُّ مَعَ عَلِیٍّ" علیؑ حق کے ساتھ ہے اور حق علیؑ کے ساتھ ہے۔ یہ ہے خبر۔ "اَللّٰھُمَّ اَدِرِ الْحَقَّ مَعَہٗ حَیْثُمَا دَارَ" خدایا حق کو اُدھر اُدھر موڑ دینا جدھر جدھر علیؑ مڑ رہے ہوں۔ یہ ہے دُعا۔ اب آپ بتائیے ان دونوں میں سے کس میں شک کیا جائے۔ یہ کہا جائے کہ نبی نے جو خبر دی ہے وہ خبر صحیح نہیں ہے۔ یا یہ کہا جائے کہ نبیؐ نے جو دُعا کی ہے کہ حق اُدھر جائے گا جدھر علیؑ جائیں گے۔ تو کبھی حق الگ بھی ہو جائے گا اسلئے کہ دعا کا اعتبار نہیں ہے۔ کیا کہا جائے۔ کہاں شک کیا جائے۔ کہاں شبہ کیا جائے۔ جہاں بھی شبہ کیا جائے شک کرنے والے کو اتنا سوچنا پڑے گا کہ اگر پہلے حصہ میں شک کیا تو مشرکین مکہ سے بدتر اور اگر دوسرے حصہ میں شک کیا تو نصارائے نجران سے بدتر۔ یہ کیسا مسلمان ہوگا جو نہ نصاریٰ جیسا رہ جائے گا، نہ مشرکوں جیسا رہ جائے گا۔ صلوات (نعرۂ حیدری، نعرۂ صلوات)۔

تو اگر مسلمان کو اپنے ایمان کا اعتبار بچانا ہے تو نبی کی خبر پر بھی ایمان لانا ہوگا،

اور نبیؐ کی دعا پر بھی ایمان لانا ہوگا۔ جب پیغمبرؐ نے کہہ دیا کہ علیؑ حق کے ساتھ ہے اور حق علیؑ کے ساتھ ہے تو سمجھو کہ ہے۔ اور جب پیغمبرؐ کہہ دیں کہ حق ادھر جائے گا جدھر علیؑ جائیں گے تو سمجھو کہ دعا مستجاب ہو گئی۔ یعنی جو پیغمبرؐ نے کہہ دیا وہ بہرحال ہونے والا ہے۔ تو جیسے منزلت علیؑ کو بیان کرنے کے لئے پیغمبرؐ نے دونوں لہجے اختیار فرمائے آدھا حصہ خبر کا "حق علیؑ کے ساتھ ہے اور علیؑ حق کے ساتھ ہے"۔ اور آدھا حصہ دعا کا "خدایا حق کو ادھر ادھر موڑ دے جدھر جدھر علیؑ جا رہے ہوں۔ اسی طرح جب عظمتِ حسینؑ کا اعلان کیا تو پیغمبرؐ نے وہی انداز اختیار کیا۔ ایک حصہ ہے خبر کا" اور وہ ہے "حسین مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں"۔ اور ایک حصہ دعا کا ہے "خدایا اس سے محبت کرنا جو حسینؑ سے محبت کرے"۔ قربان جائیے پیغمبرؐ کے۔ ہم تو ابھی عظمتِ حسین کا انتظار کر رہے تھے، پیغمبرؐ نے تو غلاموں کی عظمت کا بھی اعلان کر دیا۔ یعنی حسینؑ تو مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ تم بھی اگر چاہتے ہو کہ مجھ سے بن جاؤ تو حسینؑ سے محبت کرنا شروع کر دو۔ خدا تم سے خود ہی محبت کرنا شروع کر دے گا۔ صلوات

تو نہ پیغمبرؐ کی خبر غلط ہو سکتی ہے اور نہ پیغمبرؐ کی دعا رد ہو سکتی ہے۔ اگر حضورؐ نے کہہ دیا کہ حسینؑ مجھ سے ہے تو حسینؑ پیغمبرؐ سے ہیں۔ اور اگر حضورؐ نے ارشاد فرما دیا کہ میں حسینؑ سے ہوں تو پیغمبرؐ حسینؑ سے ہیں۔ اگر حضورؐ نے دعا کر دی خدا اس سے محبت کرے جو حسینؑ سے محبت کرے۔ تو ہر حسینؑ سے محبت کرنے والے کو یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ اگر میری محبت سچی ہے تو ہم محبوب خدا ہیں۔ خدا ہم سے محبت کر رہا ہے۔ اور اگر العیاذ باللہ خدا ہم سے محبت نہیں کر رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری محبت کمزور ہے جو ہمارے اور حسینؑ کے درمیان ہے۔ ورنہ وعدۂ الٰہی غلط نہیں ہو سکتا ہے۔ تو جس کو بھی اپنی محبوبیت میں شک و شبہ ہو، اُسے پہلے اپنی محبت میں شک کرنا چاہیئے۔ ورنہ اگر ہماری محبت مستحکم اور مضبوط ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ خدا ہم سے محبت نہ کرے۔ یعنی جس انسان کو محبوبیت پروردگار کا شرف حاصل کرنا ہے اسے حسینؑ سے قلبی محبت کرنا ہوگی۔ اور جو حسینؑ سے واقعی محبت کرے اسے یقین کرنا چاہیئے کہ پروردگار عالم اس سے

محبت کرتا ہے۔ اللہ نے اسے اپنا محبوب بنا لیا ہے۔ (اب چونکہ دُعا کا موضوع آگیا ہے لہٰذا ایک جملہ ضمناً عرض کرنا چاہتا ہوں جو فی الحال میرے موضوع میں شامل نہیں ہے) بعض روایات میں یہ مضمون بار بار مختلف شکلوں میں دُہرایا گیا ہے کہ پروردگارِ عالم اس بندہ سے سخت ناراض ہوتا ہے جو دعا کرتا جائے اور یہ سوچتا جائے کہ پتہ نہیں خدا سُنے گا یا نہیں؟ قبول کرے گا یا نہیں کرے گا؟ کیا پروردگار کی بارگاہ قدس کوئی دوکان ہے کہ جہاں بندہ تجربہ کرنے کے لئے آیا ہے۔ (میں نے ایک کتاب دیکھی دعا کے موضوع پر) ایک مفکرؔ نے بہت اچھی بات لکھی ہے کہ بعض بندے خدا کی بارگاہ میں جب دعا کرنے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو ان کا انداز بالکل وہی ہوتا ہے جیسے کسی سرمایہ دار تاجر کے آفس میں کوئی انکم ٹیکس آفیسر آجائے۔ آپ نے اتنا کمایا ہے اس میں سے پانچ پرسنٹ گورنمنٹ کا ہے۔ دس پرسنٹ گورنمنٹ کا ہے۔ پچاس پرسنٹ گورنمنٹ کا ہے۔ روپئے ابھی نکالئے۔ یہ بندہ خدا کی بارگاہ میں کھڑا ہوتا ہے تو اس کا لہجہ یہی ہوتا ہے کہ اتنا بڑا خزانہ آپ کے پاس ہے۔ اس میں سے دس پرسنٹ ہمارا بھی ہے۔ یعنی جیسے معلوم ہوتا ہے مالک نے کوئی دوکان کھولی ہے اور یہ کوئی آفیسر ہو گئے ہیں۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا ہے کہ یہ مانگنے والا ہے۔ یہ بھکاری ہے۔ یہ سائل ہے۔ یہ دُعا کرنے والا ہے۔ کتنا فرق ہے ان نااہل بے شعور انسانوں میں جو خدا کے سامنے اس لہجہ میں بات کرتے ہیں اور ان صاحبانِ شعور کے درمیان کہ جن کے پاس کل کائنات کا اختیار ہے مگر اس کے بعد بھی رات بھر ہاتھ پھیلائے کھڑے رہتے ہیں۔ کون سی چیز تھی جو پیغمبرؐ کو نہیں معلوم تھی۔ مگر خدا کے سامنے کھڑے ہوئے تو "رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا" پروردگار! میرے علم میں اضافہ کر دے۔ تاکہ ہر دیکھنے والے کو یہ اندازہ ہو جائے کہ جو مل رہا ہے وہ یہیں سے مل رہا ہے اور جو ملا ہے یہیں سے ملا ہے اور جو ملنے والا ہے وہ یہیں سے ملنے والا ہے۔ ہمارا کوئی حق خدا پر نہیں ہے جس حق کا مطالبہ کرنے کے لئے آئے ہیں۔ لہٰذا انسان کو اتنا شعور رہنا چاہیئے کہ بارگاہِ الٰہی کوئی تجربہ گاہ نہیں ہے کہ مانگ کے دیکھیں دیتا ہے یا نہیں دیتا ہے۔ جتنا آپ کو خدا پر اعتبار ہوگا اتنی ہی آپ کی دعا قبول ہوگی جب چاہیئے

تجربہ کر کے دیکھ لیجئے، جتنا ہی آپ کو پروردگار عالم کے رحم و کرم پر اعتبار ہوگا اتنی ہی آپ کی دعا قبول ہوگی۔ اور جب دعا قبول نہ ہو تو آپ سمجھ لیجئے کہ آپ کو خدا کے کرم پر اعتبار نہیں ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال عرض کر دوں اگرچہ میں یہ موضوع چھیڑنا نہیں چاہتا تھا مگر چونکہ بات آگئی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ یہ بات بھی آپ کے ذہن میں رہے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں پیسے کی ضرورت ہے۔ کس سے کہنے جائیں؟۔ ان سے کہیں تو عزت خطرہ میں ہے۔ ان سے کہیں تو مذاق اڑائیں گے۔ ان سے کہیں تو ٹال دیں گے۔ ان سے کہیں گے تو بہانے کر دیں گے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ پروردگار سے کہیں گے۔ کم سے کم راز، راز تو رہے گا۔ وہ کسی سے کہنے تو نہیں جائے گا کہ فلاں صاحب مانگنے کے لئے آئے تھے کپڑے تو بہت اچھے پہن کے رکھے ہیں مگر ہیں غریب۔ بنتے تو اپنی جگہ پر سیٹھ ہیں مگر ہیں فقیر۔ مجھ سے مانگنے کے لئے آئے تھے۔ ایک خدا ہی ہے جو کسی سے کہنے نہیں جاتا ہے اس لئے کہ سب سے بڑی صفت بندوں کے حق میں اس کا ستار العیوب ہونا ہے۔ وہ ہر ایک کے عیب پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ کوئی عیب، کوئی کمزوری ہو۔ ہر گناہ کو دیکھتا ہے۔ اسی لئے شیخ سعدی نے کہا تھا ہمسایہ اور خدا میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ ہمسایہ دیکھتا کچھ نہیں ہے مگر پروپیگنڈہ ہر جگہ کر دیتا ہے۔ خالی ماہ رمضان میں دس بجے دن میں گھر سے اٹھتا ہوا دھواں دیکھ لے سب کو خبر کر دے گا کہ اس گھر میں کوئی روزہ نہیں رکھتا ہے۔ یعنی کسی کو کھاتے نہیں دیکھا ہے خالی دھواں دیکھا ہے۔ دھویں کا مطلب یہ ہے کہ آگ ہے۔ آگ کے معنی یہ ہیں کہ کچھ پک رہا ہے۔ پکنے کے معنی یہ ہیں کہ کھائیں گے۔ کھانے کے معنی یہ ہیں کہ روزہ نہیں رکھا ہے۔ سارے مقدمات طے کر لئے اور ہر ایک کے کان میں جا کے کہہ دیا کہ بنتے بہت بڑے مومن ہیں مگر روزہ نہیں رکھتے ہیں۔ بھائی آپ نے دیکھا ہے کھاتے ہوئے؟۔ کہا یہ کیا ضروری ہے کہ ہر چیز دیکھے آدمی۔ بس دھواں دیکھ لیا کافی ہے۔ یہ ہمسایہ کا حال ہے کہ گھر سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھ کر ہر ایک کو خبر کر دیتا ہے کہ یہ روزہ نہیں رکھتا ہے اور ایک پروردگار ہے کہ آپ کہیں بھی چلے جائیے ماہ رمضان میں جتنا پانی چاہے پی لیجئے، جتنا دل چاہے پی لیجئے خدا کے اختیار میں ہے جو پیشانی پر ہزار لکیریں بنا سکتا ہے۔ ایک لکیر اور

بنا دیتا کہ یہ شربت پی کے نکلا ہے۔ کیا قدرت خدا سے بعید ہے؟ کیا خدا کی طاقت میں یہ نہیں ہے؟ کیا پروردگار کے اختیار میں نہیں ہے؟۔ اگر پروردگار اس انسان کے گھر سے نکلتے ہوئے پیشانی پر کسی زبان میں بھی، خالی ایک نشان بنا دیتا تو ریسرچ تو لوگ خود ہی کر لیتے کہ کیا لکھا ہے۔ ہر آدمی اس کی طرف اشارہ کرتا۔ بھائی کچھ ہے۔ یہ کیا کہیں ٹھوکر کھا گئے ہیں؟ گر گئے ہیں؟ کسی سے جھگڑا کیا ہے؟ کسی نے مارا ہے؟ کیا ہے؟ اب جو تحقیق ہوئی تو معلوم ہوا لکھا ہوا کسی زبان میں یہ بند کمرہ میں ماہ رمضان میں شربت پی کے نکلا ہے۔ آپ ایمان سے بتائیے یہ آدمی پورے سماج میں کہیں منھ دکھانے کے لائق رہ جاتا؟ پورے مسلمان معاشرہ میں کہیں منھ دکھانے کے لائق رہ جاتا؟ ایسا رجسٹرڈ مجرم کہ خدا نے پیشانی پر لکھ دیا ہے۔ یہ تو ایک جُرم کا حال ہے۔ ہمارے کتنے جُرم ہیں کہ جو تنہائیوں میں ہوتے ہیں، جو بند کمروں میں ہوتے ہیں، جو اکیلے میں ہوتے ہیں، جو صحراؤں میں ہوتے ہیں، جو بیابانوں میں ہوتے ہیں، جو اپنے محلہ سے باہر نکل کے ہوتے ہیں، جو اپنے گاؤں سے باہر جا کر ہوتے ہیں۔ کتنی خواتین ہیں جب یہاں سے پلٹ کے اپنے گاؤں پہونچ جاتی ہیں تو وہ حجاب کہ حجاب بھی شرما جائے اور اس کے بعد جب وہاں سے نکل کے امارات میں آگئیں تو اب یہاں تو اپنے گاؤں کا کوئی نہیں ہے، اپنے محلّے کا کوئی نہیں ہے۔ مکان بھی اس محلہ میں لیا ہے جہاں کوئی جان پہچان کا نہیں ہے۔ رہتی بھی اس فلیٹ میں ہیں جہاں کوئی جانتا ہی نہیں ہے، لہٰذا اب پردہ کس بات کا ہے۔ اللہ سے کوئی حجاب ہے نہیں۔ لیکن اگر پروردگار عالم نے یہ طریقہ طے کر دیا ہوتا کہ یہاں سے جو پلٹ کے چلیں اور نقاب پر نقاب دو چار اوڑھ کے نکلیں تو جیسے کپڑے پر چھپائی کا کام ہوتا ہے۔ پروردگار عالم نے ان کی پُشت پر کسی مَلک کو بھیج دیا کہ جا کر چھاپ دے کہ یہ ابوظبی کے بازار میں بے پردہ گھومتی تھیں۔ یہ مکّار ہیں۔ یہ یہاں خالی گاؤں والوں کو دکھانے کے واسطے اتنی مقدس بن کے آئی ہیں فرمائیے دوبارہ اپنے گاؤں جانے کا ارادہ کریں گی۔ ایک جُرم کو بھی پروردگار اگر بے نقاب کر دیتا تو معاشرہ میں کوئی منھ دکھانے کے لائق نہ رہ جاتا۔ اگر آج آپ اور ہم زندہ ہیں، آپ کے ہمارے تعلقات ہیں، ہماری آپ کی عزّت ہے، ہمارا

آپ کا احترام ہے، ہم کو آپ کو کوئی سلام کرتا ہے، ہمارا کوئی احترام کرتا ہے تو یہ سب نتیجہ نہ ہمارے کمال کا ہے، نہ ہمارے علم کا ہے، نہ ہمارے ایمان کا ہے، نہ ہمارے تقویٰ کا ہے۔ یہ سب نتیجہ ہے فقط اس بات کا کہ خدا، برائیوں پر پردہ ڈالے ہوئے ہے۔ ورنہ پروردگار اگر برائیوں کو بے نقاب کر دیتا تو دنیا کا کوئی انسان کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہ جاتا۔ ہم کیا جانیں کہ آپ کے دل میں ہماری محبت ہے یا نفرت۔ جیسے ہی آپ نے دور سے دیکھ کر سلام کر لیا ہم خوش ہو گئے۔ ماشاء اللہ سب مومنین ہمارے مخلصین ہیں۔ ہم نے بھی آپ کو دیکھا۔ کہئے خیریت تو ہے بچے کیسے ہیں، گھر والے کیسے ہیں؟ کہنے لگے کہ دیکھئے مولانا کو ہمارے سارے گھر والوں کی فکر ہے۔ کیا معلوم کہ سامنے پڑ گئے ہیں تو مجبوراً پوچھ لیا ہے، ورنہ شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ العیاذ باللہ۔ یہ سب کیوں ہے؟ آپ ہم سے خلوص رکھتے ہیں، ہم آپ سے خلوص رکھتے ہیں اس لئے کہ نہ آپ کو معلوم ہے کہ ہماری خیریت کیسی ہے نہ ہم کو معلوم ہے کہ آپ کا سلام کیسا ہے؟ یہ سب خداوند عالم کا کرم ہے کہ اس نے بندوں کے سارے حالات پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ ورنہ کیسے تعلقات اور کہاں کا معاشرہ اور کیسے لوگ اور کیسی عزت کچھ نہ رہ جاتا اگر پروردگار عالم کا یہ ایک کرم شاملِ حال نہ ہوتا تو وہ خدا جو اتنا مہربان ہے اس کے بارے میں انسان یہ بدگمانی کرے کہ نہیں سنتا ہے اور ہم مانگتے ہیں تو وہ نہیں دیتا ہے۔ تو پھر دینے والا کون ہے؟ ساری خرابی یہ ہے کہ ہم اس سے مانگتے ہی نہیں ہیں۔ ہم اس سے تقاضا ہی نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ جب ہر دروازہ کا تجربہ کر لیتے ہیں تو اس کی بارگاہ میں جاتے ہیں۔ پہلے لوگوں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں جب کوئی سہارا نہیں رہ جاتا ہے تب اس کی بارگاہ یاد آتی ہے لیکن روایات میں سیرت پیغمبرؐ میں تمام مورخین نے لکھا ہے کہ کُلَّمَا حَزَبَہٗ اَمْرٌ جب پیغمبرؐ کے سامنے کوئی مشکل مرحلہ آتا تھا تو نہ اصحاب، نہ انصار، نہ فلاں نہ فلاں۔ قَامَ اِلَی الصَّلٰوۃِ، سیدھے مصلے پر آ کر کھڑے ہو جاتے تھے تاکہ دنیا کو اندازہ ہو جائے کہ تم سب کے دروازے پر جا کر خدا کی بارگاہ میں آتے ہو اور ہم کسی کی پرواہ نہیں کرتے ہیں۔ ہم سے آتے ہیں اور خدا ...... تمہارا ہمارا یہ فرق ہونا بھی چاہئے اس لئے کہ تم سے

بڑے بڑے افراد پائے جاتے ہیں۔ بڑے طاقت والے، بڑے پیسے والے، بڑے عہدے والے۔ لیکن مجھ سے بڑا کوئی نہیں ہے۔ تو اگر میرے لئے کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے تو میں کس کو دیکھوں، سب تو مجھ سے کمزور ہیں۔ سب تو خود ہی میرے فقیر ہیں۔ میں اگر دیکھوں گا تو اسی کو دیکھوں گا جو میرا بھی خالق و مالک ہے۔ اب یہ اس کی شانِ کرم ہے کہ وہ کیسے دے گا۔ ہو سکتا ہے آسمان سے پیسے کی تھیلی برس پڑے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کہے خدیجہ کے دروازے پر جاؤ اور عقد کر لو۔ ہو سکتا ہے کوئی اور راستہ بتائے ـــ یہ تو اس کا کام ہے کہ کیا کہے گا۔ مانگنا ہمارا کام ہے دینا اس کا کام ہے۔ ہم اپنے سلیقہ سے مانگتے ہیں وہ اپنے طریقے سے دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں پیسے کی ضرورت ہو وہ عقدِ خدیجہ کا حکم دیدے۔ ہو سکتا ہے ہمیں مدد درکار ہو۔ وہ کہدے "نَادِ عَلِیًّا"۔ لفظ "نَادِ عَلِیًّا" علامت ہے کہ نبیؐ نے علیؑ کو نہیں پکارا ہے۔ خدا نے کہا ہے "نَادِ عَلِیًّا" تم علیؑ کو پکارو۔ اگر نبیؐ نے پکار لیا ہوتا تو برادری کا مسئلہ حل ہو جاتا۔ لیکن جب خدا نے حکم دیا ہے تو اب یہ معلوم ہوا کہ خدا جب کسی کی مشکلات کو حل کرنا چاہتا ہے تو علیؑ کو ذریعہ قرار دیتا ہے۔ صلوات

عزیزانِ محترم! میں اصل میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ پروردگارِ عالم اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ بندہ حسینؑ سے محبت کرے۔ اگر ہمیں شک ہے کہ ہم پروردگار کی بارگاہ میں محبوب ہیں کہ نہیں ہیں؟ تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ خدا نے پیغمبرؐ کی دعا کو رد کر دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں خود اپنی محبتِ حسینؑ پر اعتبار نہیں ہے کہ واقعتاً ہم ویسے ہی چاہنے والے ہیں جس کو محبت کرنے والا کہا جاتا ہے یا نہیں؟ ـ اور اس کی بے شمار مثالیں ہماری تاریخ میں پائی جاتی ہیں۔ اور آج کی بات نہیں روزِ اول سے جب فرزندِ رسولؐ مکہ سے نکل رہے تھے تو سب سے پہلے امام حسینؑ کی ملاقات فرزدق سے ہوئی۔ فرزدق مشہور شاعر جن کا قصیدہ آپ سنتے رہتے ہیں، امام زین العابدینؑ کی شان میں۔ امام سجادؑ کا ایسا شاعر جس کو قصیدہ پڑھنے کے جرم میں قید میں ڈال دیا گیا۔ سزا برداشت کی۔ مگر جو اعلانِ حق تھا وہ کر دیا۔ فرزدق سے ملاقات ہوئی۔ کہا فرزدق کہاں

سے آرہے ہو؟۔ کہا مولا عراق کی طرف سے آرہا ہوں۔ کہا بتاؤ عراق کے حالات کیا ہیں؟۔ کہا حالات بظاہر تو بہت اچھے ہیں۔ اٹھارہ ہزار یا چالیس ہزار آدمیوں نے مسلم کے ہاتھ پر بیعت کرلی ہے اور حالات کیا چاہئیں وہاں روز اوّل سے مولائے کائنات کی حکومت رہ چکی ہے۔ اب جو مسلم وہاں جائیں گے تو بیعت کا ایک سلسلہ قائم ہو جائے گا لہٰذا وہاں کے حالات کیا پوچھتے ہیں؟ فرمایا کہ حالات کی اچھائی کیا ہے؟ کہا قُلُوبُهُمْ مَعَكَ " سب کے دل آپ کے ساتھ ہیں۔ مگر مولا ایک بات اور بتادوں جب تک معاملہ دل کا ہے سب کے دل آپ کے ساتھ ہیں۔ سب آپ کے چاہنے والے، آپ کے والد بزرگوار کے چاہنے والے، آپ کے نانا کے چاہنے والے، آپ کے گھرانے کے چاہنے والے ہیں۔ لیکن سُیُوفُهُمْ عَلَيْكَ اگر تلوار اُٹھنے کا وقت آگیا تو تلواریں سب آپ کے خلاف ہی اُٹھیں گی۔ اب اس کے بعد آپ خود فیصلہ کریں کہ آپ جائیں گے یا نہیں جائیں گے؟ مگر جو بھی بات تھی وہ میں نے بتادی۔ کہ جب تک مسئلہ محبت کا ہے گا سب آپ کے ساتھ رہیں گے اور جب مسئلہ امتحان اور آزمائش کا آجائے گا تو قُلُوبُهُمْ مَعَكَ دل آپ کے ساتھ رہیں گے اور سُیُوفُهُمْ مَعَ بَنِي أُمَيَّةَ تلواریں سب بنی امیہ کے ساتھ ہوں گی۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض مورخین نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ تیس ہزار کم سے کم جو لشکر کربلا میں جمع ہوا تھا اس میں شام والے یا نہیں تھے یا نہ ہونے کے برابر تھے۔ نہ ایک ہزار کا لشکر شام سے آیا تھا نہ دو ہزار کا نہ چار ہزار کا۔ شام سے کوئی لشکر کربلا میں نہیں آیا تھا۔ تو یہ سب کہاں کے رہنے والے تھے۔ یہ سب کوفہ سے اکٹھا کئے گئے تھے۔ سوچئے جب تیسری خلافت کے بعد چوتھی خلافت تقسیم کردی گئی اور مولائے کائنات کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا گیا اور معاویہ بن ابی سفیان نے شام میں بغاوت کردی تو عالم اسلام دو حصوں میں بٹ گیا۔ شام آیا معاویہ کے حصہ میں اور کوفہ آیا مولاؑ کے حصہ میں۔ اور سنہ ھ تک مولاؑ کوفہ کے حاکم رہے۔ لیکن تنہا بیس سال کے اندر اتنا بڑا انقلاب آگیا کہ جس کوفہ میں علیؑ حاکم تھے اس کوفہ سے تیس ہزار فوجیں نکل آئیں، علیؑ کے بیٹے کو قتل کرنے کے لئے اور جس شام میں معاویہ حاکم تھا وہاں کا پانچ آدمی بھی نہ آئے حسینؑ کو قتل کرنے کے لئے۔ گویا ضرورت

ہی کیا ہے اپنے آدمیوں کو میدان میں بھیجنے کی۔ ضرورت ہی کیا ہے اپنے آدمیوں کو قربان کرنے کی، جب انھیں کے آدمی مارنے کے لئے تیار ہو جائیں، جب انھیں کے آدمی کٹنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ یہ وہی بات ہے جو فرزدق کہہ رہے تھے کہ دل سب آپ کے ساتھ ہیں لیکن اگر تلوار کا وقت آگیا یعنی مسئلہ امتحان کا آجائے گا تو ظاہر ہے کہ حالات بدل جائیں گے۔ یہ بات فرزدق نے مکہ میں کہی تھی اور کربلا میں قدم رکھنے کے بعد اس حقیقت کو امام حسینؑ نے اور واضح طور پر ارشاد فرمایا اَلنَّاسُ عَبِیْدُ الدُّنْیَا" میں خوب پہچانتا ہوں لوگوں کو، لوگ سب دنیا کے بندے ہیں۔ "وَالدِّیْنُ لَعِقٌ عَلٰی اَلْسِنَتِهِمْ" دین تو خالی زبانوں پر چڑھا ہوا ہے، کلمہ پڑھ رہے ہیں، محبت کا اعلان، مودت کا اظہار کر رہے ہیں۔ "یَحُوْطُوْنَهٗ مَادَرَّتْ مَعَایِشُهُمْ" جب تک معیشت چلتی رہے گی، جب تک کاروبار چلتا رہے گا، جب تک زندگانی چلتی رہے گی، پیسہ ملتا رہے گا۔ دین ہی دین رہے گا، مذہب ہی مذہب رہے گا۔ اللہ ہی اللہ، رسول ہی رسول۔ "فَاِذَا مُحِّصُوْا بِالْبَلَاءِ قَلَّ الدَّیَّانُوْنَ" جب آزمائش اور امتحان میں مبتلا کئے جائیں گے تو دیندار بہت تھوڑے نکلیں گے۔ وہ جس کو تلوار کہا تھا فرزدق نے، مولا نے اور واضح کر دیا کہ تلوار، تلوار نہیں ہے۔ اصل ہے بلاء۔ اصل ہے آزمائش۔ اصل ہے امتحان۔ جہاں انسان منزلِ امتحان میں آیا وہیں ساری دینداری بے حقیقت بن جاتی ہے۔ لٰہذا پیغمبرؐ کا اعلان اپنے مقام پر برحق ہے۔ وہ محبوب خدا ہے جو محبِ حسینؑ ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ محبتِ حسینؑ کوفہ میں نہیں آزمائی جائے گی۔ محبتِ حسینؑ کربلا میں نہیں آزمائی جائے گی محبتِ حسینؑ کا امتحان تلوار سے پہلے نہیں ہوگا۔ محبتِ حسینؑ کا امتحان تلواروں کے اُٹھ جانے کے بعد ہوگا۔ محبتِ حسینؑ کی آزمائش بغیر پیسے کے نہیں ہوگی۔ جب جیب سے پیسہ نکالنا ہوگا تب آزمائش ہوگی۔ محبتِ حسینؑ کی آزمائش دفتر کے باہر نہیں ہوگی، دفتر کے اندر ہوگی۔ محبتِ حسینؑ کا امتحان معاشرہ کے باہر صحرا میں نہیں ہوگا، معاشرہ کے اندر ہوگا۔ جب تعلقات خطرہ میں پڑیں گے، جب نوکری خطرہ میں پڑے گی،

جب پیسہ خطرہ میں پڑے گا، جب آرام خطرہ میں پڑے گا، جب تنخواہ خطرہ میں پڑے گی، جب حالات خطرہ میں پڑیں گے، تب یہ دیکھا جائے گا کہ اب کون حسینؑ کا چاہنے والا ہے۔ کوفہ والوں نے اگر ابن زیاد کو دیکھ کر مسلمؑ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا تو وہ بڑے نالائق تھے۔ جب کہ ابن زیاد جیسا جلّاد اپنے باپ کے زمانے سے پہچانا ہوا تھا۔ جیسا زیاد ویسا ابن زیاد۔ تو جس کو باپ دادا سے لوگ جانتے تھے کہ جلّاد ہے، خوں ریز ہے، بے رحم ہے، نالائق ہے۔ اس کے آنے کے بعد اگر کوفہ کے حالات بدل جائیں اور لوگ مسلم غریب کا ساتھ نہ دیں تو کون سی حیرت کی بات ہے۔ ابن زیاد تو بہت بڑا ظالم تھا۔ اگر چھوٹے سے چھوٹے ظلم کا دور سے احساس پیدا ہو جائے تو انسان کی زندگی میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ کل ہی اتفاق سے ایک مرد مومن سے کچھ عرب بچوں کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی، میں نے کہا کہنے میں تو سب اہلبیتؑ کے ہیں، سبھی خدا کے ہیں، سبھی رسولؐ کے ہیں۔ لیکن مقام آزمائش میں ہم آپ کتنے کامل ہیں خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اور اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ میں منبر پر آیا اور میں نے ایک مرد مومن سے کہا۔ آپ کی تنخواہ کتنی ہے؟ کہنے لگے ایک ہزار درہم۔ میں نے کہا کیا بُری بات ہے اگر آپ ایک سو درہم دے دیں راہ مولا میں۔ ایک ہزار میں سے ۱۰۰ سو دے دیا تو مر تو نہیں جائیں گے۔ قیامت تو نہیں آجائے گی۔ تھوڑا سا خرچ کم ہو جائے گا۔ روزانہ گوشت کھاتے تھے ایک دن نہ کھائیں گے۔ روز آنہ کوئی اچھی چیز کھاتے ہیں ایک دن نہ کھائیں گے۔ فلاں کام کرتے ہیں نہ کیجئے گا، ہو ہی جائے گا۔ جب میں نے آپ سے کہا آپ کے ذہن میں بات آگئی اور آپ ۱۰۰ سو دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ اسی وقت ایک آدمی نے ایک لاکھ کا چیک لا کے مجھے دیدیا۔ اسے میری بات پسند آگئی، میرا انداز پسند آگیا۔ ایک لاکھ کا چیک لا کہ مجھے دیدیا تو کیا فوراً میرے ذہن میں یہ خیال آ سکتا ہے کہ دس ہزار درہم مجھے بھی دیدینا چاہیئے؟ میں آپ کے بارے میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں میں تو ایک مثال دے رہا ہوں۔ میں تو اپنا تجزیہ کر رہا ہوں۔ آپ اپنا حساب لگائیے۔ اگر راہ مولاؑ میں کام کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے اور محبت حسین بن علی علیہما السلام کا تقاضا یہ ہے کہ ہزار میں سے ۱۰۰ سو دیدیئے جائیں تو میں کیا دشمن حسینؑ ہوں۔ میں کیا حسینؑ کو

نہیں پہچانتا ہوں۔ میں نے تو محبت پر آپ کو آمادہ کیا ہے تو کیوں ایک لاکھ آنے کے بعد فوراً میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ بغیر کسی کے کہے ہوئے مجھے دس ہزار دیدینا چاہیئے۔ معیار تو ایک معیار ہے، اگر یہ خیال پہلے لمحہ میں، پہلے سکنڈ میں میرے ذہن میں نہیں آیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مجھے مکاری کرنا آتی ہے، محبت کرنا نہیں آتی ہے۔ ورنہ محبت کا ایک معیار تھا۔ اس معیار پر اسے بھی پورا اترنا چاہیئے تھا اور اسی معیار پر مجھے کامل ہونا چاہیئے تھا۔ یہ میرے ذہن میں محبت کیوں نہیں آئی؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ مجھے محبت کرنا نہیں آتا، پیسے نکلوانا آتا ہے۔ لوگوں کو راہ خدا میں بھینٹ چڑھانا آتا ہے۔ لوگوں کو قربان کرنا آتا ہے قربان ہونا نہیں آتا ہے اور محبت قربان کرانے سے نہیں پہچانی جاتی ہے، قربان ہونے سے پہچانی جاتی ہے۔ واقعاً جو محبت کرنے والا ہے وہ خدا کا محبوب ہے بشرطیکہ محبت صادق ہو۔ اب صادق محبت کے مقابلہ میں کیا کیا چیزیں آتی ہیں کبھی پیسے کا مسئلہ آتا ہے، کبھی قرابتداری کا مسئلہ آتا ہے۔ ایک باپ کے دو بیٹے ہیں۔ ایک حقیقی ہے ایک سوتیلا۔ تو جتنی محبت اپنے حقیقی بھائی سے ہے، اتنی سوتیلے سے نہیں ہے، حالانکہ اسی کے باپ کا بیٹا ہے۔ تو یہ محبت میں کمزوری کیسے پیدا ہو گئی؟ فقط یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ یہ حقیقی نہیں ہے۔ حالانکہ کونسی بری بات ہے۔ نہ اس کے عمل میں کوئی کمزوری ہے، نہ ایمان اور عقیدہ میں کوئی فرق ہے۔ مگر شیطان نے ایک یہ بات پیدا کرادی کہ تم اور ہو اور یہ اور ہیں۔ لہٰذا انسان میں محبت کی کمی پیدا ہو گئی۔ مختصر یہ ہے کہ اگر دنیائے محبت میں کوئی مثال، کوئی نمونہ دیکھنا ہے تو ایک چاہنے والا حسینؑ کا ایسا ہے جس کی محبت پر کوئی شے اثر انداز نہ ہو سکی۔ ایسی کامل محبت کہ کوئی چیز اثر انداز نہ ہو سکی۔ جہاں دنیا والے سوتیلے بھائی کو بھائی مانتے ہوئے تکلف کرتے ہیں وہاں سوتیلے بھائی کو آدمی آقا مان لے۔ جہاں معمولی خطرہ کو دیکھ کر انسان میدانِ محبت سے پیچھے ہٹ جاتا ہے وہاں انسان ہر طرح کی قربانی کے لئے تیار ہو جائے۔ یہ ہے کمالِ محبت اور یہ ہے کمالِ قربانی کہ خود بھی قربان ہو جائے، بھائی بھی قربان ہو جائیں، دل کے ٹکڑے بھی قربان ہو جائیں۔ محبت کی منزل پر کربلا میں سب کو دیکھا مگر سب سے زیادہ

محبت میں درجۂ کمال پر عباسؑ علمدار کو دیکھا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ عباسؑ کو یہ محبت کتنے رُخ سے ملی تھی۔ یہ جذبہ پروردگار نے کیسے کیسے عنایت فرمایا تھا۔ واقعات سب آپ کی نگاہ کے سامنے ہیں۔ ۲۶ھ میں ماہ شعبان کی چوتھی تاریخ کو عباسؑ علمدار کی ولادت ہوئی۔ ۲۶ھ کو آپ حضرات جانتے ہیں کہ یہ ۲۶ھ کا زمانہ کیسا ہے۔ ۱۱ھ میں پیغمبرؐ کے انتقال کے بعد جب حالات زمانہ بدل گئے تو مولائے کائنات نے گویا خانہ نشینی اختیار کر لی اور جب تک وہ وقت نہ آیا کہ حکومتوں کا سلسلہ ختم ہو جائے اس وقت تک مولا منظر عام پر نہ آئے اور آئے تو اس شان سے آئے کہ مسلمانوں نے بیعت کر لی، خلیفۃ المسلمین ہو گئے۔ مگر یہ ۳۵ھ میں ہوا۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ گیارہ سے ۳۵ سال تک ۲۵ سال کا زمانہ ہے جو علیؑ کی زندگی میں انتہائی مصائب کا دور ہے۔ ہر طرح کی مشکل چاہنے والے مارے جا رہے ہیں۔ ایک قتل عام ہو رہا ہے۔ ہر طرح کا دباؤ ہے۔ محسنؑ کی شہادت، گھر کا جل جانا، پہلوئے زہراؑ کا شکستہ ہو جانا۔ اور جہاں تک آپ حالات کو دیکھتے جائیے۔ چاہنے والے ابوذر سے لے کے میثم تمار تک مسلسل ستائے جا رہے ہیں۔

اسی عین دور مصائب میں عباسؑ علمدار نے اس دنیا میں قدم رکھا۔ ۲۶ھ سے لے کر ۳۵ھ تک کم سے کم نو سال تک تو وہی حالات نگاہ کے سامنے رہے جہاں سوائے مصائب اور مظالم کی خبروں کے اور کسی طرف سے کوئی اچھی خبر سُننے میں نہیں آتی تھی۔ مگر بچّہ کیا باشعور ہے۔ جتنے مصائب کو دیکھ رہا ہے حوصلے اور مضبوط ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لئے کہ دیکھ رہا ہے کہ باپ سارے مصائب کے مقابلہ میں تن تنہا کھڑا ہے اور ماں بھی ایسی صاحب معرفت خاتون ہے کہ جیسے ہی مولائے کائنات کے گھر میں قدم رکھا اور شہزادوں کو دیکھا۔ شہزادوں نے بڑھ کے استقبال کیا کہ بہر حال جب مولائے کائناتؑ کے عقد میں آئی ہیں تو امام حسنؑ و امام حسینؑ کے لئے ماں کا درجہ رکھتی ہیں۔ شہزادوں نے بڑھ کے جناب ام البنین کا استقبال کیا۔ مگر ام البنین ٹھہر گئیں۔ بس شہزادو یہی پہلا اور آخری مرحلہ ہے آپ کی عزت افزائی کا۔ احسان آپ کی مہربانیوں کا۔ مگر خبردار مجھے ماں نہ کہئے گا اور نہ ماں سمجھئے گا۔ میں اس گھر میں ماں بن کر نہیں آئی ہوں۔ ماں

فاطمہ زہراؑ ہیں۔ یہ ڈیوڑھی فاطمہ زہراؑ کی ہے جہاں پیغمبرؐ سلام کرنے آتے تھے۔ یہ چوکھٹ فاطمہ زہراؑ کی ہے۔ جہاں ملک الموت آکے ٹھہر جاتا تھا۔ میں اس گھر کی خادمہ ہوں۔ میں آپ حضرات کی خدمت کرنے کے لئے آئی ہوں۔ اس سے زیادہ اس گھر میں میری اور کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بچہ ایسی گود میں پلا ہو۔ جس بچّہ نے ایسی آغوش میں تربیت پائی ہو، وہ دیکھ رہا ہے کہ اگر ماں کا کردار یہ ہے کہ گھر میں قدم رکھنے کے بعد اپنے کو شہزادوں کی کنیز کہہ کے تعارف کرایا ہے۔ ماں کہہ کے نہیں۔ تو بیٹے میں کیسے یہ ہمّت پیدا ہو جائے گی کہ اپنے کو بھائی کہہ کے پیش کر سکے۔ اگر ماں نے اپنے کو کنیز کہہ کر اپنا تعارف کرایا ہے ماں کہہ کے نہیں تو بیٹا بھی اپنے کو غلام ہی کہہ کے تعارف کرائے گا۔ مجھے حسینؑ کا بھائی نہ کہو، میں مولا کا غلام ہوں۔

یہ ابتدا ہے عباس علمدار کی اور اس کے بعد عباس کا امتیاز یہ ہے کہ امام حسینؑ کی ولادت کے بعد سب سے پہلے اذان و اقامت پیغمبرؐ نے کہی تھی اور جب عباسؑ پیدا ہوئے تو عباس کے کان میں اذان و اقامت مولائے کائنات نے کہی۔ کیا شرف ہے حسینؑ کا کہ پہلی آواز سُنی تو پیغمبرؐ کی آواز سُنی، اور کیا شرف ہے عباسؑ علمدار کا کہ پہلی آواز کان میں آئی تو مولائے کائناتؑ کی آواز آئی۔ اُس آواز نے کردارِ حسینؑ کو نمایاں کر دیا تھا اور اس آواز نے کردارِ عباسؑ علمدار کو نمایاں کر دیا۔ اور اس کے بعد جو علمدار نے تربیت پائی اور جس انداز سے تربیت پائی ہے اس کا مختصر خاکہ یہ ہے کہ جب مولائے کائناتؑ عالم اسلام میں خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے سامنے آئے تو مولاؑ کو دو معرکوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلا معرکہ جمل کی شکل میں، اور دوسرا معرکہ صفین کی شکل میں۔ آپ تاریخ پڑھیں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ جمل کے معرکہ میں نمایاں نام آیا ہے محمد حنفیہ کا۔ جن کو مولائے کائناتؑ نے میدان جنگ میں بھیجا اور مختصر طریقے سے فنونِ جنگ کی تعلیم دے کر بھیجا اور صفین کے معرکہ میں عباسؑ کی موجودگی کا ذکر تاریخ میں پایا جاتا ہے مگر اتنا فرق ہے کہ جب ۳۵ھ، ۳۶ھ کے زمانے میں محمد حنفیہ آئے ہیں تو محمد حنفیہ جوان تھے۔ محمد حنفیہ کا سن و سال لڑنے کے لائق اور محمد حنفیہ کی عمر جنگ کے

قابل تھی۔ لیکن جو جنگ صفین میں آیا ہے ۳۶ھ میں پیدا ہونے والا انسان ہے جس کی عمر کل دس یا گیارہ سال کی ہے۔ مگر دو جملے ہیں تاریخ کے انھیں یاد رکھیے گا۔ محمد حنفیہ میدان میں گئے تو ایک مرتبہ یہ سوال اُٹھا دیا کہ مولا بار بار ایک ہی بیٹے کو کیوں بھیجتے ہیں؟ آخر حسنؑ وحسینؑ بھی تو آپ کے فرزند ہیں۔ اللہ نے انھیں بھی شجاعت دی ہے، انھیں بھی طاقت دی ہے، وہ بھی آپ کے وارث ہیں، یہ کیوں نہیں جاتے ہیں؟ جس پر مولاؑ نے ایک فقرہ فرما کر کہنے والے کو بٹھا دیا۔ دیکھو حسنینؑ میں اور محمد حنفیہ میں فرق ہے۔ محمد حنفیہ میرے زور بازو کا وارث ہے۔ میرا فرزند ہے۔ میں نے تربیت کی ہے۔ میرا بیٹا ہے مگر کیا کروں کہ رشتے الگ الگ ہیں۔ "ھُمَا عَیْنَایَ" حسنؑ وحسینؑ یہ دونوں میری آنکھیں ہیں۔ اور یہ میرا ہاتھ ہے۔ جب بھی آنکھوں پر وقت آتا ہے تو ہاتھ سے بچایا جاتا ہے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ یہ قربان ہو جائیں اور حسنینؑ پر آنچ نہ آنے پائے۔ یعنی وہ علیؑ کا لال جو مسلسل میدان میں جہاد کر رہا ہے ایک موقع وہ آگیا جب وہ بھی ٹھہر گیا۔ کب تک بار بار میدان میں جائے گا۔ کب تک اکیلا جنگ کرتا رہے گا۔ کب تک لشکروں کا مقابلہ کرے گا۔ اس موقع پر مولاؑ کا ایک فقرہ تاریخ میں ہے محمد حنفیہ کی شجاعت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ العیاذ باللہ۔ تاریخ عرب میں کوئی ان کا جیسا بہادر نہیں تھا مگر ایک لمحہ کے لئے جب محمد حنفیہ ٹھہر گئے تو مولاؑ نے ایک جملہ کہا "اَدْرَکَکَ عِرْقٌ اُمِّکَ" میں نے تمھیں پالا ہے تم میرے زور بازو کے وارث ہو۔ تم میرے بیٹے ہو۔ تم میرے لال ہو۔ مگر کیا کروں کہ ایک پہلو کمزور رہ گیا ہے کہ تمھیں ماں کی طرف سے یہ شجاعت نہیں ملی ہے لہٰذا تمھارے قدم ایک لمحہ کے لئے رُک گئے ہیں یعنی حیدر کرارؑ کی وراثت نے آگے بڑھایا لیکن ماں کی وراثت نے ایک منزل پر قدم روک لئے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ علیؑ کے خون کی تاثیر تو کام کر رہی تھی، لیکن چونکہ ماں کی وہ شجاعت نہیں تھی لہٰذا ایک لمحہ کے لئے قدم رُک گئے۔ اب جس کے قدم گیارہ سال کی عمر میں بھی نہ رکیں اس کی شجاعت کو دیکھ کر علیؑ کی شجاعت کا اندازہ نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کی شجاعت کو دیکھ کر اس ماں کی ہمت کا اندازہ ہوتا ہے جس کا انتخاب مولائے کائناتؑ نے

عقیل کے ذریعہ کیا تھا۔ یعنی عباسؑ دونوں طرف سے شجاعت کے وارث تھے۔ باپ کی طرف سے شاہ لافتیٰ کے بیٹے تھے اور ماں کی طرف سے اس خاندان کے چشم و چراغ تھے جو خاندان عرب میں شجاعت میں، ہمت میں، طاقت میں، مجاہدات میں ایک شہرت رکھتا تھا۔ لیکن اس کے بعد کمال معرفت کو بھی دیکھیں کہ جب امام حسنؑ کی صلح کا وقت آیا اور مولائے کائنات کی شہادت کے بعد امام حسنؑ نے صلح کرنا چاہی تو اگر مسئلہ مزاجوں کا ہوتا تو امام حسنؑ اپنے مزاج کی نرمی کی بناپر صلح کر بھی لیتے اور امام حسینؑ امام ہو کر خاموش رہ جاتے تو عباسؑ تو بہادر تھے، وہ تو شجاع تھے۔ انھیں تو کم سے کم اپنی شجاعت اور اپنے غیظ و غضب کا اظہار کرنا چاہیئے تھا۔ مگر وہ لوگ اور ہیں جن سے صلح پیغمبرؐ بھی برداشت نہیں ہو سکی۔ یہاں تنہا زور بازو نہیں ہے قوت ایمان بھی ہے۔ قوت عقیدہ بھی ہے کہ حسنؑ بن علیؑ امام ہیں جو کریں گے وہی صحیح ہوگا۔ یہ موقع ہمت کے مظاہرہ کا نہیں ہے اتنا بڑا سخت معرکہ سامنے آگیا مگر عباسؑ علمدار اپنے زور بازو کو روکے رہے اس کے بعد صلح نامہ کو پھاڑ کر پھینک دیا گیا مگر اپنی ہمت و شجاعت کو روکے رہے۔ کیوں روکے رہے اس لئے کہ انھیں اس دن کے واسطے مہیا نہیں کیا گیا ہے۔ ان کو بابا نے اس دن کے واسطے نہیں مہیا کیا ہے اگر آج ان کی تلوار نہ اٹھے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ لیکن جس دن کے واسطے مہیا کیا گیا ہے اُس دن شجاعت کے جوہر بہر حال دیکھے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ عاشور کی رات جب زہیر بن قین نے آکر آواز دی۔ عباسؑ! آپ سے کچھ کہنا ہے۔ فرمایا بتائیے کیا کہنا ہے؟ کہا ذرا میرے ساتھ آئیے۔ دو قدم الگ لے گئے۔ کہا آپ کو تو خود ہی معلوم ہے کہ آپ کے بابا نے اپنے بھائی عقیل سے کہا تھا کہ ایک ایسے بہادر خاندان کی عورت کا پتہ بتائیے جس سے میں عقد کروں تو جو اولاد ہو کر بلا میں میرے حسینؑ کے کام آئے تو عباسؑ جس دن کے واسطے آپ کو آپ کے بابا نے مہیا کیا تھا وہ دن آگیا ہے۔ روایت کہتی ہے کہ بس یہ سُننا تھا کہ ایک مرتبہ شیر نے انگڑائی لی، آستینیں اُلٹ گئیں۔ فرمایا أَتُشَجِّعُنِي فِي مِثْلِ هٰذَا الْيَوْمِ يَا زُهَيْرُ، زہیر آج

مجھے شجاعت کا جوش دلا رہے ہو۔ بس یہ رات درمیان میں ہے۔ کل کا دن آنے دو۔ معرکۂ کارزار قائم ہو جائے۔ جنگ کا بازار گرم ہو جائے پھر دیکھنا حیدر کرار کا لال کس طرح لڑتا ہے۔

بس عزیزو! ایک لفظ میری زبان پر آگیا اور ایک روایت مجھے یاد آگئی۔ آج ہی میں عباسؑ علمدار کے حالات کا مطالعہ کر رہا تھا مجھے یہ فقرہ یاد آگیا کہ بچپنے میں عباسؑ کو مولا گود میں بٹھائے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیا شجاعت کا ذکر آگیا کہ جیسے ہی یہ ذکر آیا ویسے ہی عباسؑ نے دھیرے دھیرے آستینوں کو الٹنا شروع کیا، اور جیسے ہی عباسؑ نے آستینوں کو الٹا مولا نے دیکھا کہ ہاتھ کھلا ہوا ہے۔ ابھی تو شجاعت و ہمت کی بات ہو رہی تھی۔ ام البنین بیٹھی ہوئی یہ منظر دیکھ رہی تھیں کہ عباسؑ نے آستین الٹ لی اور یہ دیکھ کر مولا کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔ ام البنین پریشان ہو گئیں کہ رونے کا سبب کیا ہے۔ ابھی پوچھنا ہی چاہتی تھیں کہ رو کیوں رہے ہیں کہ ایک مرتبہ ام البنین نے ایک اور منظر دیکھا کہ جہاں تک عباسؑ نے آستینوں کو الٹ لیا تھا۔ علیؑ نے آستینوں کو اور الٹ لیا جیسے ہی آستینوں کو الٹا اور بازو سامنے آگئے، بڑھ کے علیؑ نے بازوؤں کے بوسے لے لئے۔ اور جیسے ہی علیؑ نے بازوؤں کو چوما ویسے ہی ام البنین نے دیکھا کہ آنسوؤں کا ایک سیلاب ہے۔ اب برداشت نہ ہو سکا۔ بیقرار ہو کے کہا۔ مولا پہلے یہ بتائیے کہ اس بچے نے آستین الٹی تو آپ روئے کیوں؟ پھر آپ نے بازوؤں کے بوسے کیوں لئے؟ اور آپ رو کیوں رہے ہیں؟

فرمایا۔ ام البنین تم ان ہاتھوں کو دیکھ رہی ہو۔ مجھے دو باتوں کا خیال آرہا ہے۔ آج یہ میرے لال کا حوصلہ ہے کہ آستین الٹ رہا ہے۔ کربلا جب وقت آئے گا تو دیکھے گا کہ آپ کا بیٹا کیسے جنگ کرتا ہے۔ عباسؑ کو کیا خبر کہ سب کو تلوار چلانے کا موقع ملے گا مگر اس کے حوالہ سقائی کا کام کیا جائے گا۔

تو مولا بازوؤں کا بوسہ کیوں لے لیا؟

فرمایا۔ ام البنین میری آنکھیں وہ منظر دیکھ رہی ہیں جب میرا لال فرات سے پانی لے کے چلے گا اور اس کے شانے قلم ہو جائیں گے۔ میں ان جگہوں کو بوسہ

دے رہا ہوں اور ان بازوؤں کو چوم رہا ہوں جو میرے حسینؑ کی محبت میں کام آجائیں گے۔

ام البنین نے روزِ اول یہ سُنا کر میرے لال کے ہاتھ قلم ہو جائیں گے۔ میرے بچّہ کے شانے قلم ہو جائیں گے۔ اب ماں کے دل میں یہ خیال ہمیشہ کے لئے رہ گیا جب کسی مصیبت کا خیال آیا تو عباسؑ کے بازو یاد آگئے۔ جب کسی مصیبت کا خیال آیا تو عباسؑ کے شانے یاد آگئے۔ یہانتک کہ کربلا کا واقعہ تمام ہو گیا۔

جب اہل حرم شام سے چھٹ کر مدینہ سے واپس آئے اور بشیر نے آکے گلیوں میں آواز دینا شروع کی۔ مدینہ والو! کیا بیٹھے ہو، نبیؐ کا مدینہ اُجڑ گیا۔ حسینؑ کربلا میں مارے گئے۔ یہ خبر پھیل رہی تھی کہ کسی نے پوچھ لیا، ارے کیا واقعہ پیش آیا؟ کیا ہوا؟۔ کہا آؤ قبرِ پیغمبرؐ پر بیان کروں گا۔ "اَلْخَبَرُ عِنْدَ قَبْرِ رَسُوْلِ اللّٰہِ" سارے مدینہ کے لوگ قبرِ پیغمبرؐ کے پاس جمع ہو گئے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک معظمہ ہاتھ میں عصا لئے ہوئے مسجدِ پیغمبرؐ کے ایک گوشہ میں آکر کھڑی ہو گئیں۔ جیسے ہی بشیر نے یہ اعلان کیا کہ مدینہ والو! غضب ہو گیا کہ کربلا میں حسینؑ مارے گئے۔ ویسے ہی معظمہ نے رُخ کیا نجف کا۔ یا علیؑ! آپ تو کہا کرتے تھے کہ یہ آپ کا لال آپ کی شجاعت کا وارث ہے۔ یہ عباسؑ کہاں چلا گیا تھا کہ میرا حسینؑ مارا گیا۔ ایک مرتبہ بشیر نے کہا بی بی ذرا خاموش رہیے، یہ نہ کہیئے۔ جب تک آپ کا عباس سلامت رہا حسینؑ پر آنچ نہ سکی۔ مگر جب آپ کا شیر نہ رہ گیا تو زہراؑ کا لال نرغۂ اعداء میں گھر گیا۔ معظمہ نے کہا اچھا میرا لال میرے مولا پر قربان ہو گیا؟ شاباش میرے عباسؑ! میرے لال تو نے ماں کو سرخرو کر دیا۔ تو نے ماں کو شہزادیٔ کائنات کے سامنے شرمندہ نہیں ہونے دیا۔

اچھا جلدی بتا کہ میرا لال کیسے قربان ہوا؟

کہا بی بی آپ کا لال فرات سے پانی لے کر آرہا تھا کہ ایک شانہ قلم ہو گیا، وہ آگے بڑھا تو دوسرا ہاتھ کٹ گیا۔ اس کے بعد سر پر گرز لگا اور پُشتِ فرس سے زمین

پر آگیا۔ یہ سُننا تھا کہ ایک مرتبہ بیقرار ہو کر کہا۔ یا علیؑ فریاد۔ یا علیؑ فریاد۔
مولا یہ تو بتائیے کہ جب ہاتھ کٹ گئے تھے۔ سر زخمی تھا تو میرا لال گھوڑے سے کیسے گرا ہوگا؟ ہائے کس نے سنبھالا ہوگا۔ نہ کوئی ناصر نہ مددگار۔ مجھے کوئی بتائے کہ کیا یہ صحیح ہے کہ میرا عباسؑ جب گھوڑے سے گرا تو اس کے ہاتھ کٹ چکے تھے۔ ارے ہر گرنے والا اپنے ہاتھوں کا سہارا لیتا ہے۔ مگر میرے عباسؑ تجھ پر کیا گذر گئی ہوگی بیٹا۔ تیرے تو ہاتھ بھی سلامت نہیں تھے تو کس طرح گرا ہوگا اور تیرے دل پر کیا گذر گئی ہوگی۔

وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

دسویں مجلس

صبر امام حسین علیہ السّلام

"حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اللہ اس سے محبت کرے جو میرے حسینؑ سے محبت کرے۔"

سرکار دو عالمؐ کے ارشاد گرامی کی روشنی میں جو سلسلۂ کلام عرفانِ حسینؑ کے ذیل میں آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا اس کے دسویں مرحلے پر کچھ باتیں صبر امام حسینؑ سے متعلق گذارش کرنا ہیں۔

اگرچہ یہ موضوع دیکھنے میں مصائب سے تعلق رکھتا ہے، لیکن اگر آپ اس کی گہرائیوں پر غور کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ صبر کا تعلق تنہا مصائب سے نہیں ہے اور صبر کے کمالات کا اظہار تنہا منزل مصائب میں نہیں ہوتا ہے۔

اصل موضوع کو گذارش کرنے سے پہلے چند لفظیں خود صبر کے بارے میں۔

ہماری زندگی میں کبھی مصائب کو برداشت کر لینا صبر کہا جاتا ہے اور کبھی مصیبتوں کو برداشت کرنے ہی کا نام ہوتا ہے بے غیرتی۔

ایسے مواقع بھی آتے ہیں جہاں آپ کسی مصیبت کو برداشت کر لیں تو آپ کو صابر کہا جائے گا اور ایسے مواقع بھی آتے ہیں جہاں آپ کسی مصیبت کو برداشت کر لیں تو آپ کو بے حیا و بے غیرت کہا جائے گا کوئی صابر کہنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔

لہٰذا سب سے بڑا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کس جگہ پر قوتِ برداشت کو صبر کہا جائے

اور کہاں قوتِ برداشت کو بے غیرتی کا نام دیا جائے۔

اگر سارا مسئلہ جذبات کے حوالے کر دیا جائے تو جذبات تو انسان کو کہیں صبر نہیں کرنے دیتے۔ جذبات کا تقاضا ہر جگہ یہی ہوتا ہے کہ انسان لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ جذبات کی دنیا میں جب تک جنگیں ہوتی رہتی ہیں کسی کو نبوت میں شک نہیں ہوتا ہے اور جیسے ہی صلح کی نوبت آتی ہے وہاں بڑے بڑوں کو رسالت میں شک ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ انھوں نے جذبات کی دنیا دیکھی ہے، مذہب کی دنیا نہیں دیکھی ہے اور مذہبی دنیا میں یہ دونوں مرحلے الگ الگ ہیں۔ جذبات الگ ہیں اور مذہبی فیصلے الگ ہیں۔ لہٰذا یہ طے کرنا ہوگا کہ کس جگہ پر صبر کا نام ہے برداشت اور کس جگہ صبر اس منزل میں پہونچ جاتا ہے جہاں انسان کو بے غیرت شمار کر لیا جاتا ہے۔

علمائے اخلاق نے اس کا بہترین فیصلہ یہ کیا ہے کہ انسان کو اپنے جذبات کے بجائے اپنی عقل یا قانون مذہب کا سہارا لینا چاہیے اور جہاں عقل بشر برداشت کرنے کی دعوت دے وہاں برداشت کا نام صبر رکھا جائے، اور جہاں عقل بشر برداشت کرنے سے روک دے وہاں برداشت کرنے کا نام بے غیرتی رکھا جائے۔ یعنی مسئلہ جذبات سے طے نہ ہو بلکہ عقل سے طے ہو۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ جو صاحبانِ عقل ہیں یعنی ہم اور آپ، ہماری زندگی کا بھی یہی حال ہے کہ کبھی ہماری عقل ہمارے جذبات پر غالب آتی ہے اور کبھی ہمارے جذبات ہماری عقل پر غالب آجاتے ہیں۔ ہم یہی نہیں سمجھ پاتے کہ کہاں عقل بول رہی ہے اور کہاں جذبات بول رہے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ مسئلہ ہمارے اور آپ کے حوالے کر دیا گیا تو یہ طے کرنا بھی مشکل ہوگا کہ یہ جذبہ کہہ رہا ہے کہ چپ رہ جاؤ یا عقل کہتی ہے کہ چپ رہ جاؤ۔ ضرورت ہے کہ عقل کے فیصلوں کو ان افراد کے حوالے کر دیا جائے کہ جن کی زندگی میں خواہشات کا گذر نہیں ہوتا ہے کہ وہ اگر کسی جگہ پر برداشت کی

دعوت دیں تو، برداشت کرنے ہی کا نام صبر ہے اور اگر وہ کہیں برداشت کرنے سے روک دیں تو، برداشت کرنے کا نام صبر نہیں ہے بلکہ بے غیرتی ہے۔

اگر بات یہاں تک آگئی ہے کہ مسئلہ جذبہ سے نہیں طے ہوگا عقل سے طے ہوگا اور مسئلہ ہر صاحب عقل طے نہیں کرے گا بلکہ وہ طے کریں گے جن کی عقل پر وحیِ خدا کا پہرہ ہے۔ تو میں اس مقام پر ایک لفظ کہہ کے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔

دنیا میں کون سا انسان ایسا ہے جو جذباتی اعتبار سے رونا چاہتا ہو۔ جذباتی اعتبار سے سب ہنسنا چاہتے ہیں، سب خوش رہنا چاہتے ہیں۔ ماں بچّے کو دعا دیتی ہے خدا کرے زندگی بھر خوش رہو۔ بزرگ نے چھوٹے کو دعا دی خوش رہنے کی۔ ہر آدمی دوسرے کے لئے دعا کرتا ہے خوش رہنے کی یا دعا دیتا ہے خوش رہنے کی۔ نہ کوئی رونے کی دعا کرتا ہے اور نہ کوئی کسی کو رونے کی دعا دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جذبات ہمیشہ خوشی چاہتے ہیں، رونا نہیں چاہتے۔ تو اگر کسی مقام پر وہ اللہ کا بندہ جو جذبات سے بات بھی نہ کرتا ہو۔ رو دے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ رونا جذباتی نہیں ہے یہ رونا عقلی ہے اور ہر وہ بات جو عقل کے مطابق ہو اس کا نام صبر ہے، بے صبری نہیں ہے ——— لہٰذا دنیا کی ہر مصیبت پر رونا بے صبری کہا جاسکتا ہے مگر غمِ حسینؑ میں رونا بے صبری نہیں ہے، عین صبر ہے۔ غمِ حسینؑ میں پیغمبرؐ روئے ہیں، اور پیغمبرؐ کا کوئی کام جذباتی نہیں ہوتا ہے۔ پیغمبرؐ کا ہر کام عقل کے مطابق اور وحی کا ترجمان ہوتا ہے۔ صلوات

یہ جو ہمیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ آپ سال بھر روتے ہی رہتے ہیں، رونا کوئی اچھا کام نہیں ہے۔ رونا تو، برداشت کی کمزوری کا نام ہے۔ انسان کو صابر ہونا چاہئے۔ اللہ صبر کی تعریف کرتا ہے۔

یہ بیچارے یہی نہیں جانتے ہیں کہ صبر اور بے صبری میں فرق کیا ہے۔ صبر کسے کہتے ہیں اور بے صبری کسے کہتے ہیں۔ اگر رونا غمِ حسینؑ میں بے صبری ہوتا تو ساری دنیا روتی مگر پیغمبرؐ نہ روتے۔ مگر فراقِ یوسفؑ میں یعقوبؑ کا رونا اور ولادتِ امام حسینؑ

سے لے کر شہادتِ حسینؑ تک پیغمبرؐ کا رونا یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہر غم میں رونا بے صبری ہو سکتا ہے، مگر نمائندۂ پروردگار کے غم میں رونا بے صبری نہیں ہے۔ چاہے زندگی میں روئے جیسے نبی روئے ولادت کے موقع پر۔ یا یعقوبؑ روئے فراقِ یوسفؑ میں۔ یا مرنے کے بعد روئے جیسے پیغمبرؐ روئے کبھی ام سلمہ کے خواب میں اور کبھی ابن عباس کے خواب میں۔ صلوات

عزیزانِ محترم! یہ پہلا مرحلہ تھا کہ صبر کے معنی طے ہو جائیں کہ اگر برداشت کرنا مطابق عقل ہے تو صبر کر لینے کا نام ہے کمال۔ صبر کرنا ہے شرفِ انسانیت اور اگر برداشت کرنا خلاف عقل ہے تو برداشت کرنے کا نام ہے بے غیرتی اور بے حیائی۔

اب اس کے بعد آئیے اصل موضوع کے بارے میں کچھ باتیں گذارش کی جائیں کہ صبر کا کمال کیا ہے اور صبر کا فائدہ کیا ہے۔

اگر انسان قوتِ برداشت پیدا کر لے جو تین مقامات پر دیکھنے میں آتی ہے:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نفسِ انسان اطاعت سے روکتا ہے اور انسان نفس کے خلاف اطاعت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

______ کبھی نفس گناہ کی دعوت دیتا ہے اور انسان نفس سے ٹکرا کے گناہ کو چھوڑ دیتا ہے۔ مثال کے طور پر دو بجے رات کو سوئے اور موذن نے علی الصباح آواز دی "حیّ علی الصلوٰۃ"۔ کس کا دل چاہتا ہے اُٹھنے کے لئے۔ کسے یہ برداشت ہے کہ اچھی خاصی نیند کو چھوڑ دے۔ مگر یہ جگہ ہے برداشت کرنے کی کہ خدا آواز دے رہا ہے۔ تو حکمِ خدا کی بنا پر نیند کو ٹھکرا کے مصلّے پر آجانا یہ ہے صبر۔ مفت کا مال حرام میں مل رہا ہے۔ ہر آدمی چاہتا ہے جلدی سے قبضہ کر لیا جائے۔ قدرت نے آواز دی بندے! تیرے واسطے اس مال کو ہاتھ لگانا بھی حرام ہے۔ اب اگر ہاتھ کو روک لیا تو یہ ہے قوتِ برداشت اور اس کو

کہتے ہیں صبر۔ تو صبر کبھی اطاعت کی منزل میں ہوتا ہے اور کبھی معصیت کی منزل میں ہوتا ہے اور کبھی صبر مصیبتوں کی منزل میں ہوتا ہے۔ میں ان سب کی مثالیں ابھی آپ کے سامنے گذارش کروں گا۔ جہاں داستانِ صبر قرآن مجید کی روشنی میں بیان ہوگی۔ پہلے صبر کے فوائد سُن لیجیے۔

اے اللہ کے بندو! صبر کے ذریعہ سے مدد مانگو اور نماز کے ذریعہ مدد مانگو۔ جب کوئی مصیبت آئے تو مصیبتوں سے ٹکرانے کے دو ذریعے ہیں۔ ایک کا نام ہے صبر، اور ایک کا نام ہے صلوٰۃ (نماز)۔ جس کی ہم نے قدر نہیں پہچانی اور بجائے اسکے کہ نماز کا سہارا لے کے مصیبتوں سے مقابلہ کرتے نماز ہی کو مصیبت سمجھنے لگے۔ دیکھیے انسانیت کی بدبختی کہاں تک ہے اور انسان کی نالائقی کس منزل پر ہے کہ مصیبتوں کا لہجہ یہ ہوگیا ہے کہ ہمارا باپ مرگیا اور آپ کو نماز کی پڑی ہوئی ہے۔ ہمارا بیٹا مرگیا اور آپ کو نماز کی پڑی ہوئی ہے۔ ہماری نوکری چلی گئی اور آپ کو نماز کی پڑی ہوئی ہے۔ یہ بیچارہ یہی نہیں جانتا ہے کہ مصیبتوں کا مقابلہ نماز سے ہوتا ہے۔ اسے یہی نہیں معلوم ہے کہ مصیبتوں کے مقابلے میں بہترین سہارے کا نام ہے نماز۔ بہترین طاقت کا نام ہے نماز۔ بندہ اور خدا کے رابطے کا نام ہے نماز۔ خدا سے ملاقات کرنے کا براہ راست ذریعہ ہے نماز۔ "ایاک نستعین" لہذا نماز بہترین ذریعہ ہے مدد مانگنے کا۔ اور دوسرا ذریعہ ہے صبر۔ پہلے صبر کرو، برداشت کرو اس کے بعد خدا تمہارا ساتھ دے گا۔ لیکن پہلے تمھیں بھی کچھ کرنا ہوگا۔ صبر کرنا ہوگا کہ صبر ذریعہ ہے مانگنے کا۔ صبر سے مدد مانگو۔ صبر کے ذریعہ مدد مانگو۔

معصومؑ سے پوچھا گیا کہ صبر کسے کہتے ہیں؟

فرمایا، آدھے ایمان کا نام ہے صبر۔

دوسری روایت میں ارشاد ہوتا ہے۔ ایمان کے دو حصے ہیں۔ آدھے دو برابر کے حصے ہیں۔ آدھا ایمان ہے صبر، اور آدھا ایمان ہے شکر۔ تو صبر نصف ایمان ہے۔ مگر خدا کہتا ہے جو نصف ایمان ہے اس سے مدد مانگو۔

تو مسلمانو! اگر نصف ایمان سے مدد مانگی جاسکتی ہے تو کُلِ ایمان سے کیوں نہیں مانگی جاسکتی ہے اور اسے وسیلہ کیوں نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ صلوات

صبر کے ذریعہ مدد مانگو، نماز کے ذریعہ مدد مانگو، کیوں؟ فائدہ کیا ہوگا؟ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ پورے قرآن میں کہیں نہیں ہے کہ اللہ حلوہ کھانے والوں کے ساتھ ہے۔ اللہ فرسٹ کلاس گاڑیوں میں چلنے والوں کے ساتھ ہے۔ اللہ بہترین محلوں میں رہنے والوں کے ساتھ ہے۔ نہیں اللہ صابرین کے ساتھ ہے۔ تو اگر یہ طے ہو جائے کہ ہماری زندگی میں کوئی مصیبت ہی نہیں آئی تو ہم سب کچھ ہو سکتے ہیں صابر نہیں ہو سکتے۔ اور اگر صابر نہیں ہو سکتے ہیں تو خدا ساتھ کیسے دے گا۔ وہ تو کہتا ہے کہ میں صابروں کے ساتھ ہوں۔ لہٰذا عزیزو! اگر خدا کو ساتھ لینا ہے تو مصیبتوں کو ٹالنے کی فکر نہ کرو، مصیبتوں کو برداشت کرنے کی دعا کرو۔ اس لئے کہ مصیبت ٹل گئی تو صابر نہ بن سکو گے۔ مصیبت آجائے اور برداشت کرلو تاکہ صابر بن جاؤ۔

یہی وجہ ہے کہ خاصانِ خدا نے ہمیشہ دعا کی ہے۔ پروردگار! ہم پر صبر کو انڈیل دے۔ یعنی صبر کی فراوانی چاہیئے۔ مصیبت کا ٹالنا نہیں چاہیئے۔ کہ جن کی مصیبتیں ٹل گئیں وہ صابر نہ بن سکے۔ جو دنیا کی ہر مصیبت سے ٹکرا گئے وہ سید الصابرین کہلائے ہیں۔

———— صلوات ————

یہ ہمارے ایمان کی کمزوری ہے کہ ذرا زلزلہ ہوا کہا آپ حضرات دعا فرمائیے زلزلہ چلا جائے۔ کیوں چلا جائے رہنے دیجئے مہمان آیا ہے۔ تھوڑی دیر تو رہے؟ ایک آزمائش کا لمحہ آیا ہے کوئی تو امتحان دیجئے؟ ایک صبر کا وقت آیا ہے کچھ تو صبر کیجئے۔ مگر نہیں۔ اگرچہ ہمارے یہاں روایات میں ہے کہ جب بیماری آئے تو انسان کو چاہیئے کہ دو تین دن تک پہلے اس بیماری کو برداشت کرے۔ اس کے بعد اگر دیکھتا ہے کہ قوت برداشت جواب دے رہی ہے اور ایمان خطرے میں ہے، تو ایمان کو خطرے میں ڈالنے سے بہتر یہ ہے کہ دوا کھالے۔ مگر پہلے کچھ تو قوت برداشت کا مظاہرہ کرے۔ ورنہ جو بقدر زلزلہ بھی صابر نہیں ہو سکتا اس کے صبر چاہی زلزلہ گر سکتا ہے

صبر کا پہلا فائدہ ہے "اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ" خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

یعنی صبر کرنا ہمارا کام ہے اور ساتھ دینا خدا کا کام ہے۔

میں ایک مقام پر یہ بات سمجھا رہا تھا تو ایک جوان کی سمجھ میں نہیں آیا اور کہنے لگا کہ مولانا عجب بات ہے، آپ کہتے ہیں آپ برداشت کر لیجیے خدا ساتھ دے گا۔ تو ساتھ دے کے فائدہ کیا ہوگا۔ جب ہم نے مصیبت کو، برداشت ہی کر لیا تو اب ساتھ دینے کا کیا فائدہ ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ خدا ساتھ دے اور مصیبت ٹل جائے۔ ورنہ جب ہم صابر بن ہی جائیں گے تو پھر ساتھ دینے کا فائدہ کیا ہوگا۔ گویا ہم ساتھ دینے کے ایک ہی معنی جانتے ہیں کہ مصیبت ٹل جائے اور مصیبت ٹل جانے کی مصیبت یہ ہے کہ اسطرح انسان صابر نہیں بن سکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں باتوں کو کیسے جمع کیا جائے۔ کوئی ایسا منظر ہمارے سامنے چاہیے۔ جہاں بندے کا صبر بھی سامنے آجائے اور خدا کا ساتھ بھی سامنے آجائے تاکہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ صبر کرنا کسے کہتے ہیں اور ساتھ دینا کسے کہتے ہیں۔

بس ایک منظر آپ کے سامنے گذارش کر رہا ہوں کہ بندہ مقام صبر میں آیا، وعدۂ خدا پر اعتبار کر کے کہ خدا ساتھ دے گا اور بندہ نے صبر کا مظاہرہ شروع کیا کہ یہ ساتھی مارا گیا صبر کیا۔ وہ جاں نثار مارا گیا صبر کیا۔ یہ ناصر گیا صبر کیا۔ وہ بیٹا گیا، برداشت کیا۔ یہ بھائی مارا گیا برداشت کیا۔ سب صبر ہی صبر ہو رہا ہے یہاں تک کہ گلے پر خنجر چل گیا اور صبر کیا پروردگار نے آواز دی کہ اب میرے ساتھ کو دیکھو میں کیسے ساتھ دیتا ہوں۔ ظالم کا ارادہ یہ تھا کہ اسّی سال کے بوڑھے سے لے کے چھ مہینہ کے بچے تک کا خاتمہ کر دیا جائے اور بندہ نے صبر کر لیا تو اب میں بندہ کا ساتھ دوں گا اور اس طرح کہ چودہ صدیاں گذر جائیں مگر ظالم کا نام نہ آنے پائے گا صرف مظلوم ہی زندہ رہ جائے گا۔

یعنی خبردار یہ نہ کہنا کہ زندگی چلی گئی۔ ہماری راہ میں مرنے والوں کو مُردہ نہ کہنا، ان کی زندگی کہیں نہیں گئی، یہ سب زندہ ہیں، ان کی زندگی کو ہم نے دوام دیدیا بقا دے دی۔ جو زندگی گئی وہ ستّر سال، اسّی سال پر ختم ہونے والی تھی اور یہ زندگی قیامت تک رہنے والی ہے۔ صلوات

تو عزیزانِ محترم! یہ صبر کا پہلا فائدہ ہے کہ خدا بندہ کا ساتھ دیتا ہے۔ اور خدا سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہے۔

دوسرا فائدہ صبر کا، خاصانِ خدا نے دعا کی رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا۔ پروردگار! ہمیں صبر فراواں عطا فرما۔ ہم پر صبر کو انڈیل دے۔ ہمیں بے پناہ صبر دے۔ وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا اور ہمارے قدموں کو ثابت بنا دے۔ یعنی اگر خدا صبر دے گا تو ثبات قدم بھی عنایت کرے گا۔

صبر کرنے والے ہی ثابت قدم رہتے ہیں۔ جن کے پاس صبر نہیں ہوتا ہے وہ ثابت قدم نہیں رہ سکتے ہیں۔

وہ بے صبرے ہوتے ہیں جو میدان میں آکے چلے جاتے ہیں۔ لیکن جن کے پاس کمال صبر ہوتا ہے وہ آنے کے لائق نہیں بھی ہوتے ہیں تو باپ کے ہاتھوں پر آجاتے ہیں کہ جہاں ثبات قدم نہیں ہے وہاں صبر نہیں ہے۔

صبر کا تیسرا فائدہ وہ ہے جو آخرت میں نظر آتا ہے۔ دیکھئے آلِ محمدؐ نے روزہ کی نذر کی اور روزے رکھے، یتیم و مسکین و اسیر کو کھانا کھلایا، پانی سے افطار کیا، پروردگار عالم نے ان کی اس قوت برداشت کی داد دی کہ جنت ان کی ہوگئی، حریرِ جنت ان کا ہوگیا اور آواز آئی جَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا۔ خدا نے جنت اور حریرِ جنت انھیں دے دیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ انھوں نے صبر کیا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا حریرِ جنت کوئی الگ چیز ہے، اور اگر نہیں تو جب جنت دے دی تو اس کے اندر جتنی نہریں ہیں، جتنے پھل ہیں، جتنے میوے ہیں، جتنے باغات ہیں، جتنے قسم کے کپڑے ہیں سب ہی تو دے دئے، اب بچا کیا کہ خدا کہتا ہے، ہم نے جنت بھی دی اور حریرِ جنت بھی دے دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ نگاہِ پروردگار میں جنت کی الگ ایک قیمت ہے اور لباسِ جنت کی الگ ایک قیمت ہے۔ پروردگار نے دو نعمتیں دیں۔ جنت اور لباسِ جنت۔ اس کا مطلب اتنا تو واضح ہوگیا کہ مالک کی نگاہ میں جنت ایک نعمت ہے اور لباسِ جنت دوسری نعمت ہے اور جو صبر

کرے گا اُسے یہ بھی دیں گے اور وہ بھی دیں گے۔

پروردگار! صبر کرنے والوں کو تو ہم نے پہچان لیا کہ روزہ رکھا یتیم کو کھلایا۔ مسکین کو کھلایا۔ اسیر کو کھلایا۔ اب جنّت کو دیکھنے کا تقاضا تو ہم نہیں کرتے کہ وہ وہاں جاکر دکھائی دے گی۔ لیکن اگر جنّت نہیں دکھلا سکتا تو کم سے کم لباس جنّت ہی دکھلا دے۔ آواز آئی یہ بھی کسی اور گھر میں نہیں دکھائی دے گا صابرین ہی کے گھر میں دکھائی دے گا۔ جب عید کے دن مچل جائیں تو دیکھ لینا کہ میں رضوان کو کس طرح درزی بنا کر بھیجتا ہوں۔ صلوات

اب ذرا اور آگے بڑھ جائیے صبر کا ثواب دیکھئے:

"جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا" یہ انبیاء سب ہمارے ہی بنائے ہوئے نبی ہیں۔ ان میں سے کوئی نہ خود سے بنا ہے اور نہ تم نے کسی کو بنایا ہے۔ مگر ہم نے سب کو نبی بنایا ہے، امام نہیں بنایا ہے۔

دیکھئے امامت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک امامت ہے جس کا سلسلہ پیغمبرؐ کے بعد شروع ہوا ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی نیابت، وزارت اور خلافت ہیں جس کا نام رکھا گیا ہے "امامت"۔

اور ایک امامت وہ ہے جو پروردگار نے انبیاء کو دی ہے۔ جہاں انبیاء قوموں کی قیادت کر رہے تھے۔ مگر یہ امامت اس دور میں بھی تھی جب انبیاء امام بنائے جاتے تھے سارے انبیاء اس کے قابل نہیں تھے کہ سب کو امام بنا دیا جاتا۔ جَعَلْنَا مِنْهُمْ ان میں سے کچھ ہیں جن کو ہم نے امام بنا دیا ہے، لَمَّا صَبَرُوْا اس لئے کہ انھوں نے صبر کیا تھا تو اب اندازہ ہوا کہ نبی ہو جانا آسان ہے مگر امام ہو جانا آسان نہیں ہے۔ پروردگار انبیاء میں سے بھی کسی کے صبر کو دیکھے بغیر امام نہیں بناتا ہے جس کی ایک مثال خدا نے بیان کر دی ہے۔

"اِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِکَلِمٰتٍ" جب خدا نے ابراہیمؑ کو آزمایا اور ابراہیمؑ امتحان میں کامیاب ہو گئے تو ہم نے کہا اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا،

اے ابراہیمؑ! ہم تم کو امام بنا رہے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے صبر کرنے کا۔ یعنی ابراہیمؑ نبی تھے امام نہیں تھے۔ رسول تھے امام نہیں تھے۔ خلیل تھے امام نہیں تھے۔ صاحبِ تھے امام نہیں تھے۔ ان سب کے بعد جب صبر کا مظاہرہ کیا تب خدا نے امام بنا دیا۔

ہم نے اگر یہ کہہ دیا کہ امام کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے تو کہنے لگے غضب ہو گیا دیکھئے نبی سے بڑھا دیا۔ حالانکہ ہم نے نہیں خدا نے خود ہی نبوت سے بڑھا کے رکھا ہے۔ رسالت سے بڑھا کے رکھا ہے۔ خلّت سے بڑھا کے رکھا ہے۔ صحیفوں سے بڑھا کے رکھا ہے اور جب خدا نے خود ہی اتنا بڑھا دیا ہے تو ہمیں آپ کو بڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں امامت کو بڑھانا نہیں ہے ہمیں امام کو ڈھونڈھنا ہے۔ جب خدا کسی کو بڑھا دے گا تو ہم سمجھ لیں گے کہ یہ خود ہی بڑھا ہوا ہے۔ صلوات

بڑھانے کا کیا کام ہے جس کو بڑھایا جائے گا وہ کتنی دیر رہے گا۔ جس کو ہم آپ مل کے آگے بڑھائیں گے وہ کتنی دیر بڑھے گا۔ قرآن مجید کی ایک تعبیر ہے جہاں پروردگار عالم نے منافقوں کی مثال دی ہے کہ یہ منافقین كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُسَنَّدَةٌ جیسے سوکھی لکڑی دیوار سے لگا کے کھڑی کر دی جائے۔

لکڑی کی دو صورتیں ہوتی ہیں:

ایک لکڑی وہ ہے جو زمین میں گاڑ دی جائے جو پائیدار ہے۔ چاہے دیواریں رہیں یا گر جائیں یہ رہے گی۔

اور ایک لکڑی وہ ہے جو دیوار سے لگا کے کھڑی کر دی جائے کہ جیسے ہی دیوار گری لکڑی بھی گر گئی۔

تو جو ایمان ثابت تھے وہ سب ثابت رہ گئے۔ اور جو کسی سہارے سے قائم تھے جیسے ہی سہارا ہٹا سب گر گئے۔ صلوات

تو میں یہ گذارش کر رہا تھا کہ پروردگار عالم نے فرمایا کہ ہم نے ان انبیاء میں سے کچھ کو امام بھی بنا دیا ہے۔ لیکن یہ امامت کب دی ہے جب انھوں نے صبر کا مظاہرہ کیا۔ اتنے کمالات کے بعد بھی منصب امامت کے لئے کمال صبر درکار ہے اس کے

بغیر پروردگارِ عالم کسی کو امام نہیں بناتا ہے۔ کسی کو قوم کا قائد نہیں بناتا ہے۔ جب خدا بنائے گا تو کمال صبر کو دیکھنے کے بعد ہی بنائے گا۔

یہاں تک آنے کے بعد اب دو لفظوں میں ایک مختصر تاریخ صبر سُن لیجیے اور صبر امام حسینؑ کو پہچان لیجیے۔ عنوان اور سُرخی بیان کرنا میرا کام ہے منطبق کرنا آپ کا کام ہے۔

پروردگار عالم نے صابرین کی ایک فہرست بیان کی ہے جن کا ذکر خود قرآن مجید میں کیا ہے کہ یہ ہمارے صابر بندے تھے۔

جناب ایوبؑ۔ اللہ کہتا ہے ہم نے ایوبؑ کو صابر پایا ہے۔ بہترین بندہ ایوبؑ ہے۔ تو اللہ نے جناب ایوبؑ کو صابر ہونے کی سند دی ہے۔ صبر ایوبؑ تو سُنا ہوا ہے آپ کا۔ مثل مشہور ہے:

"کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوبؑ اے ساقی"

جناب ایوبؑ کی زندگی میں جب مسئلہ ناموس سامنے آگیا، تو جناب ایوبؑ ٹھہر گئے اب قدم آگے نہیں بڑھتے تو جس کو خدا نے صابر قرار دیا ہے اس کے صبر کی حد بھی بتا دی ہے۔

ایک منزل ہے کہ جہاں صبر ایوب رُکا ہوا ہے۔

دوسری منزلِ صبر۔ جناب ابراہیمؑ فرماتے ہیں:

بیٹا! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تمھیں ذبح کر رہا ہوں۔ بتاؤ تمھاری رائے کیا ہے؟

کہا۔ بابا! جو خدا نے کہا ہے وہ آپ کریں۔ انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔

وہ صبر ایوبؑ تھا جو ناموس کے مرحلہ پر ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ صبر اسماعیل ہے جہاں کہتے ہیں۔ بابا، میں صبر کروں گا۔ مگر کیسے؟ باپ بیٹے کو منزلِ تسلیم میں لے آیا۔ اور دونوں نے اپنے کو خدا کے حوالے کر دیا۔ لیکن جب ذبح کرنے کا وقت آیا تو قرآن کہتا ہے تَلَّهٗ

لِلْجَبِيْنِ ابراہیمؑ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹادیا۔

دیکھئے عام طور سے ذبح کرنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جو جانور بھی ذبح کیا جاتا ہے اسے سیدھے سیدھے لٹا کر گلے پر چھری پھیر دی جاتی ہے۔ مگر جب جناب ابراہیمؑ اور جناب اسمٰعیل کا واقعہ قرآن مجید نے بیان کیا تو کہا کہ ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ کو لٹایا مگر پیشانی کے بل لٹایا۔ کیوں؟۔ مفسرین نے اس کی توجیہ کی ہے کہ شائد اسماعیلؑ نے کہا بابا! آپ مجھے سیدھا لٹا کے ذبح نہ کریں۔ اس لئے کہ آپ باپ ہیں، میں بیٹا ہوں اور باپ کے دل میں بیٹے کی بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ اگر میرا آپ کا سامنا رہے گا تو کہیں آپ کی قوتِ صبر جواب نہ دے جائے، لہٰذا آپ مجھے منھ کے بل لٹا دیجئے تاکہ آپ اطمینان سے چھری چلا سکیں اور میں اطمینان سے گلا کٹا سکوں۔ ابراہیمؑ نے لٹا دیا اور گلے پر چھری رکھ دی۔ تو پروردگار نے آواز دی قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ابراہیمؑ! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ یہی تو خواب دیکھا تھا کہ میں ذبح کر رہا ہوں۔ تو تم نے چھری چلادی۔ ذبح کرنے کا کام ہوگیا۔ اب ذبح ہو جانا شرط نہیں ہے۔ اب ہم روک رہے ہیں کہ ہم نیک عمل کرنے والوں کو یونہی جزا دیتے ہیں۔ مالک نے ابراہیمؑ کا ہاتھ پکڑ لیا تو صبر اسماعیل بھی چھری چلنے پر رُک گیا اور گلا نہیں کٹنے پایا۔

تو عزیزو! جب قرآن کے دونوں صابروں کو پہچان لیا تو بتاؤ کہ اس صابر کو کیا کہا جائے جو گلا کٹنے کو بھی برداشت کرے اور ناموس کی مصیبت کو بھی برداشت کرے۔ اس مقام پر تو آکر کہنا پڑے گا کہ جہاں سارے انبیاء کا صبر نہ پہونچ سکا وہاں صرف صبر حسینؑ ابن علیؑ تھا۔ اور یہ خالی دعویٰ نہیں ہے اس کا قرآنی ثبوت ہے اور ثبوت کے لئے میں ایک نئی بات عرض کرنا چاہتا ہوں اسے نگاہ میں رکھئے گا۔

اسماعیل بچ گئے۔ پروردگار عالم نے اپنے حکم کو منسوخ کر دیا اور کہا بس ابراہیمؑ اتنا ہی کافی ہے، اب مزید بیٹے کا گلا کاٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اب جو ابراہیمؑ نے آنکھوں سے پٹی کھولی اور دیکھا اسماعیلؑ زندہ ہیں تو رنجیدہ ہو گئے۔

خدایا! میں نے بچانے کے واسطے نہیں لٹایا تھا، میں نے قربانی کے واسطے لٹایا

تھا۔ شائد میری قربانی تیری بارگاہ میں مکمل نہ ہو سکی۔ حالانکہ اگر یہ قربانی مکمل ہو جاتی تو مجھے اجر و ثواب زیادہ ملتا۔

پروردگار نے کہا کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے اس کے بدلے میں ایک بڑی قربانی رکھ دی ہے۔ اگر صبر ہی کرنا ہے تو اسماعیل کی قربانی پر نہیں۔ جو بڑی قربانی پیش ہونے والی ہے اس پر صبر کرنا۔ تو قربانی حسینؑ ہے بڑی قربانی۔ اور قربانی اسمٰعیل ہے اس کے مقابلے میں ابتدائی قربانی۔ وہ پہلا مرحلہ تھا جو نامکمل رہ گیا اور یہ آخری مرحلہ ہے جو مکمل ہو گیا ہے تو چونکہ قربانی حسینؑ کو بڑا بننا تھا لہٰذا قربانی اسماعیل میں کوئی بات ایسی نہ رہ جائے جو قربانی حسینؑ میں نہ ہو۔ یعنی جتنی باتیں یہاں ہیں وہ سب قربانی حسینؑ میں ہونی چاہئیں اور کچھ زیادہ بھی ہونا چاہیئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ ابتدائی قربانی ہے اور وہ بڑی مکمل قربانی ہے۔

اگر یہ نکتہ آپ کے ذہن میں ہے تو آئیے دیکھئے قربانی اسماعیلؑ میں اسماعیلؑ کو پیشانی کے بل لٹایا گیا۔ یعنی قربانی ابتدائی منزل میں تھی۔ تو کسی دوسرے نے لٹایا۔ لیکن جب آخری مرحلہ آئے گا تو کسی دوسرے کی ضرورت نہ ہوگی۔ میں سوچ رہا تھا کہ حسینؑ نے قربانی کے لئے سجدہ کا انتخاب کیوں کیا۔ گویا حسینؑ آواز دے رہے تھے کہ خود سجدہ کروں گا اور میں خود پیشانی کو خاک پر رکھ کر راہِ خدا میں سر قربان کروں گا۔

اب صبر کا آخری نتیجہ۔ "اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ" جو صبر کرنے والے ہیں ان کے لئے پروردگار کی طرف سے صلوات بھی ہے اور رحمت بھی ہے۔

پروردگار انھیں تین طرح کے انعامات سے نوازتا ہے۔ صلوات، رحمت اور ہدایت۔ وہ ہدایت یافتہ بھی ہیں اور قابلِ رحمت بھی ہیں اور حقدارِ صلوات بھی ہیں۔

توجہ کی آپ نے، اگر انبیاء کرام صلوات کے قابل ہیں تو جس کا صبر انبیاء کرام سے بڑھ جائے وہ کس طرح قابل صلوات نہ ہوگا۔

ہم سے پوچھتے ہیں کہ حسین کو علیہ الصلوٰۃ والسلام کیوں کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ہم نہیں کہتے ہیں پروردگار کہتا ہے کہ جو صبر کرنے والے ہیں ان کے لئے صلوات ہے۔ تو یا حسینؑ جیسے صابر پر صلوات پڑھو یا قرآن کا انکار کردو۔ ورنہ اگر قرآن پر ایمان رہے گا تو جو ایسا صابر ہوگا اسے صلوات کے قابل کہنا ہوگا۔ رحمت کے لائق ماننا ہوگا۔ ہدایت یافتہ تسلیم کرنا ہوگا۔ صلوات

بس عزیزانِ محترم! میں بیان کو آخری منزل تک لے آیا۔

ایک وہ باپ ہوتا ہے جو بیٹے کی قربانی پر یوں صبر کرتا ہے کہ بیٹا منزلِ ذبح میں آگیا اور پھر زندہ رہ گیا۔ اور ایک وہ باپ ہوتا ہے جو منزلِ صبر میں یوں قدم رکھتا ہے کہ آواز دیتا ہے بُنَیَّ تَقَدَّمْ بیٹا چاہنے والے کام آچکے۔ میرے لال اصحاب و انصار مارے گئے۔ اب بنی ہاشم کی قربانی کا مرحلہ ہے۔ میرے لال اب تم جاؤ کہ تمہارے میدان میں جانے میں میرا جذبۂ صبر بھی ہے اور تمہارا جذبۂ قربانی بھی ہے اور پھر دشمن کے سامنے اتمامِ حجت بھی ہے کہ تم سے زیادہ پیغمبرؐ سے مشابہ کوئی نہیں ہے بیٹا تم جاؤ۔

علی اکبرؑ کب سے منتظر کھڑے ہوئے ہیں کہ بابا اجازت دیں اور میں مرنے کے لئے میدان میں جاؤں۔

علی اکبرؑ تیار ہوئے میدان میں جانے کے لئے۔ کون جانے کہ باپ کے دل کا کیا عالم ہے۔ عزیزو! آج کی اس مجلس کے امتیازات میں سے یہ ہے کہ ماشاءاللہ ہزارہا ہزار سامعین میں اگر آپ حساب لگائیں تو اس پورے مجمع میں بوڑھے افراد تو شاید انگلیوں پر گنے جانے کے قابل ہوں گے۔ اسّی فیصد مجمع تو جوانوں کا ہے۔ یہ تو قدرِ جوانی جانتے ہیں۔ یہ تو جوانی کے حوصلے جانتے ہیں۔ یہ جوانی کی اُمنگیں جانتے ہیں۔ یہ پہچانیں کہ وہ کڑیل جوان کیسا تھا۔ جو راہِ خدا میں اپنی جوانی قربان کررہا تھا۔

حسینؑ نے کڑیل جوان کو میدانِ جنگ کے لئے آمادہ دیکھا تو فرمایا بیٹا! تم میدان میں جانے کے لئے تیار ہوگئے، پہلے جاکے پھوپھی سے رخصت ہوکے آؤ۔ علی اکبرؑ چلے آئے۔ خیمہ میں آئے اور آکے ایک منظر کے سامنے کھڑے ہوگئے۔

اجازت دیدیجئے۔

فرمایا، میرے پاس کیوں آئے ہو۔ پالا تو انھوں نے ہے۔ زحمتیں تو انھوں نے برداشت کی ہیں۔ مشقتیں تو انھوں نے برداشت کی ہیں۔ ان کے پاس جاؤ۔

علی اکبرؑ ادھر مڑ گئے۔ پھوپھی اماں! اب مرنے کی اجازت دیدیجئے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ میرا بابا مصائب میں گھرا ہوا ہے۔

ثانیٔ زہراؑ نے بیٹے کو سر سے پیر تک دیکھا۔ علی اکبرؑ! کیا میں نے اسی دن کے واسطے تم کو پالا تھا کہ تم مجھ سے مرنے کی رضا لینے کے لئے آؤ گے؟

کہا پھوپھی اماں اگر آپ اجازت نہ دیں گی تو میں نہ جاؤں گا۔ لیکن ایک بات آپ بتا دیجئے کہ اگر محشر میں دادی نے پوچھ لیا کہ علی اکبرؑ کی زندگی زیادہ عزیز تھی یا میرا حسینؑ، تو میں تو کچھ نہ کہوں گا دادی کو آپ ہی جواب دیدیجئے گا۔

بس یہ سننا تھا کہ ثانیٔ زہراؑ نے فرمایا۔ جاؤ میرے لال جاؤ۔ جاؤ بیٹا جاؤ۔

پھوپھی نے اجازت دے دی۔ ہر معظمہ نے رخصت کر دیا۔ اب علی اکبرؑ چلنا چاہتے ہیں مگر جیسے ہی خیمہ سے نکلنے کا ارادہ کیا۔ ایک مرتبہ بیبیاں آگے بڑھیں۔ علی اکبرؑ! ایک لمحے کے لئے ٹھہر جاؤ ہم قطار بنالیں تم ہمارے درمیان سے گذر جاؤ تاکہ ہم سب تمھیں الوداع کہہ دیں۔

علی اکبرؑ درمیان میں آئے، سیدانیوں نے حلقہ بنایا۔ ایک مرتبہ بیبیوں نے کہا علی اکبرؑ! جاتے تو ہو مگر ہماری غربت کا خیال رکھنا۔ ہماری بیکسی کا خیال رکھنا۔

علی اکبرؑ نے آواز دی بیبیو! تمھیں اپنی غربت کا خیال ہے اور میرے بابا کی غربت کا خیال نہیں ہے۔

ہر طرف سے آواز آئی۔ الوداع۔ الوداع۔ جاؤ اکبر جاؤ۔

سنو سنو اولاد والو! اکبرؑ آگے بڑھے۔ خیمہ کے دروازہ کے قریب۔ پردہ اٹھایا۔ جیسے ہی نکلنے کا ارادہ کیا کسی نے دامن پکڑ لیا۔ اکبر کہاں جا رہے ہو؟ پلٹ آئے، دامن چھڑایا، پھر خیمے کا پردہ اٹھایا۔ نکلنا چاہا پھر کسی نے دامن تھام لیا۔ ہائے یہ

وقت کس کی زندگی میں آیا ہوگا۔ کون اس مصیبت کو پہچانے گا۔ مگر میرے عزیزو! ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے روایت میں بہت دیکھا مگر کوئی نام نہ ملا کہ کون ہے جو علی اکبرؑ کو بار بار روک لیتا ہے ـــــ مگر میرا ایک اندازہ ہے کہ اگر کسی معظمہ نے روکا ہوتا تو بازو تھاما ہوتا۔ یہ دامن پکڑ کر کون کھینچ رہا ہے۔ عجب نہیں کہ چھوٹی بہن یہ کہہ رہی ہو بھیا۔ بھیا علی اکبرؑ کہاں جا رہے ہو۔

خیمہ کا پردہ اُٹھا۔ علی اکبرؑ باپ کے سامنے آئے۔ حسینؑ نے سجایا، کمر سے تلوار لگائی۔ بازو تھام کے گھوڑے پر بٹھایا۔ اے میرے لال جاؤ، مگر جب تک سامنا ہے مُڑ مُڑ کے دیکھتے رہنا۔

بس آخری مرحلہ۔ اکبر چلے تھوڑی دور بڑھے تھے کہ آہٹ محسوس کی۔ اب جو مُڑ کے دیکھا تو کیا دیکھا کہ ضعیف باپ کر تھامے چلا آرہا ہے۔

بابا! آپ نے تو رخصت کر دیا تھا، اب آپ کیوں آرہے ہیں؟

فرمایا، بیٹا اگر تم صاحب اولاد ہوتے تو تمھیں اندازہ ہوتا کہ جوان بیٹے کو رخصت کرنے کے بعد باپ کے دل کا کیا عالم ہوتا ہے۔

جاؤ اچھا جاؤ بیٹا۔

علی اکبرؑ میدان میں آئے۔ جہاد کا ایک مرحلہ تمام ہوا۔ ماں کی دعا مستجاب ہوئی۔ پلٹ کر درِ خیمہ پر آئے۔

بابا پیاس مارے ڈال رہی ہے۔

حسینؑ نے کہا بیٹا اپنی زبان میرے دہن میں دے دو۔

علی اکبرؑ نے زبان دہن میں رکھی اور کھینچ لی۔

کہا اے بیٹا یہ کیا؟

کہا بابا! آپ کی زبان میں تو کانٹے پڑے ہوئے ہیں۔

حسینؑ نے کہا اچھا بیٹا اب جاؤ۔ اب تمھیں ساقیٔ کوثر سیراب کریں گے۔

بس آخری مرحلہ، دو منٹ اور مجلس تمام ہو رہی ہے۔ اے تابوت علی اکبرؑ

اٹھانے والو! حسینؑ کا کڑیل جوان معروفِ جہاد ہے۔ جب زخموں سے چوُر ہو کے گرنے لگا تو باپ کو زحمت نہیں دی۔ آواز دی بابا میرا آخری سلام لے لو۔

حسینؑ بیٹے کی آواز سن کے چلے۔ آواز دیتے جارہے ہیں یا علیؑ۔ یا علیؑ۔ گرتے پڑتے کڑیل جوان کے سرھانے پہونچے۔ سر اٹھا کے زانو پر رکھا۔ دیکھا جوان بیٹے کا سارا جسم تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔ چاہتے ہیں کہ خیمہ میں لیجائیں مگر اب جو اٹھانے کا ارادہ کیا تو طاقت نے جواب دے دیا۔ آواز دی بنی ہاشم کے بچو، آؤ مجھے سہارا دو۔ خیمے سے اور تو کوئی نہ آیا۔ البتہ چادر سنبھالے ہوئے بہن آگئی۔ بھیا میں آگئی۔ حسینؑ نے کہا زینبؑ تم کیوں آگئیں؟ کہا بھیّا! میں پالنے والی ہوں، گودی میں اٹھالوں گی۔

حسینؑ نے کہا زینبؑ پلٹ جاؤ ابھی میں زندہ ہوں۔ میرے بعد خیمے جلیں گے، چادریں چھنیں گی اور تمھیں بے مقنع وچادر خیمہ سے نکلنا ہوگا۔

وَاعَلِیَّ اَکْبَرَاہُ، وَاعَلِیَّ اَکْبَرَاہُ

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

گیارہویں مجلس

عبادت امام حسین علیہ السّلام

"حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اللہ اس سے محبت کرے جو میرے حسینؑ سے محبت کرے۔"

سرکارِ دو عالمؐ کے اس ارشادِ گرامی کی روشنی میں عرفانِ حسینؑ سے متعلق جو سلسلۂ کلام آغازِ محرم سے آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا ——— اس کے آخری مرحلہ پر کچھ باتیں آج کی رات کی مناسبت سے عبادت سید الشہداء کے بارے میں گذارش کرنا ہیں۔ یہ رات درحقیقت عبادت کی رات ہے۔ امام حسینؑ نے عصرِ عاشور ابن سعد کی طرف سے حملے کا حکم دئے جانے کے بعد اپنے عزیز بھائی علمدارِ کربلا سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا تھا:

"عباس! تم سوار ہو کر فوجِ یزید کی طرف جاؤ اور جا کر دریافت کرو یہ فوجیں چاہتی کیا ہیں؟ ان کا ارادہ کیا ہے؟"

علمدارِ کربلا مولا کا حکم پانے کے بعد بیس سواروں کو لے کر ابن سعدؒ کے پاس آئے اور پوچھا تیرا ارادہ کیا ہے؟ تو چاہتا کیا ہے؟

اس نے کہا ہاشمی جوانو! امیر ابن زیاد کا حکم ہے، جو شمرؒ لے کر آیا ہے کہ اب حسینؑ سے کسی طرح کے صلح کی گفتگو نہیں کرنا ہے بلکہ ان کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا ابھی ابھی بیعتِ یزیدؒ کریں اور یا حملہ کر دیا جائے اور ان کا سر کاٹ کر حاکمِ وقت کے

سامنے بھیج دیا جائے۔

علمدار کربلا نے ساری گفتگو سُنی اور پلٹ کر امام حسینؑ کی خدمت میں آئے اور کہا مولا ظالموں کا یہ کہنا ہے کہ اگر حسینؑ بیعت نہیں کرتے ہیں تو جنگ اسی وقت ہو گی۔ امام حسینؑ نے فرمایا عباس جاؤ اور اپنی حجت تمام کرو اور اتمام حجت کے لئے ان کو سمجھاؤ کہ اگر ممکن ہو تو اس جنگ کو ایک رات اور آگے بڑھا دیا جائے اس لئے کہ ہم اس رات کو عبادت الٰہی میں گذارنا چاہتے ہیں اور دشمن یہ جانتا ہے کہ ہمیں عبادت الٰہی سے کتنی محبت ہے۔ اس رات کو ہم تین کاموں میں گذارنا چاہتے ہیں۔ نُصَلِّیْ لِرَبِّنَا اپنے پروردگار کے لئے نماز پڑھنا چاہتے ہیں۔ مالک کی بارگاہ میں دعا کرنا چاہتے ہیں اور اس رات کو استغفار میں گذارنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ ساری دنیا پہچانتی ہے کہ حسینؑ کو عبادت الٰہی سے کتنی محبت ہے۔

علمدار نے آکر پیغام پہونچایا۔ ابن سعدؔ کو ساری پریشانی یہ ہے کہ شمرؔ اس کے ہاتھوں سے فوج کی کمان لینا چاہتا ہے اور اسی نے ابن زیاد کو یہ خبر پہونچائی ہے کہ ابن سعدؔ حسینؑ سے صلح و مصالحت کی گفتگو کر رہا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ یہ آپ کے احکام پر عمل کرنے والا نہیں ہے اور یہ سمجھانے کے بعد ابن زیاد سے نیا فرمان لے کر شمرؔ ۹ محرم کو کربلا میں دوبارہ وارد ہوا ہے۔ اب ابن سعد کے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ یا تو جنگ چھیڑ دے اور ابھی حملہ کر دے یا فوج کی کمان شمرؔ کے حوالہ کر دے۔

ابن سعد فوج کی قیادت چھوڑنا بھی نہیں چاہتا ہے اور حالات ایسے ہیں کہ جنگ چھیڑنا بھی نہیں چاہتا ہے۔ لہٰذا اس پیغام کو سُننے کے بعد اس نے شمرؔ کی طرف دیکھا اور کہا حسینؑ ایک رات کی مہلت چاہتے ہیں عبادتِ الٰہی کے لئے، کیا خیال ہے؟ شمرؔ یہ چاہتا ہے کہ ابن سعدؔ انکار کر دے تاکہ میں فوج کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لوں اور خیام حسینی پر حملہ کر دوں، اس لئے اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف یہ کہا کہ آپ رئیس ہیں۔ آپ امیر ہیں۔ آپ فوج کے سربراہ ہیں۔ آپ ذمہ دار ہیں۔ یہ فیصلہ آپ کریں۔ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟ منتظر ہے ابن سعدؔ کے جواب کا۔ ابھی یہ گفتگو شمرؔ

اور ابن سعدؔ میں ہو رہی تھی کہ فوج کے دوسرے افسر بول پڑے، یہ تو ابن بنت رسولؐ ہے۔ حسینؑ تو فرزند فاطمہؑ ہیں۔ اگر ہمارے مقابلے میں ترک و دیلم کے غلام ہوتا اور وہ بھی ہم سے کہتے کہ عبادت کے لئے مہلت چاہتے ہیں تو ہم کبھی منع نہ کرتے۔ کس قدر شرم کی بات ہے۔ اللہ کا بندہ اپنے خدا کی بندگی کرنا چاہتا ہے اور ہم اس کے خیموں پر حملہ کر دیں یہ شرافت کے خلاف ہے، یہ انسانیت کے خلاف ہے۔

ابن سعدؔ کو سہارا مل گیا، اُس نے کہا ہاں تم لوگ ٹھیک کہتے ہو۔ ایک رات کی مہلت دے دی جائے۔ شمرؔ نے پھر سمجھایا ایسا تو نہیں ہے کہ حسینؑ رات بھر میں کوئی نئی تیاری کر لیں اور صبح کو لڑنا مشکل ہو جائے۔ شاید ابن سعدؔ کے سامنے شمرؔ کی اس حماقت کا بھی اک جواب تھا جو فرزند رسولؐ نے شب عاشور اعلان کیا تھا۔ جو جانا چاہتا ہو وہ چلا جائے۔ ہم نے مہلت فوجیں اکٹھا کرنے کے واسطے نہیں لی ہے۔ ہم نے مہلت صرف عبادت الٰہی کے لئے لی ہے کہ زندگی کی آخری رات بھی عبادت الٰہی میں گذر جائے جیسے حسینؑ کی ساری زندگی عبادت الٰہی میں گذری ہے۔

عزیزو! یہ رات عبادت کی رات ہے۔ اس رات کو اصحاب حسینؑ نے اس حالت میں گذارا ہے کہ مورخ کربلا کہتا ہے لَھُمْ دَوِیٌّ کَدَوِیِّ النَّحْلِ۔ خیام حسینی سے تسبیح و تہلیل و ذکر خدا و عبادت و تلاوت قرآن کی آوازیں ایسے بلند ہو رہی تھیں جیسے شہد کی مکھی کے چھتے سے آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ فوج دشمن میں جنگ کی تیاری اور خیام حسینی میں عبادت الٰہی۔ یہی فرق ہے اُن افراد کے درمیان جو دنیاداری کے لئے لڑا کرتے ہیں اور اُن کے درمیان جو دین کی بقا کے لئے جہاد کیا کرتے ہیں۔

یہ اس موضوع کی بنیاد ہے جس کے بارے میں چند جملے مجھے گذارش کرنا ہیں، ورنہ رات اس سے زیادہ تفصیل کی متحمل نہیں ہے اور ایک بات بطور یاددہانی اگرچہ آپ حضرات کو معلوم ہے ——— اور مسلسل روز اوّل سے اعلان ہو رہا ہے لیکن بہرحال کچھ ذمہ داریاں میری بھی ہیں اس لئے یہ دو لفظیں گذارش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس ملک میں رہتے ہیں اور ایک عرصہ سے رہتے ہیں۔ اس مجمع میں وہ بھی ہیں جو اس سال آئے

ہیں' اور وہ بھی ہیں جو ماشاء اللہ دس بیس سال سے یا اس سے زیادہ زمانے سے اس ملک میں زندگی گذار رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جتنا تعاون عزائے حسینؑ کو اس ملک میں حاصل ہے' کم سے کم آس پاس جہاں تک نظر جاتی ہے کہیں اتنا تعاون ہمیں نظر نہیں آتا ہے۔ مومنین کی بستیوں کا ذکر نہیں ہے۔ اتنا تعاون کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ اس ملک میں کوئی سرکاری اجتماع بھی سڑک پر نہیں ہوتا ہے چہ جائیکہ مجلس عزا۔ تو اگر حکومت ہمارے ساتھ اتنا تعاون کرتی ہے' ہمارے واسطے اتنے اسباب فراہم کرتی ہے' ہمارے واسطے اتنی زحمتیں برداشت کرتی ہے ایک فرش عزا کے لئے' تو اس فرش عزا کی بقا کے لئے کچھ نہ کچھ قربانی آپ کو بھی دینا ہوگی۔ ظاہر ہے کہ کوئی اسلامی حکومت کوئی ایسی بات کسی سے نہیں کہہ سکتی ہے جو اس کے مذہب کی بنیادوں کے خلاف ہو' یا اس کے واجبات کے خلاف ہو۔ نہ کوئی کہنے والا ہے' نہ کوئی اس کا ماننے والا ہے۔ ممکن نہیں کہ کوئی مسلمان' مسلمان سے مطالبہ کرے کہ توحید خدا چھوڑ دو۔ ایسا کہنے والا کوئی مسلمان نہیں ہو سکتا ہے' نہ حاکم نہ عوام۔ لیکن وہ باتیں جو فرائض میں شامل نہیں ہیں' صرف ہمارے جذبات کے اظہار کے لئے ہیں تو اگر حالات سازگار ہوتے ہیں تو جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے' اور اگر حالات اجازت نہیں دیتے ہیں تو جذبات کو روکا جاتا ہے اس فرش عزا کی بقا کے لئے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہمارے جذبات کہیں چلے گئے ہیں۔ نہیں' بلکہ ہمارے جذبات جیسے تھے ویسے ہی ہیں' اور جب کبھی وقت آئے گا تو راہ خدا میں کربلا والوں کے نام پر جان دینے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن اگر ابھی جان دینے کا وقت نہیں آیا ہے تو ہماری مالی قربانی بھی حسینؑ کی بارگاہ میں بڑی قیمت رکھتی ہے۔ ابھی حسینؑ ہم سے جان کا مطالبہ نہیں کر رہے ہیں' ابھی مذہب ہم سے گلا کٹانے کا تقاضا نہیں کر رہا ہے۔ ابھی ہمارے فرائض میں خون بہانا شامل نہیں ہے۔ ابھی ہمارے فرائض میں فرش عزا کا قیام ہے۔ جان دینے کے بجائے مال خرچ کیجئے۔ جیب میں ہاتھ ڈالئے' پیسے نکالئے تاکہ یہ فرش عزا جیسے قائم ہے ویسے ہی قائم رہے اور اس سے بہتر طریقہ سے قائم رہے۔ آپ یقین کریں کہ آپ کی برادری کے

مومنین بھی آپ کے جذبہ پر غبطہ کرتے ہیں۔ جو مومنین کرام ہیں، جو خود عزادار سید الشہداء ہیں، وہ بھی اس کو دیکھ کے تعجب کرتے ہیں کہ اتنے مومنین ماشاء اللہ ایک مقام پر جمع ہو جاتے ہیں فرزندِ فاطمہؑ کا غم منانے کے لئے۔

میرا تعلق چونکہ بہر حال ہر برادری سے رہتا ہے لہٰذا میں جانتا ہوں — اور آپ کے لئے یہ ایک بہترین خبر ہے جو میں آپ کو سُنا رہا ہوں۔ جتنی قومیں ہیں۔ یہاں جتنی برادریاں ہیں۔ جتنی قسم کی زبانیں بولنے والے ہیں، جن سے میرا کوئی بھی تعلق ہے، ہر آدمی نے باتفاق کلمہ ایک ہی بات کہی ہے کہ عزائے سید الشہداءؑ کی رونق اور عزائے حسینؑ کا واقعی قیام اگر ہے اس ملک میں، تو آپ کی برادری کے دم سے ہے کہ جن کو دیکھ کے دُنیا کی ہر قوم پہچان رہی ہے کہ یہ ہیں حسینؑ کے عزادار۔ ورنہ سب تو بند کمروں میں ذکر حسینؑ کرنے والے ہیں، سب تو بند مکانات میں حسینؑ کا ذکر کرنے والے ہیں۔ تو عزیزو! اگر ہماری اس عزاداری ہی سے رونق عزا ہے۔ یہی ہماری دنیا کی عزت بھی ہے اور یہی ہماری آخرت کی عزت بھی ہے۔ تو کوئی ایسا کام نہ ہونے پائے جس سے اس فرشِ عزا پر حرف آجائے۔ ایسے جذبہ کی کوئی قیمت نہیں ہے جو فاطمہؑ کی بارگاہ میں جواب دہ بنا دے۔ لہٰذا ہر اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے جس سے خدا نہ کردہ اس فرش کو کوئی نقصان پہونچ جائے۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھیے گا۔

آج آپ کے پاس ایک چھوٹی سی جگہ ہے، ایک چھوٹی سی عمارت ہے جو عزاخانہ کے نام پر ہے۔ اگر خدا نہ کردہ یہ عزاخانہ بھی باقی نہ رہ گیا، یہ جگہ بھی باقی نہ رہ گئی تو پھر آپ کو اس جگہ پر کون فرش بچھانے دے گا۔ لہٰذا ہماری پہلی ذمہ داری ہے کہ ایک لاکھ چالیس ہزار درہم کیا ہے اگر دو چار لاکھ بھی دینا پڑے تو ہم اتنا خرچ کریں گے۔ اپنے اوپر جبر کریں گے، زحمت برداشت کریں گے اور بہر حال اس فرش عزا کے قیام کا انتظام کریں گے۔ اگر آپ کو تھوڑی تکلیف پہونچ جائے، کچھ اپنے اخراجات کو روکنا پڑے، اپنے مصارف کو کم کرنا پڑے،

اپنے بچوں کے آرام کا انتظام نہ کرسکیں۔ نہ کیجیے، فرشِ عزا کو قائم کیجیے، عزائے حسینؑ کو قائم کیجیے۔ بچوں کو بہلا لینا بہت آسان ہے، گھر والوں کو سمجھا لینا بہت آسان ہے، فاطمہ زہراؑ کو جواب دینا آسان نہیں ہے۔

مرکزِ حسینی کے خادمین (والنٹیرز) آپ کے سامنے آ رہے ہیں۔ یہ شبِ عاشور ہے اس کے کارِ خیر کی عظمت الگ ہے۔ جیسے نمازوں کے لئے شبِ قدر، تلاوتِ قرآن کے لئے شبِ قدر ہے، ویسے ہی حسینیت کی خدمت کے لئے شبِ عاشور ہے۔

اور یہ بات بھی میں اپنے عزیز سامعین کے سامنے، اپنے جوانوں، بچوں اور بزرگوں کے سامنے کہنا چاہتا ہوں کہ الحمدللہ آپ کے جذبہ کی بنا پر۔ آپ کے تعاون کی بنا پر یہ جو آپ نے چھوٹا یا بڑا تعاون کیا ہے۔ سو درہم دئے ہیں یا پچاس درہم دئے ہیں یا دس درہم دئے ہیں یا دو سو درہم دئے ہیں یا پانچ سو دئے ہیں۔ جو کچھ بھی آپ نے دیا ہے۔ ہم دو سال سے اس منزل سے گذر رہے ہیں بلکہ زیادہ ہوگئے جب پہلی مرتبہ مرکز کرایہ پر لیا گیا تھا تو جس نے سنا کہ ایک لاکھ چالیس ہزار درہم کرایہ ہے تو جو میرے ملنے والے صاحبانِ حیثیت تھے، صاحبانِ شخصیت تھے انھوں نے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ اتنا سرمایہ ایک لاکھ چالیس ہزار درہم آپ کہاں سے فراہم کریں گے؟ مجالس کا خرچ الگ۔ دیگر انتظامات الگ۔ اور دوسرے کام الگ۔ تبرکات الگ اور بھی جتنے کام ہوتے ہیں وہ سب الگ۔ آپ کے لئے تو وہی بہت بڑی بات ہے۔ آپ اتنا بڑا کرایہ کہاں سے لا کے دیں گے۔ تو میں نے اپنے تمام ملنے والوں سے جو یہاں کے اہلِ وطن بھی ہیں، پیسے والے بھی ہیں، حیثیت والے بھی ہیں، شخصیت والے بھی ہیں سب کو ایک ہی جواب دیا تھا۔ گستاخی معاف، جس دن آپ کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں گا یہ ہاتھ حاضر ہے کاٹ دیجیے گا۔ اور ہمارے مرکز کی انتظامیہ اس بات کی گواہی دے گی کہ میں نے پہلے دن زبانی بھی کہا تھا اور منبر سے بھی اعلان کیا تھا کہ خبردار کوئی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے نہ جائے اور اگر کوئی کسی کے گھر سے پیسہ مانگ کے لائے گا تو میں واپس کر دوں گا۔ میری قوم فقیر حقیر نہیں ہے

یہ مزدور ہیں ذلیل نہیں ہیں۔ یہ ہاتھ پھیلانے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ اپنی محنت کرتے ہیں اور محنت کا پیسہ کھاتے ہیں۔ نہ گدائی کرتے ہیں نہ فقیری کرتے ہیں۔ جب اپنے بچوں کے لئے گدائی نہیں کرتے ہیں تو کیا حسینؑ ابن علیؑ کے لئے گدائی کریں گے اور الحمدللہ میں کسی اور کا نہیں اِن غریبوں کا، اِن مزدوروں کا، اِن مومنین کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے میرا سر اونچا رکھا ہے۔ اور الحمدللہ کہ اس گردن پر کسی بڑے آدمی کا احسان نہیں ہے کہ کوئی کہے کہ ہم نے چندہ نہ دیا ہوتا تو مرکز نہ ہوتا، فرش عزا نہ ہوتا۔ الحمدللہ یہ قائم ہے انھیں غریبوں سے اور انشاءاللہ قائم رہے گا انھیں غریبوں سے۔ بلکہ ایک بات جو گستاخی میں میری زبان سے نکل گئی تھی، میں اُسے دُہرانا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن کیا کروں بات آہی گئی ہے۔ میں نے بعض لوگوں سے یہ بھی کہا تھا کہ الحمدللہ کام ٹھیک چل رہا ہے۔ لیکن اگر میری گستاخی کو معاف کر دیں تو میں ایک بات کہوں کہ آپ بھی حسینؑ والے ہیں، ہم بھی حسینؑ والے ہیں۔ آپ بھی مومن ہیں، ہم بھی الحمدللہ مومن ہیں۔ آپ بھی اُنھیں کے ماننے والے ہیں ہم بھی انھیں کے ماننے والے ہیں۔ آپ پیسے والے ہیں ہم غریب ہیں مگر الحمدللہ ان کے نام پر آپ کرایہ لیتے ہیں اور ہم کرایہ دیتے ہیں۔ آپ سمجھ رہے تھے کہ ہم آپ کے سامنے دست سوال پھیلائیں گے۔ الحمدللہ کہ اس کی نوبت نہیں آئی۔ لیکن یہ تو سب نے محسوس کر لیا کہ آپ نے ہم سے پیسہ لیا ہے ہم نے آپ کو پیسہ دیا ہے۔ وہ دن چلے گئے جب لوگ سوچا کرتے تھے۔ غریب ہمارے پیسوں پر پَل رہے ہیں اب تو حسینؑ نے ہمیں اتنا اونچا کر دیا ہے کہ پیسے والے ہمارے پیسے پر پَل رہے ہیں۔ صلوات

اب کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم کسی کے محتاج ہیں، کسی کے دست نگر ہیں، کچھ نہیں ہے۔ فرش عزا کا ذکر آ ہی گیا ہے تو ایک بات اور گذارش کر دوں کہ جہاں آپ بیٹھے ہوئے ہیں اِسی کے پیچھے ایک مرد مومن کا مکان ہے۔ اتفاق سے وہ بیمار تھے۔ میں ان کی عیادت کے لئے گیا تو انھوں نے مجھ سے ایک بات یاد دلائی اور کہا کہ جب وہ بیچارے بیمار تھے علاج کے لئے باہر گئے ہوئے تھے لندن کے اطراف میں۔ تو وہاں سے انھوں نے

مجھ کو ٹیلی فون کیا اور یہ کہا سید آپ سے ایک گذارش ہے کہ دعاؤں کی قبولیت کا مرکز آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں یہاں اسپتال میں داخل ہوں، میرا آپریشن ہونے والا ہے آپ سے ایک گذارش ہے کہ میری طرف سے آپ جا کے علم ابوالفضلؑ تھام کے یہ کہہ دیں کہ علیؑ کے لال مجھ غریب پر آپ رحم کریں۔ اپنے مالک سے آپ گذارش کریں پروردگار عالم ہم کو شفا عنایت فرمائے۔ اس کے بعد جو ہمارے امکان میں ہوگا ہم آپ کی خدمت کریں گے۔ میں نے ان کی طرف سے جا کے گذارش کر دی۔ الحمد للہ کہ یہاں کے سارے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا لیکن وہاں سے صحت یاب ہو کے آ گئے۔ جب میں ان سے ملنے کے واسطے گیا تو انھوں نے یہ بات بیان کی کہ ایک صاحب میرے پاس آئے اور آنے کے بعد انھوں نے کہا کہ میرا ملازمت میں ایک کام رُکا ہوا ہے اور ایک عرصے میں اِدھر سے اُدھر وسائل تلاش کر رہا ہوں، مگر کہیں سے کام نہیں ہو رہا ہے۔ خالی ایک دستخط باقی ہے مگر وہ کام بھی نہیں ہو رہا ہے۔ اگر آپ اُس شعبہ میں کسی سے کچھ تعلقات رکھتے ہوں تو آپ ذرا میرے واسطے وسیلہ فراہم کر دیجئے اتنے دن سے میرا کام رُکا ہوا ہے۔ ہے آپ کے پاس کوئی واسطہ؟۔ انھوں نے کہا کہ ہاں ہاں میرے پاس واسطہ ہے۔ کہنے لگے کہ آپ کے تعلقات کس سے ہیں؟ میں نے کہا جتنے آدمی آپ سوچ رہے ہیں ان سب سے۔ بڑے آدمی سے میرے تعلقات ہیں۔ تو اس نے کہا کہ ہم کو نہیں معلوم تھا کہ آپ اتنے پہونچے ہوئے ہیں، ورنہ ہم پہلے ہی دن آپ سے کہتے۔ آج معلوم ہوا کہ آپ کے تعلقات اندر اندر بڑی شخصیتوں سے ہیں۔ للہ ہمارا یہ کام کرا دیجئے۔ کہا مگر میں کسی کے یہاں جاؤں گا نہیں۔ میرے تعلقات تو ہیں مگر میں جاؤنگا نہیں۔ کہا بھائی اگر آپ نہ جائیں گے تو کام کیسے ہوگا؟ کہا آپ چلے جائیے۔ کہا تعلقات آپ کے ہیں وہاں مجھے کون جانے دے گا۔ مجھے ان کے محل میں یا قصر میں یا مکان میں کون جانے دے گا، ارے آپ ہی چلے جائیں۔ کہا نہیں آپ چلے جائیے کام ہو جائے گا۔ کہا اچھا بتائیے آپ کا نام لے کر چلے جائیں گے تو شاید داخلہ مل جائے۔ کہا یہاں سے میرے گھر کے باہر نکلئے، برابر میں جو مکان ہے اس میں ابوالفضلؑ کا

ایک علم لگا ہوا ہے، ان سے بڑا کوئی نہیں ہے۔ آپ جائیے اور جا کے ان سے کہئے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ مرد مومن میرے پاس سے اٹھا اور اُٹھ کے وہاں گیا اور جا کے نہایت ہی خضوع و خشوع اور توجہ کے ساتھ اس نے علم تھام کے حضرت ابو الفضل ؑ کی بارگاہ میں درخواست کی اور کہا میں کوئی بڑا آدمی تلاش کر رہا تھا۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ آپ سے بڑا کون ہے۔ میں اِدھر سے غافل تھا اب میں آپ کے پاس آیا ہوں، اب یہ کام آپ کے حوالہ ہے۔

وہ شخص کہتا ہے کہ جب صبح کو میں پہونچا تو جیسے ہی میں دفتر میں داخل ہوا ویسے ہی مجھ سے کلرک نے کہا مبارک ہو، آپ کا ورقہ، آپ کا کاغذ دستخط ہو کے آگیا ہے۔ میں نے کہا بھئی ابھی تو آفس کھلا بھی نہیں ہے۔ کہا مجھے نہیں معلوم ہے یہ دیکھئے فیکس سامنے رکھا ہوا ہے۔

اس واقعہ کے بعد اس مرد مومن نے کہا کہ سید آپ لوگوں کو کیا پریشانی ہے۔ جب آپ کے پاس اتنی بڑی شخصیت ہے، تو لاکھ دو لاکھ اور پانچ لاکھ کی اوقات ہی کیا ہے۔ آپ کے پاس تو وہ ہیں کہ جب دنیا میں کوئی دینے والا نہ ہوگا تو وہ خود کیا کم ہیں ——— اسی لئے ہم نے یہ حساب لگایا ہے کہ وہ ہمیں دیں گے اور ہم پلٹا کے انھیں کی راہ میں دیدیں گے۔ وہ ہمیں دیں گے یہ ان کے کرم کا تقاضا ہے۔ ہم ان کی راہ میں لگا دیں گے یہ ہماری غلامی کا تقاضا ہے۔ یہ کام یک طرفہ نہیں ہوتا ہے یہ کام ہمیشہ دو طرفہ ہوتا ہے۔ طاقتیں خدا دیتا ہے بندہ اسی طاقت سے بندگی کرتا ہے۔ مال خدا دیتا ہے بندہ اسی مال کو خدا کی راہ میں لگا دیتا ہے۔ آل محمدؐ کا صدقہ کھاتے ہیں، آلِ محمدؐ کی راہ میں لگاتے بھی ہیں۔ صلوات

بس عزیزانِ محترم ذکر آگیا تھا تو میں نے گذارش کر دی۔ ... ورنہ یہ عبادت کی رات ہے اور اسلام میں عبادت کی دس قسمیں ہیں جو برابر آپ پڑھا کرتے ہیں۔ لیکن شائد بچے یوں نہ پہچانتے ہوں، اس لئے کہ بچوں کو جب پڑھایا جاتا ہے تو رٹا دیا جاتا ہے، وہ اس لفظ کے معنی بھی نہیں جانتے ہیں۔ بچوں کو بتایا جاتا ہے

اصول دین پانچ ہیں' فروع دین دس ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دین کسی درخت کا نام ہے جس میں جڑیں پانچ ہیں اور شاخیں دس ہیں اس لئے کہ اصل کے معنی جڑ ہیں اور فرع کے معنی شاخ۔ نہیں عزیزو! جو ہمارے بنیادی عقائد ہیں وہ ہیں پانچ اور جو اُن عقائد کی روشنی میں بندگی کے طریقے ہیں وہ ہیں دس۔ جن کو آپ فروع دین کہتے ہیں۔ یہ ہیں بندگی کے طریقے، عبادت کے طریقے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں کوئی کام بغیر نیت قربت خدا کے انجام نہیں پاسکتا ہے۔ عبادت کے معنی کیا ہیں۔ ہر وہ کام جو خدا کے لئے کیا جائے، وہی عبادت ہے۔ خدا کے لئے نہ ہو تو نماز نہیں ہے۔ خدا کے لئے نہ ہو تو روزہ نہیں ہے۔ خدا کے واسطے نہ ہو تو حج نہیں ہے۔ خدا کے واسطے نہ ہو تو زکوٰۃ نہیں ہے۔ خدا کے واسطے نہ ہو تو جہاد نہیں ہے۔ یہ سارے کام چونکہ خدا ہی کے لئے ہوتے ہیں اس لئے ان کا نام رکھا جاتا ہے عبادت۔! صلوات

اسلام میں عبادات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے نماز سے اور تمام ہوتا ہے دشمنانِ خدا سے نفرت پر۔ باقی تو آپ کو یاد ہی ہے ـــــ روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس، جہاد، نیکیوں کا حکم دینا، برائیوں سے روکنا، خاصانِ خدا سے محبت کرنا۔

میں چاہتا تھا کچھ تفصیل سے گذارش کرتا مگر وقت نہیں ہے صرف عنوان' سُرخیاں آپ کے حوالے کر رہا ہوں' جاکے سوچئے گا اسی روشنی میں تو بہت سی باتیں آپ کی سمجھ میں خود ہی آجائیں گی۔ یہ ہیں اسلام کی عبادتیں، جن کی دس قسمیں ہیں۔ اور اگر سمیٹنا چاہیں تو یوں پہچانیں کہ عبادتوں کی دو قسمیں ہیں۔ بعض عبادتیں مال کے ذریعہ ہوتی ہیں بعض میں مال کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ عبادت جو مال سے ہوتی ہے اس کا نام ہے خمس و زکوٰۃ، اور وہ عبادت جو بغیر مال کے ہوتی ہے اس کی پھر دو قسمیں ہیں۔ کبھی اپنے گھر میں ہوتی ہے کبھی خدا کے گھر میں ہوتی ہے۔ جو عبادت خدا کے گھر میں ہوتی ہے اس کا نام ہے حج، اور جو عبادت اپنے گھر میں ہوتی ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ کبھی اندر اندر ہو جاتی ہے کبھی باہر آجاتی ہے۔ اندر اندر ہو جائے تو اس کا نام ہے روزہ، اور باہر آجائے تو اس کا نام ہے نماز۔ نماز دکھائی دیتی ہے' روزہ دکھائی نہیں دیتا ہے۔

عبادتیں اپنی ذات کی حدوں میں رہ جائیں تو ان قسموں میں شامل ہو جاتی ہیں اور معاشرہ کے اندر آ جائیں تو معاشرے کے اندر عبادت کے دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ جو غلط ہے اسے ٹھیک کیا جائے، اور ایک یہ ہے کہ جو صحیح کام نہیں ہو رہا ہے اسے رائج کیا جائے۔ ایک کا نام ہے امر بالمعروف، اور دوسرے کا نام ہے نہی عن المنکر۔

ان دس موضوعات پر روشنی ڈالنے کے لئے تو شائد دس دن بھی کم پڑ جائیں گے۔ لہٰذا میں نے سُرخی آپ کے حوالہ کر دی ہے۔ اب شب عاشور کے حوالہ سے حسینؑ کی ساری عبادتوں میں سے ایک عبادت جس کا نام ہے نماز۔ نمازوں کی منزل میں جہاں امام حسینؑ ہیں، دنیا کا کوئی انسان نہیں ہے۔

نماز تین منزلوں سے گذرتی ہے:

نماز کے پہلے مرحلے کا نام ہے "قیام"۔

دوسرا مرحلہ ہے "رکوع"

آخری مرحلہ ہے "سجدہ"

تو ساری عبادتوں میں پہلا درجہ ہے نماز کا، اور نماز میں سب سے آخری درجہ ہے سجدہ کا۔ تو جس انسان کی شانِ عبادت کو پہچاننا ہو، اسے باقی عبادتوں میں کیا دیکھو گے نماز میں دیکھ لو۔ اور اگر نماز میں دیکھنا ہے تو قیام میں کیا دیکھنا ہے، رکوع میں کیا دیکھنا ہے، سجدے میں آکے دیکھو وہ کہاں ہے۔

اب جو عظمتِ عبادتِ حسینؑ کو سجدہ سے پہچاننا چاہا تو دو منظر ہمارے سامنے آئے:

حسینؑ سجدے میں یا حسینؑ سجدہ گذار کی پُشت پر۔

عظمتِ حسینؑ دونوں طرح دیکھی، جب نبیؐ سجدہ میں تھے اور حسینؑ پُشت پر تھے۔ تو حسینؑ کی ایک عظمت سامنے آئی، اور جب حسینؑ سجدہ میں آئے تو حسینؑ کی دوسری عظمت سامنے آئی۔ صلوات

ہم نے عظمتِ حسینؑ ابن علیؑ کو اس دن بھی دیکھا جب سرکار دو عالمؐ سجدہ میں تھے اور نواسہ پشت پر تھا اور جب نماز تمام ہو گئی تو لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ هَلْ نُزِّلَ عَلَيْكَ الْوَحْيُ حضورؐ! کیا کوئی وحی نازل ہو رہی تھی جو آپ سجدے میں رہ گئے اور ہم بیچارے مسلمان انتظار ہی کرتے رہ گئے؟

پیغمبرؐ نے کہا، نہیں۔ میرا نواسہ پشت پر آ گیا تھا۔

واقعہ آپ کا سنا ہوا ہے صبح و شام۔ بچہ بچہ جانتا ہے۔ میں رکنا بھی نہیں چاہتا۔ میں بیان کو آخری منزل تک پہونچانا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک لفظ ہے جو کہنا چاہتا ہوں۔ چونکہ تاریخ میں یہ فقرہ ہے کہ لوگوں نے پوچھا حضورؐ! کیا کوئی وحی نازل ہو رہی تھی؟۔ حضورؐ نے فرمایا نہیں۔ بات یہ ہے کہ میں سجدہ میں تھا اور میرا نواسہ اُسکے پشت پر بیٹھ گیا تھا۔

یعنی لوگ یہ تو سمجھ سکتے تھے کہ وحی نازل ہو اور سجدہ کو طول ہو جائے، لیکن یہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی بچہ آ کے پشت پر بیٹھ جائے گا اور یہ سجدہ کو طول دیدیں گے۔ تو پیغمبرؐ کے لئے کتنا آسان تھا کہ لوگوں کی نگاہ میں اپنی حیثیت بچانے کے لئے فرما دیتے ہاں! کسی کو کیا معلوم کہ وحی نازل ہوئی کہ نہیں یہ تو وہ جانے اور وہ جانے جو نازل کرنے والا ہے۔ فرما دیتے ہاں ہاں وحی نازل ہو رہی تھی تاکہ لوگوں کو اطمینان ہو جاتا، ورنہ لوگوں کو ہزار طرح کے اعتراضات ہوں گے کہ یہ کیسی نماز ہے۔ یہ آپ سجدہ کر رہے ہیں کہ بچوں کو کھلا رہے ہیں، یہ کیسا سجدہ ہے۔ مگر پیغمبرؐ نے صاف بتا دیا کہ میں وحی کے لئے نہیں ٹھہرا تھا، حسینؑ کے لئے ٹھہرا تھا۔ ہائے کیا عجیب نقشہ تھا کہ نبیؐ ٹھہرے تھے حسینؑ کے لئے اور ساری قوم ٹھہری تھی نبی کے لئے۔ یہ سب سر اُٹھا لیں تو نبوت سے انحراف ہو جائے، اور وہ سر اٹھا لے تو مرضیٔ خدا کو کیا کرے۔

اب میں اپنی زبان میں کہہ سکتا ہوں کہ پوچھنے والو! کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ ارے یہی تو پوچھ رہے ہو کہ کیا قرآن نازل ہو رہا تھا؟

ہاں ہاں۔ ارے قرآن ہی درمیان میں آ گیا تھا۔ فرق یہ ہے کہ تم صامت کا

تصور کر رہے تھے اور نبی ناطق کا انتظار کر رہا تھا۔ صلوات

تمہارا خیال یہ تھا کہ قرآن صامت کے لئے سجدہ کو طول دیا جا سکتا ہے اور نبیؐ یہ سمجھا رہے تھے کہ جیسے قرآن صامت کے لئے طول دیا جا سکتا ہے، ویسے ہی قرآن ناطق کے لئے بھی سجدہ کو طول دیا جا سکتا ہے۔ حسینؑ قرآن ہیں، حسینؑ قرآن ناطق ہیں۔ جب قرآن ناطق پشتِ پیغمبرؐ پر آگیا تو سرکارؐ نے سجدہ کو طول دے دیا اور یہیں سے دوسرا مسئلہ بھی حل ہو گیا اور عظمتِ حسینؑ کا دوسرا نکتہ بھی سامنے آگیا کہ دو مرتبہ دیکھا نبیؐ کو ناز برداری کرتے ہوئے۔ ایک مرتبہ سجدہ میں، ایک مرتبہ منبر پر کہ حسینؑ سامنے آ گئے تو جیسے ہی بچہ گرا، نبیؐ نے خطبہ توڑ دیا اور دونوں کا ایک ہی سبب تھا؟ نماز رُکی ہوئی تھی قرآن ناطق کے لئے، اور حدیث روک دی گئی تھی قرآن کے لئے۔ صلوات

بس عزیزانِ محترم زیادہ وقت نہیں ہے۔ اب میں بات کو آخری مرحلہ پر لے آیا۔ عبادت قربت خدا کے لئے ہے۔ بندہ مالک سے قریب ہونا چاہتا ہے اس کے یہ ذرائع ہیں جو پروردگار عالم نے معین کر دئے ہیں۔ جب ہم سے قریب ہونا ہو تو یہ ذرائع ہیں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔ ان کے ذریعہ آ کے تم مجھ سے قریب ہو سکتے ہو۔ یہ قربتِ خدا کا ذریعہ ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا کہ اگر میری قربت کے لئے ہے تو وہی ذریعہ ہوگا جسے میں نے معین کیا ہے۔ یعنی نماز کے ذریعہ قریب ہونا ہے تو وہ نماز پڑھنا جو میں نے بنائی ہے۔ ورنہ تمہاری بنائی ہوئی تم سے قریب بنائے گی، مجھ سے قریب نہیں بنائے گی۔

اگر روزے کے ذریعہ مجھ سے قریب ہونا ہے تو ویسے ہی رکھنا جیسے میں نے کہا ہے "اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی اللَّیْلِ"۔ تمہارا کوئی روزہ مجھ سے قریب نہ بنائے گا، وہی روزہ قریب بنائے گا جو میرا بنایا ہوا ہے اور یہ بات میں نے اس لئے کہی ہے کہ بہت سے بندے ہیں جو خدا سے قریب ہونا چاہتے ہیں بغیر سمجھے ہوئے کہ یہ اعمال قریب بنا بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ آج ہی ایک مردِ مومن نے

ٹیلی فون کیا اور پوچھا مولانا میں روزہ سے ہوں تو یہ بتایئے کہ یہ روزہ مغرب تک چلے گا یا بیچ میں توڑ دیا جائے گا؟

میں نے کہا یہ کون سا روزہ ہے؟

کہنے لگے۔ سُنا ہے کہ نو محرم اور دس محرم کا روزہ بہت اہمیت رکھتا ہے لہٰذا میں نے رکھ لیا ہے۔

کب ماہ رمضان گیا اور کب محرم آیا۔ پورا شوال گذر گیا روزہ نہیں یاد آیا۔ پورا ذی قعدہ کا مہینہ گذر گیا روزہ یاد نہیں آیا۔ ذی الحجہ کا مہینہ گذر گیا۔ تین مہینے سے زیادہ گذر گئے روزہ یاد نہیں آیا۔ اب یاد آیا تو خالی نو۔ دس محرم کو۔

بڑی فضیلت ہے سُنا ہے۔

ارے بھائی کس سے سُنا ہے۔؟

آپ نے اگر نہیں سُنا تو اب سُن لیجئے۔ آج ہی میں دیکھ رہا تھا اور نہایت معتبر کتاب کا حوالہ دے رہا ہوں۔ یہ موضوع میرے ٹھہرنے کا نہیں ہے۔ لیکن چونکہ عبادتوں کا ذکر آ گیا ہے تو ایک جملہ یاد رکھئے گا تاکہ مومنین کو معلوم ہو جائے، اور اگر کسی اور کو نہیں معلوم ہے تو آپ بتا بھی سکتے ہیں۔

آج ہی میں مطالعہ کر رہا تھا "صحیح مسلم" کا۔ میں کسی غلط کتاب کا حوالہ تو دیتا ہی نہیں۔ اس میں روزِ عاشور کے روزے کے بارے میں دو طرح کی روایتیں ہیں:

ایک روایت یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ جب مکہ میں تھے اُس وقت سرکارِ دو عالمؐ نے دیکھا کہ دورِ جاہلیت سے لوگ عاشور کے دن روزہ رکھ رہے ہیں، تو حضورؐ نے کہا چلو ہم بھی شامل ہو جائیں۔ لہٰذا حضورؐ بھی شامل ہو گئے سب کے ساتھ۔

آپ بغیر کسی تبصرہ کے یہ خبر سُن لیجئے کہ۔ حضورؐ نے دیکھا کہ لوگ جاہلیت سے عاشور کے دن روزہ رکھتے چلے آ رہے ہیں۔ تو حضورؐ نے بھی کہا چلو ہم بھی رکھ لیتے ہیں اور رکھ لیا۔ یہاں تک کہ پروردگار نے ماہ رمضان کے روزے نازل کر دیئے۔

دیکھئے ماہ رمضان کے روزے مدینے میں شروع ہوئے ہیں، یعنی ۱۳ تیرہ سال

تک حضورؐ وہی کرتے رہے (معاذ اللہ) جو جاہلیت میں ہو رہا تھا۔

جب ماہ رمضان کے روزے نازل ہو گئے تو لوگوں نے پوچھا حضور اب اس روزہ کا کیا ہو گا؟

فرمایا، یہ والا تو ہو گیا ہے واجب، وہ والا ہے اختیاری۔ یعنی ابھی بھی اگر طریقۂ جاہلیت کو زندہ رکھنا چاہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔

دوسری روایت یہ ہے کہ پیغمبرؐ جب مدینہ آئے ہجرت کر کے تو آپ نے دیکھا کہ عاشور کا دن آیا اور یہودیوں نے روزہ رکھ لیا۔ تو پوچھا یہودیوں سے کہ تم لوگ آج کے دن روزہ کیوں رکھتے ہو؟

کہا کہ اس دن موسیٰؑ نے فرعون کے مقابلہ میں فتح پائی ہے۔ لہٰذا ہم اس کی خوشی میں روزہ رکھتے ہیں۔

آپ نے فرمایا کہ ہم تو موسیٰ سے زیادہ قربت رکھتے ہیں۔ اچھا ہوا تم نے بتا دیا ظاہر ہے کہ موسیٰؑ تو ہماری ہی برادری کے تھے۔ تو جب تم لوگ موسیٰؑ کی خوشی مناتے ہو تو ہم بھی منائیں گے۔ ہم بھی روزہ رکھیں گے۔

مگر یہودیوں کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ تو ہمیشہ شریر رہے ہیں، انھوں نے کہنا شروع کر دیا کہ مسلمانوں کا پیغمبرؐ بھی بالآخر ہمارے ہی راستہ پر آ گیا۔

ابن عباس دوڑے ہوئے آئے۔ کہا یا رسول اللہ! ایک کام اور کر دیجیے۔

فرمایا وہ کیا؟

کہا عاشور کا روزہ تو یہودی رکھتے ہیں، آپ نے اس کو اختیار کر لیا، تو وہ طعنے دے رہے ہیں، مذاق اُڑا رہے ہیں۔ لہٰذا ایسا کیجیے کہ ایک روزہ اور جوڑ دیجیے یعنی نو اور دس دو دن رکھیے تاکہ ہم ان سے کہہ سکیں کہ نالائقو! بے ایمانو! یہ تمھاری پیروی نہیں ہے، یہ ہمارا اسپیشل قانون ہے۔ تمھارے یہاں ایک دن کا قانون ہے، ہمارے یہاں دو دن کا قانون ہے۔

تو حضورؐ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ اگر خدا نے اگلے سال تک مجھ کو زندہ رکھا

تو اگلے سال دو دن رکھوں گا۔ ۹ کو بھی اور دس کو بھی ۔ تاکہ یہودی بے ایمان، مسلمانوں کو ستا نہ سکیں۔

اس کے بعد خود صاحب کتاب نقل کرتے ہیں کہ حضور اگلے سال زندہ ہی نہیں رہے اور دنیا سے چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روزہ ایک ہی رہ گیا اور ابن عباس کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی اور یہودیوں کو طعنے دینے کا موقع رہ گیا۔

میں نے عرض کیا کہ یہ خبر بلا تبصرہ ہے۔ اب جو سمجھ سکتے ہیں ان سے پوچھئے شائد سمجھا سکیں کہ کیا پیغمبرؐ اسی دن کے لئے بھیجا گیا تھا کہ جو جاہلیت والے کریں گے وہی کرے گا، اور جو یہودی کریں گے وہ بھی کرے گا۔ مکہ میں وہ کرے گا جو جاہلیت والے کریں گے۔ مدینہ میں وہ کرے گا جو یہودی کریں گے اور ابن عباس سمجھائیں گے تو کہے گا کہ ہاں اب قانون بنے گا۔ یعنی قانون الٰہی بھی اب ابن عباس کے مشورہ سے بنے گا۔ ۱۱ھ ہجری میں حضورؐ نے رحلت فرمائی ماہ صفر کے آخر میں یا ماہ ربیع الاول کے شروع میں۔ تو گویا یہ واقعہ دو مہینے پہلے کا ہے کہ جب حضورؐ نے روزہ رکھا، اور ابن عباس نے گذارش کی کہ ایک روزہ اور رکھئے تو فرمایا کہ اگلے سال دیکھا جائے گا، اور پھر ۱۲ھ ہجری میں رکھنے کی نوبت ہی نہ آئی۔

یہ تاریخی نکتہ نوٹ کر لیجئے کہ حضورؐ نے پہلا روزہ رکھا عاشور کے دن یہودیوں کو دیکھ کے، اور اگلے سال زندہ نہ رہے ورنہ دو رکھتے۔ اب اس روایت کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ذرا مسلمانوں سے پوچھئے کہ کیا ۱۱ھ تک مدینے میں کوئی یہودی رہ گیا تھا؟ خیبر کی فتح کے بعد مدینے میں کوئی یہودی رہ گیا تھا کہ جن کو دیکھ کے حضور نے روزہ شروع کر دیا ہو۔ اور بتائیے کہ کیسے اس روزہ کو برداشت کیا جائے اور کیسے توہین پیغمبرؐ کو برداشت کیا جائے کہ مکہ میں رہے تو جاہلیت کے ساتھ رہے اور مدینہ میں آئے تو یہودیت کے ساتھ چلے۔ میں تو پیغمبرؐ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، اتنا ضرور ہاتھ جوڑ کے گذارش کروں گا کہ ابھی تک تو ہم سے کہا جاتا تھا کہ وہ کرتے ہو جو یہودی کرتے تھے، اب پیغمبرؐ پر بھی یہی الزام شروع

ہوگیا۔؟ صلوات

یہ ہے کل تاریخی حقیقت جو کہ کتاب میں موجود ہے۔ اور جہاں بھی آپ جائینگے خود مطالعہ کرلیں گے اور آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ چونکہ ایک مومن نے مسئلہ پوچھا تھا تو میں نے چاہا کہ سارے مومنین پر مسئلہ کی وضاحت ہو جائے ورنہ ظاہر ہے کہ اس کا یہ موقعہ نہیں تھا۔

بس میں اپنے بیان کو آخری مرحلہ تک لے آیا۔ فرزند رسول الثقلینؑ جب منزلِ عبادت میں آئے تو کوئی طریقۂ عبادت ایسا نہیں تھا جس کو حسینؑ نے معراجِ بندگی تک نہ پہونچا دیا ہو۔ ہر عبادت رضائے خدا کے لئے۔ نماز رضائے خدا کے لئے۔ روزہ رضائے خدا کے لئے۔ حج و زکوٰۃ رضائے خدا کے لئے۔ اسلام میں تو اتنی ہی عبادتیں تھیں رضائے خدا کے لئے۔ مگر حسینؑ نے رضائے خدا کا ایک نیا راستہ نکالا۔ چھ مہینے کا بچہ ہاتھوں پر ہے خیمے سے باہر آئے اور سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آواز دی پروردگار اِنْ کَانَ ھٰذَا یُرْضِیْکَ فَخُذْہُ پروردگار! اگر تیری رضا اسی میں ہے کہ میرا چھ مہینے کا بچہ بھی کام آجائے تو میں لے کے آگیا ہوں۔ میں اس لال کو بھی قربان کر دوں گا۔ حسینؑ کو فقط تیری رضا چاہیئے۔ حسینؑ نے رضا کا ایک نیا راستہ اختیار کیا، جس پر نہ کوئی نبی چلا تھا نہ کوئی ولی۔ یہ رضا کا نیا راستہ تھا جو حسینؑ ابن علیؑ نے دکھلایا ہے۔ چھ مہینے کے بچّے کو لائے ہیں راہِ رضائے الٰہی میں قربان کرنے کے لئے۔

بس آیئے اسی راہِ رضا پر چلیں اور بیان کو آخری منزل تک لیجائیں۔

وہ موقعہ جب سارے چاہنے والے کام آگئے۔ نہ اصحاب و انصار، نہ دل کے ٹکڑے، نہ گود کے پالے، زہراؑ کا لال اکیلا ہے۔ ایک بلندی پر آکے آواز دیتا ہے، ھَلْ مِنْ نَاصِرٍ یَنْصُرُنَا۔

آج عاشور کی رات ہے۔ انشاء اللہ بہت روئیں گے، بہت مثاب ہوں گے۔

ایک خیال بہت دیر سے مجھے تڑپا رہا ہے۔ کل کی مجلس میں، میں نے یہ کہا تھا کہ میرے سامنے اتنے نوجوان بیٹھے ہیں ان سے کہوں گا علی اکبرؑ کا ماتم کریں، آج سوچ رہا ہوں کس سے کہوں، کسے دعوت دوں، کسے بلاؤں، کسے پکاروں۔ آدھی رات کا وقت آگیا ہے۔ اے میری بہنو! اگر تمہاری گودیوں کے بچے سو گئے ہوں۔ اے میری بیٹیو! اگر تمہاری گود کے بچے سو گئے ہوں تو بچوں کو جگا دو۔ علی اصغرؑ کا ذکر ہو رہا ہے۔ اللہ تمہاری گودیوں کو آباد رکھے۔ کل کا دن آئے گا تو تمہارے بچے رہیں گے مگر رباب کا لال نہ رہے گا۔

ہائے وہ ہنگام جب حسینؑ استغاثہ کی آواز بلند کر رہے تھے اور اک مرتبہ خیمہ میں کہرام برپا ہوا۔ جیسے ہی خیمہ سے کہرام کی آواز بلند ہوئی حسینؑ دوڑ کے درِ خیمہ پر آئے۔

بہن زینبؑ خیر تو ہے، کیا کوئی تازہ مصیبت گذر گئی، یہ رونے کی آوازیں کیوں آرہی ہیں؟

کہا بھیا کوئی اور مصیبت تو نہیں ہے مگر آپ کی آواز کو سن کے علی اصغرؑ نے اپنے کو جھولے سے گرا دیا ہے۔

کہا بہن میں سمجھ گیا۔ لاؤ میرے بچے کو لاؤ۔

کہا مگر بھیا وہ کسی کی گودی میں آتا نہیں ہے۔

کہا بہن پھر مجھے لے چلو۔

ثانیٔ زہراؑ بھائی کو لے کے علی اصغرؑ کے جھولے کے قریب آئیں۔ نہ جانے باپ نے کیا کہا، نہ جانے بچہ کیا سمجھا۔ جیسے ہی حسینؑ نے ہاتھ پھیلایا بچہ ہُمک کے باپ کی گودی میں آگیا۔

بابا میں میدان میں جانے کے قابل نہیں تھا۔ اس لئے میں نے آپ کو زحمت دی ہے۔ آپ مجھے لے چلیں۔

حسینؑ نے بچے کو لیا۔ لے کے چلے۔ جب درِ خیمہ پر پہونچے دیکھا رباب

سر جھکائے کھڑی ہیں۔

حسینؑ نے کہا۔ رباب یہاں کیوں کھڑی ہو؟

کہا آقا میں دیکھ رہی ہوں کہ صبح سے جو گیا وہ پلٹ کے میدان سے نہیں آیا۔ میں چاہتی ہوں اپنے لال کو درِ خیمہ سے رخصت کر دوں۔

حسینؑ نے رباب کو تسکین دی —— رباب! اب تک جو میدان میں گیا اس کے بارے میں یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شائد لڑنے کے لئے آیا ہے، جنگ کرنے کے لئے آیا ہے مگر تمہارا لال تو جنگ کرنے کے لائق نہیں ہے۔ میں لیجا رہا ہوں علی اصغرؑ کی پیاس بجھانے کے لئے شائد ظالموں کو رحم آجائے۔

ماں کا دل ٹھہرا۔ حسینؑ ایک بلندی پر لے کے آئے۔ آ کے آواز دی۔ اے فوج جفاکار! اے قوم جفاکار! اے ظالمو! تمہیں معلوم ہے میرے بچے کا حال کیا ہے؟ میرا بچہ تین دن سے پیاسا ہے۔ میرے اصغرؑ کو پانی نہیں ملا ہے۔ اگر تمہارے خیال میں میری کوئی خطا ہے تو چھ مہینے کے بچے کی کوئی خطا تو نہیں ہے۔ اگر تمہیں میری بات کا اعتبار نہیں ہے تو لو اسے خاک پر لٹائے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کے جلتی ریت پر حسینؑ نے لٹا دیا۔ مگر اک مرتبہ گھبرا کے بچے کو پھر اٹھا لیا۔ اے بیٹا اصغرؑ یہ میری بات کو نہیں سمجھتے۔ اب تم بتاؤ کہ تم کتنے پیاسے ہو۔ علی اصغرؑ نے سوکھی زبان خشک ہونٹوں پر پھرائی۔ یہ منظر دیکھنا تھا کہ فوج دشمن میں اک کہرام برپا ہو گیا۔ فوج کا نقشہ بدلنے لگا۔ ابن سعدؒ نے آواز دی حرملہ کہاں ہے؟ حرملہ سامنے آیا۔ کہا حسینؑ کے کلام کو قطع کر دے۔ ظالم نے دوش سے کمان اتاری۔ بس اولاد والو دل سنبھالو۔ تیر چلۂ کمان میں جوڑا۔ علی اصغرؑ کے گلے کو نشانہ بنایا۔ تیر چلا۔ بچہ کے گلے پر لگا۔ بچہ باپ کے ہاتھوں پر پلٹ گیا۔ اب جو حسینؑ نے جھک کے دیکھا تو کیا دیکھا کہ علی اصغرؑ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ بابا میں مسکرا کے جا رہا ہوں، آپ پریشان نہ ہوں۔

حسینؑ اصغرؑ کو لے کے چلے درِ خیمہ کی طرف۔ درِ خیمہ کے قریب آئے۔ نہ جانے کیا خیال آیا کہ ماں بچے کو اس عالم میں کیسے دیکھے گی۔ پلٹ آئے۔ پھر آگے بڑھے۔ پھر پلٹ

آئے۔ بار بار آگے بڑھتے ہیں اور پلٹ آتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

بس عزیزو! آخری مرحلہ اور مجلس تمام۔ باقی جو کچھ ہے وہ انشاء اللہ کل گذارش کروں گا۔

آئے درِ خیمہ پر اور آ کے آواز دی رباب اپنے لال کو لے جاؤ۔ ہاں رونے والو! حسینؑ نے آواز دی۔ رباب اپنے لال کو لے جاؤ۔ خیمہ میں جیسے ہی آواز آئی۔ روایت کا انداز کہتا ہے۔ اِدھر سے رباب چلیں اور اُدھر سے سکینہؑ۔ مگر مقتل کہتا ہے کہ سکینہؑ پہلے آئیں رباب بعد میں آئیں۔ شائد راز یہ رہا ہو کہ بچی دوڑ کے آگئی اور ماں کے قدم نہیں اُٹھتے ہیں۔ سنو سنو! درِ خیمہ پر آ کے سکینہؑ نے کہا بابا اصغرؑ کو پانی پلا لائے؟ بابا بھیا کو پانی پلا دیا؟۔ ارے سکینہؑ بھی تو پیاسی تھی۔ حسینؑ چپ کھڑے ہیں۔ رباب آگے بڑھیں۔ لائیے آقا میرے بچے کو لائیے۔ اب جو قبا کا دامن اُٹھا، ماں نے دیکھا کہ گلے پر تیر کا نشان ہے۔ اے میرے لال، اے میرے علی اصغرؑ۔ ارے اس عمر کے بچے بھی کیا اس طرح نحر کردئے جاتے ہیں۔ ماں تڑپ رہی ہے۔ حسینؑ سر جھکائے کھڑے ہیں۔ واعلی اصغراؑ۔ واعلی اصغراؑ۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

TANZEEMUL MAKATIB
Golaganj Lucknow-18 India
Tele Fax : 0522-2615115, 2628923, 2618194
E-mail : makatib@makatib.net